رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۳۰)
جلد (۴) عدد (۱)

رجسٹر نمبر ایم (۲۹۵۰)
محرم الحرام ۱۳۵۳ھ

۶۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ (صہ)   بیرون ہند کے لئے (ے)   قیمت فی پرچہ (۸/)

مرآۃ المثنوی

مرتبہ

جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے

رکن دارالترجمۂ جامعۂ عثمانیہ

مثنوی شریف میں حکایات، حکم و معارف، مقولات فلسفیانہ، نصائح و مواعظ اس طرح ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں کہ مسلسل مطالعہ دشوار ہوگیا ہے، قاضی صاحب موصوف نے سالہا سال کی محنت سے مثنوی شریف کو ایسے طرز بیان پر مرتب کیا ہے کہ یہ دشواری کلیتہً رفع ہوگئی ہے۔ **یواقیت القصص** کے نام سے حکایات کے تمام متفرق اجزا کو اس طرح ایک سلسلہ میں جمع کردیا ہے کہ کسی ترجمے کی بحث باقی نہیں رہی ہے۔ حکم و معارف کے ساڑھے تین ہزار سے زاید اشعار و قطعات کو تقریباً گیارہ سو عنوانات کے تحت فنی اصول پر **دررالحکم** کے نام سے یکجا کیا ہے، جو اشعار مطالب قرآنی پر محتوی تھے انہیں ترتیب قرآنی کے بموجب **جواہر القرآن** کے تحت مرتب کیا ہے علیٰ ہذا احادیث نبوی پر مشتمل اشعار کو **لآلی السنن** کے نام سے جمع کیا ہے، آخر میں **مرجانۃ المدیح** کے نام سے ایک مجموعہ ان اشعار کا شامل کردیا ہے جو مولاناؒ نے اپنے اصحاب کی مدح میں کہے ہیں

ابتدائی مفصل فہرست کے علاوہ تین ضمیمے ہیں جن میں سے پہلا ضمیمہ باعتبار مطالب دررالحکم کا اشاریہ ہے دوسرا ضمیمہ کشف الابیات ہے یعنی کسی شعر کے ابتدائی دو لفظ یاد ہوں تو اس شعر کا کتاب میں پتہ چل سکتا ہے تیسرا ضمیمہ فرہنگ ہے جس میں مشکل الفاظ و فقرات کے معانی آسان عبارت میں دیئے گئے ہیں اس طرح یہ ایسا نادر مجموعہ طیار ہوگیا ہے کہ دیکھنے والے حیرت میں پڑ گئے ہیں کہ یہ کام کیونکر انجام پایا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت برہان الدین چلپی دام برکاتہ اور ڈاکٹر آر اے نکلسن پروفیسر عربی جامعہ کیمبرج نے اس کتاب پر دیباچے تحریر فرمائے ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ جلد سب اعلیٰ پیمانہ پر ہیں کتاب کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا اندازہ صرف کتاب کے دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے **قیمت** (عہ) سکہ انگریزی یا (لعہ) سکہ حالی

المشتہر —— سید عبدالقادر تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن

مؤلف سے دارالترجمہ کے پتہ سے بھی کتاب ملسکتی ہے

فہرست مضامین

ماہ محرم ۱۳۵۳ھ جلد ۴ عدد (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"ترجمان القرآن" کو میری تحریر و ادارت میں شائع ہوتے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، اور اب اس پرچے کے ساتھ اس کا دوسرا سال شروع ہو رہا ہے۔ اس مدت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنی کتاب کی خدمت کے لئے جو توفیق مجھ کو عطا فرمائی، اور سخت ہمت شکن حالات میں خدمت کے لئے کمربستہ رہنے کی جو استقامت بخشی، اس کے لئے شکر بجا لانا میرا فرض ہے، اگرچہ میرا شکر اس کے فضل و انعام کے مقابلہ میں بہت حقیر ہے۔ میں نے جن حالات میں اس رسالے کی ادارت سنبھالی تھی، اور بعد میں مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہیں، ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے، اگر میرا اعتماد خدا کے بجائے دنیوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا بھروسہ دنیا اور اسباب دنیا پر نہیں بلکہ ہمیشہ خدا پر رہا ہے اور خدا کا یہ سچا وعدہ ہے کہ جو اس پر بھروسہ کر کے اس کی راہ میں صبر و استقامت کے ساتھ سعی کریگا، اس کو آخر کار کامیابی نصیب ہوگی اور خوف و حزن اس کے پاس پھٹک نہ سکے گا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱: ۳۰)

یہ زمانہ ہندوستان میں اسلام کے لئے بڑا ہی نازک زمانہ ہے۔ کوئی حکومت موجود نہیں ہے جو زندقہ و الحاد کی اشاعت کو روکتی، مذہب قانون کی طاقت سے محروم ہو چکا ہے۔ زبانیں بولنے اور قلم لکھنے کے لئے آزاد ہیں، حریت ضمیر اور آزادی تحریر و تقریر کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ان معاملات

میں بھی ہر قسم کے خیالات نہ صرف خود رکھنے بلکہ ان کو پھیلا دینے کی بھی آزادی رکھتا ہے، جن پر اسلامی سوسائٹی اور مسلمان قوم کے اجتماعی نظام کی بنیاد قائم ہے حالانکہ ایسی غیر مقید اور غیر مشروط آزادی انسان کو کبھی اور کہیں نہیں دی گئی ہے۔ کوئی انتہا درجہ کی حریت پسند سوسائٹی بھی آپ کو یہ حق نہ دیگی کہ آپ اس کے دائرہ میں رہ کر ان اصولوں پر حملہ کریں جن پر وہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے۔ روس میں رہ کر آپ سب کچھ بول اور لکھ سکتے ہیں مگر اشتراکیت کے خلاف ایک لفظ بھی زبان و قلم سے نہیں نکال سکتے۔ جرمنی اور اٹلی میں آپ کو نازی اور فاسسٹ اصولوں کے خلاف زبان کھولنے یا قلم کو حرکت دینے کی کبھی اجازت نہ دی جائیگی۔ فرانس اور انگلستان میں اگر آپ موجود الوقت اجتماعی سیاسی اور معاشی نظام کے خلاف انقلاب انگیز تبلیغ شروع کریں گے تو قانون اپنی پوری قوت آپ کی اس آزادی کو سلب کرنے میں صرف کردے گا۔ اس کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غیر مہذب ہیں، متعصب ہیں، تاریک خیال ہیں۔ لیکن ہندوستان میں روشن خیالی کے مدعی اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اسلامی سوسائٹی میں رہ کر اسلام کے اصولی مسائل میں جس طرح چاہیں قطع و برید کریں، ایمانیات پر ضرب لگائیں، اعمال پر حملے کریں، قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ کریں، اور اگر کوئی اس پر ٹوکے تو ان کے نزدیک وہ تنگ نظر، تنگ خیال، کٹھ ملا ہے، کیونکہ وہ حریت ضمیر اور آزادی تحریر و تقریر کا حق ان سے سلب کرنا چاہتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ جو حضرات اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین پر مجتہدانہ شان کے ساتھ کلام کرتے ہیں، ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ ان کی تحریروں سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ جن مسائل پر وہ قلم اٹھاتے ہیں انہیں وہ سرے سے سمجھے ہی نہیں، نہ کافی غور و خوض کی زحمت اٹھائی ہے، نہ تحقیق اور مطالعہ کیا ہے، نہ ان علوم کو حاصل کیا ہے جن کی واقفیت پر ان مسائل کا سمجھنا موقوف ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ مسند اجتہاد پر جلوہ فرمائیں، اصول و قوانین اسلام میں جیسی چاہیں ترمیم

و تنسیخ کریں اور پھر اپنے اجتہادات کو عام مسلمانوں میں شائع کر کے ان کے عقائد اور اعمال کی تخریب میں کوئی کسر اٹھا رکھیں۔ وہ دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں کافی علم اور تحقیق کے بغیر زبان کھولنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتے ان میں یہ جسارت ہرگز نہیں ہے کہ فن طب سے ناواقف ہوں اور کسی مریض کو نسخہ لکھ دیں۔ وہ اتنی جرأت کبھی نہیں کر سکتے کہ قانون سے نابلد ہوں اور عدالت میں وکیل بن کر کھڑے ہو جائیں لیکن اسلام کے معاملہ میں وہ پوری جرأت رکھتے ہیں کہ اس کے ابتدائی اصولوں تک سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی جس مسئلے میں چاہیں مجتہدانہ کلام فرمائیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں حاکمانہ قوت کا خوف انہیں اپنی حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتا، اور یہاں سرے سے کوئی قوت ہی نہیں ہے جس کا کسی کو خوف ہو۔

اگر اسلام میں دین اور دنیا دو الگ چیزیں ہوتیں، مسیحیت کی طرح چرچ اور سٹیٹ کے حدود جدا جدا ہوتے، بودھ مت کی طرح گرہستی اور دہرم کے دائرے مختلف ہوتے، تو اس کے عقائد اور احکام میں اس قسم کی ترمیم و تنسیخ اور قطع و برید اتنی زیادہ مضر اور خطرناک نہ ہوتی لیکن یہاں تو دنیا اور دین ایک ہیں۔ تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، معاملات سب کی بنیاد مذہبی تعلیمات اور احکام پر ہے، انفرادی سیرت، اور اجتماعی نظام دونوں مذہب ہی پر مبنی ہیں پس اگر مذہب میں مسلمانوں کا عقیدہ کمزور ہو جائے، مذہبی تعلیمات پر ان کا یقین داذعان باقی نہ رہے، مذہبی احکام اور قوانین کی گرفت ان پر ڈھیلی پڑ جائے تو آخرت میں جو کچھ ہونا ہے۔ وہ تو ہوگا ہی، مگر اس دنیوی زندگی میں بھی ان کے لئے بجز تباہی و بربادی کے اور کچھ نتیجہ نہیں ہے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ان کے افراد کی سیرتیں کمزور ہو جائیں گی۔ ان کے اخلاق بگڑ جائیں گے، ان کے معاملات درست نہ رہیں گے، ان کی سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جائیگا، اور پوری قوم کی قوم دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جائے گی۔

جس تحریک کے نتائج اتنے خطرناک ہوں، اس کو محض چند افراد کی حریت ضمیر اور آزادی تحریر و تقریر کی

خاطر کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے؟ اجتماعی مفاد کے لئے انفرادی مفاد اور حقوق کی قربانی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے لہٰذا اگر وہ اسلامی جماعت کا جزو بنکر رہنا چاہتے ہیں، تو انہیں اپنی اس آزادی کو قربان کرنا پڑے گا، اور اگر اسے قربان کرنا نہیں چاہتے تو بہتر ہے کہ اسلامی جماعت سے نکل جائیں، پھر جو چاہیں لکھیں۔ جماعت کے اندر رہکر اس کی جڑوں پر کلہاڑی مارنے کی آزادی کسی طرح بھی ان کا حق نہیں ہے۔

ہمارے نئے زمانے کے ارباب تحقیق واجتہاد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے علم و فضل اور عقل و خرد کا سارا زور صرف تخریب پر صرف فرماتے ہیں، تعمیر کی طرف انکی توجہات کبھی مبذول نہیں ہوتیں۔ صدیوں سے جن اصول و مسلمات پر اسلامی سوسائٹی کی عمارت قائم ہے ان کو وہ اپنے اجتہاد سے توڑ دینا چاہتے ہیں، لیکن اپنی طرف سے کچھ دوسرے اصول اور قوانین نہیں پیش کرتے جن پر اعتقاد و عمل کی بنا رکھی جائے، اور اجتماعی نظام کی نئی عمارت بنائی جا سکے۔ اس تخریب بلا تعمیر کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسلمان قوم کو فکر و عمل کی انارکی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ اس قوم کے نظم اجتماعی کو پارہ پارہ کر دیا جائے، اور کوئی ایسا رشتہ باقی ہی نہ رکھا جائے جو ان منتشر پاروں کو پھر سے منظم اور مرتب کر سکتا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ بالقصد ایسا نہ کر رہے ہوں، ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے تخریبی کام کے ان نتائج کا شعور نہ ہو۔ لیکن شعور اور عدم شعور سے افعال کے نتائج میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ خواہ کوئی شخص بلا ارادہ و بلا عمد کسی مکان میں آگ لگائے، یا بالارادہ اور بالعمد، دونوں صورتوں میں مکان ضرور جلتا ہے، اور تباہی بہرحال ہوتی ہے۔ پس اگر یہ تخریبی نقد و اجتہاد محض ایک طفلانہ کھیل ہے جس کے خطرناک نتائج سے یہ نابالغ بچے ناواقف ہیں، تب بھی ایسی خطرناک آتش بازی سے ان کو جبراً روک دینا ضروری ہے، خواہ وہ کھیلنے کی آزادی کو اپنا کیسا ہی مقدس "حق" سمجھتے ہوں۔

بلاشبہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دل سے مسلمان ہیں اور اسلام پر سچا اعتقاد رکھتے ہیں مگر بعض مسائل میں

ان کو شکوک عارض ہو گئے ہیں، یا بعض امور میں ان کا دل اس اعتقاد اور اس مسلک پر نہیں ٹھکتا، جو جمہور اہل اسلام کا اعتقاد اور مسلک ہے۔ ایسے حضرات یقیناً حق رکھتے ہیں کہ اپنے شکوک اور اعتراضات پیش کریں اور ہمارا فرض ہے کہ ان کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قسم کے لوگ عموماً نہایت غلط طریقے اختیار کرتے ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ ایک ناواقف آدمی کی طرح اپنے شبہات اور اعتراضات پیش کر کے واقف کار لوگوں سے ان کا حل طلب کریں، خود مجتہد بن کر ایک فیصلہ کن رائے قائم کر لیتے ہیں پھر اس پر فاضلانہ انداز کے ساتھ ایک مضمون تحریر فرماتے ہیں جس کی ابتداً مولوی پر سب و شتم اور انتہا اپنے اعلان اجتہاد و تفقہ پر ہوتی ہے۔ یہ مضمون کسی ادبی رسالے میں بھیج دیا جاتا ہے، اور وہاں بغیر اس احساس کے کہ ایسی تحریروں کی اشاعت کا ملت پر کیا اثر پڑیگا، نہ صرف اس کو شائع کر دیا جاتا ہے، بلکہ خود ایڈیٹر صاحب بھی اس پر اپنے خیالات ظاہر فرماتے ہیں۔ اس طرح یہ زہر ہزاروں مسلمانوں کے دل و دماغ تک پہنچا دینے کے بعد "مولوی" کو دعوت دی جاتی ہے کہ اگر تیرے پاس اس کا تریاق ہے تو آ اور اس کا کچھ علاج کر۔ کاش یہ حضرات اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے، ان مسائل کی اہمیت کو سمجھتے جن پر وہ ناکافی علم اور خام تحقیق کے ساتھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں، اور غور کرتے کہ ایسے مسائل کے حل کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔

ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کا مقصد محض فتنہ پردازی ہے۔ وہ مذہبی مسائل پر محض اس نیت سے خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات میں قطع و برید کریں اور مسلمانوں میں بے دینی پھیلائیں۔ کم علم اور ناواقف مسلمانوں کا جو گروہ ان کے دام میں پھنس جاتا ہے، اس کی جہالت سے وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اسے تاریکی میں رکھ کر اپنے باطل خیالات اس میں پھیلاتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کے خیالات کی تردید اس حلقہ میں نہ پہنچنے پائے جسے انہوں نے اپنے دام فریب میں گرفتار کر رکھا ہے۔ اگر کبھی اپنے مخالفین سے وہ بحث کرتے بھی ہیں، تو اس وقت جبکہ انہیں پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے

کہ مخالف کمزور ہے، آسانی سے دبا لیا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں کسی ایسے شخص سے مقابلہ کی نوبت آتی ہے جو قوی دلایل سے ان کے باطل خیالات کی تردید کر سکتا ہے تو وہ فوراً راہ گریز اختیار کرتے ہیں۔ مخالف کے دلائل اپنے فریب خوردہ حلقے میں پیش کرنے کی جرأت ان میں نہیں ہے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان دلائل کے پہنچ جانے کے بعد وہ اس حلقے میں اپنے کمال تحقیق اور شان اجتہاد کے ڈنکے نہ بجا سکیں گے۔

ایسے لوگوں سے خطاب کرنا تو قطعاً لاحاصل ہے کیونکہ وہ جس چیز کے مستحق ہیں، افسوس ہے کہ وہ ہمارے پاس نہیں ہے، البتہ جو اصحاب حقیقت میں نیک نیتی کے ساتھ کچھ شکوک رکھتے ہیں، اور ان کی تحقیق کے خواہشمند ہیں، ان کی مدد کرنا یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے۔ مگر ان کے لئے صحیح طریق کار یہ ہے کہ وہ مجتہد کے بجائے سائل کی حیثیت اختیار کریں، اور ادبی رسالوں میں مضامین لکھنے کے بجائے، اپنے شبہات یا اعتراضات ایسے رسائل و جرائد میں بھیجیں جو اس وقت اسلام کی وکالت کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ مثلاً "معارف" یا "سچ" یا "اصلاح"۔ "ترجمان القرآن" بھی اس خدمت کے لئے حاضر ہے اور یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ ان کے اعتراضات خواہ کتنے ہی سخت ہوں، شبہات خواہ کیسے ہی قوی ہوں وہ ان کے پورے دلائل کے ساتھ بعینہٖ شائع کئے جائیں گے، اور جواب میں ان کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

بعض احباب کو شکایت ہے کہ "ترجمان القرآن" میں قرآن مجید کے اصطلاحی علوم پر بہت کم لکھا جاتا ہے۔ ان کی یہ شکایت ایک حد تک بجا بھی ہے لیکن آج کل ہندوستان کے مسلمانوں کی دماغی رو جس طرف جا رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اصطلاحی علوم اور خالص علمی تحقیقات کی اتنی ضرورت نہیں ہے، جتنی اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلیں جو دینی تعلیم سے بے بہرہ جدید تعلیم میں نیم پختہ مدرسوں اور کالجوں سے صرف یہ سبق لے کر نکلی ہیں کہ روشن خیالی صرف مذہب میں شک کرنے اور ہر پرانی چیز کو فرسودہ سمجھنے کا نام ہے، انہیں تعلیم قرآنی کے اصل مقصود سے روشناس کرایا جائے، اسلام کے صحیح اصول سمجھائے جائیں، اور ٹھیک

انہی قوانین عقلی کے مطابق جو بیسویں صدی کے دماغوں کو اپیل کر سکتے ہیں، اسلام اور اس کے عقائد و احکام کو کتاب و سنت کی صحیح روشنی میں پیش کیا جائے۔ معانی و بیان کی بحثوں قصص قرآنی کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات آیات متشابہات کے معانی کی تعیین کے لئے فرصت کے اور بہت سے اوقات مل سکتے ہیں۔ یہاں تو دماغ خود قرآن اور اس کی تعلیم کے بنیادی مسائل سے منحرف ہوئے جا رہے ہیں۔ خدا کی خدائی رسول کی رسالت، کتاب کی تنزیل ہی میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ دین اسلام جن ارکان پر قائم ہے وہی معرض بحث میں ہیں ایسی حالت میں زیادہ تر ضرورت نفس اسلام کے تحفظ کی ہے، اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے "ترجمان القرآن" کا بیشتر حصہ وقف کر دیا گیا ہے۔

"ترجمان القرآن" اپنی محدود طاقت کے ساتھ اسی زہر کا تریاق فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اس تریاق کو ان ریضوں تک پہنچانے کے ذرائع اس کے پاس نہیں ہیں جو زہر سے متاثر اور تریاق کے سب سے زیادہ حاجت مند ہیں۔ اس کا کام صرف دوا مہیا کر دینا ہے۔ باقی رہا بیماروں تک اس دوا کو پہنچانا، تو یہ اس کے ناظرین کی امداد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ زہر سے متاثر ہیں، ان کو خود اپنے زہر خوردہ ہونے کا احساس نہیں ہے۔ وہ دوا کی حاجت ہی محسوس نہیں کرتے، بلکہ دوا کے نام سے بھاگتے ہیں، ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ذاتی شوق سے اس قسم کا کوئی رسالہ خریدیں گے۔ اول اول ان کو کسی غیر معمولی تشویق کے ذریعہ سے اس بات پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کم از کم جانب مخالف کا مقدمہ بھی سن لیں۔ پھر فیصلہ کا انہیں اختیار ہے، جو چاہیں کریں۔ اس لئے "ترجمان القرآن" کے ناظرین سے استدعا ہے کہ وہ جن حضرات کو مذہب سے منحرف پائیں، انہیں کسی طرح اس رسالے کے چند پرچے ملاحظہ کرنے پر آمادہ کریں۔ اس کام میں اس حد تک ان کی مدد اور کی جائے گی کہ ایسے لوگوں کو ابتداءً ایک سال تک نصف قیمت پر رسالہ دیا جائیگا بلکہ اگر کوئی مریض زیادہ سخت ہو تو رسالہ اس کی خدمت میں مفت نذر کیا جائیگا بشرطیکہ وہ اس کو پڑھنے کا

وعدہ کرے۔

اس رسالے کی ادارت ہاتھ میں لینے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ مسلمان علم قرآن کے پیاسے ہیں، قرآن کی دعوت سننے کے لئے ان میں ایک پوشیدہ تڑپ موجود ہے، کسر جو کچھ بھی ہے، صرف اس بات کی ہے کہ اس جنس کے پیش کرنے والے کمیاب ہیں۔ لیکن گذشتہ ایک سال کے تجربہ نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے قرآن کے نام میں اتنی کشش بھی نہیں ہے جتنی فلم اسٹاروں کی تصویروں میں ہے۔ کسی کتاب یا رسالے پر قرآن کا نام آجانا ہی اس کے لئے کافی ہے کہ مسلمان اس سے بھاگیں، اور شجر ممنوع سمجھ کر اس کو ہاتھ تک نہ لگائیں۔ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

افسوس! یہ کیسی مصیبت ہے کہ بیماروں میں اب احساس بھی نہ رہا کہ وہ بیمار ہیں۔ زخمیوں کی بے خبری اس حد کو پہنچ گئی کہ انہیں اپنے زخموں کی بھی خبر نہ رہی۔ عقل کا فقدان یہاں تک بڑھا کہ دوا سے بھاگتے اور زہر کی طرف لپکتے ہیں، مرہم کو چھوڑ کر نمک اپنے زخموں پر چھڑکتے ہیں، اور امیدوار ہیں کہ اس سے ان کو شفا نصیب ہوگی۔

اس شخص کی روحانی اذیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا جو تفریح کے لئے نہیں، لوگوں کی اصلاح و تعلیم کے لئے اپنا خون جگر کھپا کر اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں خرچ کرکے لکھتا ہے، اور پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت جن کے فائدے کے لئے اس نے لکھا تھا، انہوں نے ہی اس کی طرف توجہ نہ کی، اسے پڑھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی اور ان چیزوں میں اپنا وقت ضائع کیا جو ان کے دین اور دنیا دونوں کو خراب کرنے والی ہیں۔ اگر آپ ظلمات کا سفر کرکے بڑی محنتوں اور تکلیفوں کے بعد کسی کو آب حیات کا ایک جام لاکر دیں، اور وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اس کو پھینک کر زہر کا پیالہ اٹھالے، تو غور کیجئے کہ اس وقت

آپ کو کس قدر سخت صدمہ ہوگا۔ بس اسی پر اس صدمہ کو قیاس کریجیے جو ان صفحات کے لکھنے والے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں مگر میں اپنی قوم سے اس کی شکایت نہ کروں گا اِنَّمَا اَشْكُوا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ۔ وہی مقلب القلوب ہے۔ اسی سے امید ہے کہ مسلمانوں کے دل پھیرے گا۔ اور جب ان کے دل پھریں گے تو انشاء اللہ دن بھی پھریں گے۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

۱۲

ایمان

رسالت محمدی کے امتیازی خصائص یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ رسالت کے عام احکام سے متعلق تھا۔ مگر ان کے علاوہ چند امور ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں بلاشبہ نفس منصب رسالت کے لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء میں کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (۲: ۴) پس جہاں تک اصول کا تعلق ہے، تمام انبیاء اس میں مشترک ہیں کہ سب کے سب اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، سب کو "حکم" اور "علم" عطا کیا گیا ہے، سب ایک ہی صراط مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں، سب بنی نوع انسان کے ہادی و رہنما ہیں، سب کی اطاعت فرض اور سب کی سیرت بنی آدم کے لئے نمونۂ تقلید ہے لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور میں نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا ہے اور یہ امتیاز محض سطحی نہیں ہے کہ اس کو ملحوظ رکھنے یا نہ رکھنے کا کوئی اثر نہ ہو، بلکہ درحقیقت اسلام کے نظام دینی میں اس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے، اور عملاً اسلام کے تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد، رسالت محمدی کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے، اس لئے رسالت کے متعلق کسی کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اس مخصوص امتیازی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے

پچھلی نبوتوں اور رسالت محمدی کا فرق اس مضمون کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے چند امور ذہن نشین کر لینے ضروری ہیں

۱- اشارات قرآنی، روایات ماثورہ، اور قیاس عقلی، تینوں سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہونی چاہئے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ۔ (۳۵ : ۲۴) کوئی امت ایسی نہیں ہوی ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ گذرا ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نوع بشری کی اتنی امتیں دنیا میں گذر چکی ہیں کہ تاریخ کا علم ان کا احاطہ نہ کرسکا ہے اور نہ کرسکتا ہے۔ لہٰذا ہر امت کے لئے اگر ایک رسول بھی آیا ہو تو رسولوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہونی چاہئے۔ اسی کی تائید بعض احادیث بھی کرتی ہیں جن میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔ لیکن اس جم غفیر میں سے قرآن مجید میں جن انبیاء کے نام بتائے گئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے اور ان کے ساتھ اگر ہم ان پیشوایان اقوام کو بھی شامل کرلیں جن کی نبوت کے متعلق کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے تب بھی یہ تعداد دہائیوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اس طرح بے شمار انبیاء کا نام و نشان تک مٹ جانا، اور ان کی تعلیمات کے آثار کا محو ہوجانا، اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی بعثت خاص خاص زمانوں اور خاص خاص قوموں کے لئے ہوئی تھی، اور ان کے پاس کوئی ایسی شئے نہ تھی جو ثبات اور دوام بخشنے اور عالمگیر وسعت عطا کرنے کے قابل ہوتی۔

۲- پھر جن انبیاء اور پیشوایان اقوام کے نام ہم کو معلوم بھی ہیں ان کے حالات، اور تعلیمات پر افسانوں اور تحریفات کے اتنے پردے پڑے ہوے ہیں کہ ان کے متعلق ہمارے علم کو ہمارے جہل سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کے جس قدر آثار اس وقت دنیا میں موجود ہیں، انہیں ظنی اعتقاد سے قطع نظر کرکے، خالص تاریخی نقد کے معیار پر جانچیے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہو۔ ہم ان کا صحیح زمانہ تک متعین نہیں کرسکتے، ہم ان کے صحیح ناموں تک سے ناواقف ہیں، ہم قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ فی الواقع دنیا میں موجود بھی تھے یا نہیں۔ بودھ، زردشت، اور مسیح جیسی مشہور ہستیوں کے متعلق بھی محتاط مورخین نے شک کیا ہے کہ آیا وہ تاریخی ہستیاں ہیں یا محض تخیلی پیکر۔ ان کی سیرتوں کے متعلق

جو کچھ معلومات ہمارے پاس ہیں وہ اتنی مجمل اور مبہم ہیں کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی ان کو نمونہ تقلید نہیں بنایا جا سکتا۔ اور یہی حال ان کی تعلیمات کا ہے۔ جو کتابیں یا جو تعلیمات ان کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کسی کی سند ان تک نہیں پہنچتی، اور نہایت قوی شہادتیں اندرونی اور بیرونی، دونوں قسم کی ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں بکثرت تحریفات ہوئی ہیں۔ یہ امور اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء اور پیشوا گذرے ہیں ان کی رسالت اور پیشوائی عملاً ختم ہو چکی ہے۔

۳۔ قریب قریب تمام انبیاء اور پیشواؤں کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ اُن کی تعلیم ان مخصوص اقوام کے لئے تھی جن میں وہ آئے تھے۔ بعض نے خود اس کی تصریح کی، اور بعض کے متعلق واقعات نے اس کو ثابت کر دیا۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، کنفیوشس، زردشت، اور کرشن کی تعلیم کبھی ان کی قوم کے باہر نہیں گئی۔ یہی حال سامی اور آرین اقوام کے دوسرے رسولوں اور پیشواؤں کا ہے۔ البتہ بودھ اور مسیح کی تعلیم کو ان کے پیرووں نے دوسری اقوام تک پہنچایا، مگر خود انہوں نے کبھی نہ اس کی کوشش کی، اور نہ یہ کہا کہ ان کا پیغام تمام عالم کے لئے ہے۔ بلکہ مسیح علیہ السلام سے تو خود انجیل میں یہ قول منقول ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے آئے تھے۔

۴۔ تمام انبیاء اور پیشوایان امم میں تنہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی سیرت اور تعلیم کے متعلق ہمارے پاس اس قدر صحیح، مستند، اور یقینی معلومات موجود ہیں کہ ان کی صحت میں شک کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کسی تاریخی شخصیت کے متعلق آج معلومات کا اتنا صحیح اور قابل اعتماد ذخیرہ موجود نہیں ہے حتیٰ کہ اگر کوئی متشکک اس کی صحت میں شک کرے، تو اس کو تمام دنیا کا تاریخی ذخیرہ نذر آتش کرنا پڑیگا، کیونکہ اتنے مستند ذخیرے کی صحت میں شک کرنے کے بعد تو یہ ماننا لازم آتا ہے کہ تاریخ کا پورا علم جھوٹ کا ایک انبار ہے اور اس کے ایک لفظ پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۵ - اسی طرح تمام انبیاء اور پیشواؤں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی سیرت اور زندگی کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں، نہ صرف پیشوایان امم بلکہ دنیا کی تمام تاریخی شخصیتوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی سیرت اتنی جزئی تفصیلات کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو۔ آنحضرت کے عہد اور ہمارے موجودہ عہد میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ اُس زمانہ میں آنحضرت اپنی حیات جسمانی کے ساتھ موجود تھے، اور اب نہیں ہیں لیکن اگر زندگی کے ساتھ جسمانی زندگی کی قید نہ لگائی جائے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت آج بھی زندہ ہیں، اور جب تک دنیا میں آپ کی سیرت موجود رہے گی اس وقت تک آپ زندہ رہیں گے۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں دنیا آج بھی آنحضرت صلعم کی زندگی کو اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتی ہے، جتنے قریب سے آپ کے عہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انبیاء اور پیشوایان ادیان میں سے اگر کسی کا صحیح اور مکمل طور پر اتباع کیا جا سکتا ہے، تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۶ یہی حال آنحضرت صلعم کی تعلیم کا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انبیاء اور پیشواؤں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی لائی ہوئی کتاب، اور جس کی پیش کی ہوئی تعلیم آج اپنی صحیح شکل میں موجود ہو، اور قابل یقین و اعتماد طریقے سے اپنے لانے والے اور پیش کرنے والے کی طرف منسوب کی جا سکتی ہو۔ یہ شرف تنہا آنحضرت صلعم کو حاصل ہے کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب، قرآن بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے جن الفاظ میں آنحضرت نے اس کو پیش کیا تھا، اور قرآن کے علاوہ جو ہدایات آپ نے اپنی زبان وحی ترجمان سے دی تھیں، وہ بھی قریب قریب اپنی صحیح صورت میں آج تک محفوظ ہیں، اور انشاء اللہ ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ پس رسولوں اور پیشواؤں میں سے اگر کسی کی تعلیم کا اتباع یقینی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۷ پچھلے زمانے کے انبیا اور پیشواؤں کی تعلیم اور سیرت کے متعلق جو ذخیرہ اس وقت دنیا میں

موجود ہے اس سب پر نظر ڈال جائیے ۔ اس میں حق اور صداقت، خیر اور صلاح، حسن اخلاق اور حسن معاملت کے جتنے پاکیزہ نمونے آپ کو ملینگے، وہ سب کے سب آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی سیرت میں پا سکتے ہیں اسی طرح آپ کے بعد نوع بشری کے جتنے رہنما پیدا ہوئے ہیں، اُن کی تعلیم اور سیرت میں بھی آپ کو ایسی کوئی چیز نہ ملیگی جو حق اور صدق، نیکی اور بہتری ہو، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت میں موجود نہ ہو ۔ پھر آنحضرتؐ کی تعلیم اور سیرت میں آپ کو علم حق، عمل صالح، اور اصول خیر کا ایک وافر ذخیرہ ایسا بھی ملے گا جو دنیا کے کسی اگلے اور پچھلے پیشوا کی تعلیم اور سیرت میں نہیں پایا جاتا ان سب پر مزید یہ کہ علم الٰہی اور اخلاق و معاملات دنیوی کے متعلق کوئی ایسی صحیح بات انسان سوچ نہیں سکتا جو اسلام سے باہر ہو ۔ پس یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت تمام خیرات کی جامع ہے ۔ حق جو کچھ تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کر دیا، صراط مستقیم جس چیز کا نام تھا وہ آپ نے روشن کر کے دکھا دی، جملہ انفرادی اور اجتماعی حیثیات لے انسان کے اخلاق اور معاملات کو درست رکھنے اور دنیا میں صحیح طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے اصول حقہ ہوسکتے تھے، وہ سب آپنے واضح طور پر پیش کر دے ۔ اب ان پر کسی اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ۔

۸ ۔ انبیا اور پیشوایان ادیان کے پورے گروہ میں تنہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی دعوت تمام نوع انسانی کیلئے ہے، اور عملاً بھی یہی ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی میں شاہان اقوام کو دعوت نامے بھیجے، اور آپ کی دعوت روئے زمین کے ہر گوشے اور بنی آدم کی ہر قوم میں پہنچی۔ یہ خصوصیت آنحضرت صلعم کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ بعض نے تو نہ عالمگیری کا دعویٰ کیا اور نہ ان کو عالمگیری نصیب ہوئی اور بعض کے مذاہب کو عالمگیری تو نصیب ہوئی، مگر خود انہوں نے نہ اس کا کبھی دعویٰ کیا، اور نہ اس کی کوشش کی۔ آنحضرت صلعم کے سوا ایسا اور کوئی نہیں ہے جس نے عالمگیری کا دعویٰ بھی کیا ہو، اس کے لئے کوشش بھی کی ہو، اور جسے بالفعل عالمگیری نصیب بھی ہوئی ہو۔

۹۔ دنیا میں انبیاء کی آمد کے تین ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قوم کی ہدایت کے لئے پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو، اور لکل قوم ھاد کی بنا پر اس کے لئے ایک نبی یا ایک سے زیادہ انبیاء کی ضرورت ہو۔ دوسرے یہ کہ پہلے کوئی نبی آیا تھا مگر اس کی رسالت کے آثار محو ہوگئے، اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف ہوگئی، اس کی سیرت کے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ لوگوں کے لئے اس کی پیروی کرنا اور اس کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کرنا ممکن نہ رہا۔ تیسرے یہ کہ پہلے نبی یا انبیاء کی تعلیم اور ہدایت مکمل نہ ہوا اور اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہو۔ ان تین اسباب کے سوا انبیاء کی بعثت کا کوئی چوتھا سبب نہ ہے اور نہ عقلاً ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی قوم کیلئے نبی آچکا ہو، اس کی تعلیم اور اس کی سیرت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہو، اس میں کسی اضافہ کی ضرورت بھی نہ ہو، اور پھر اس کے بعد کوئی دوسرا نبی بھیج دیا جائے۔ نبوت کا منصب اتنا چھوٹا اور ادنیٰ درجہ کا منصب نہیں ہے کہ محض کسی گذرے ہوئے نبی کی تعلیم کی طرف توجہ دلانے کے لئے اسے قائم کیا جائے۔ اس کام کے لئے علمائے حق اور مجددین کی جماعت بالکل کافی ہے۔ پس عقل قطعیت کے ساتھ یہ حکم لگاتی ہے کہ جب تک مندرجہ بالا اسباب ثلاثہ میں سے کوئی سبب داعی نہ ہو، اس وقت تک کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اور ہمارے پچھلے بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ تینوں دواعی مرتفع ہو چکے ہیں۔ آپ کی دعوت تمام نوع بشری کے لئے ہے۔ لہٰذا اب جدا جدا قوموں کے لئے نبی آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں، لہٰذا کسی نئی کتاب یا نئی ہدایت کے آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ کی تعلیم اور ہدایت مکمل اور جامع ہے، نہ علم حق میں سے کوئی چیز پوشیدہ رہ گئی ہے، اور نہ عمل صالح کے لئے ہدایت اور نمونۂ تقلید پیش کرنے میں کوئی کسر باقی ہے، لہٰذا اس پر کسی اضافہ کرنے والے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب یہ تینوں دواعی موجود نہیں ہیں اور بعثت انبیاء کے دواعی انہی تین میں منحصر ہیں تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ قطعاً بند ہو چکا ہے۔ اگر اب یہ دروازہ کھلا ہے

تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا فعل عبث بھی کرتا ہے، حالانکہ خدا اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس سے کوئی بے کار فعل صادر ہو۔

رسالت محمدی صلعم کی یہی وہ امتیازی حیثیات ہیں جن کو قرآن مجید نے پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دعوت عام قرآن کہتا ہے کہ:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨالَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۷: ۲۰)	اے محمد! کہو کہ لوگو میں تم سب کی طرف اس خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرنے اور مارنے والا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے ان پڑھ رسول و نبی پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو امید ہے کہ تمہیں ہدایت نصیب ہوگی
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴: ۳)	اور اے محمد! ہم نے تمکو تمام ہی انسانوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، مگر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴: ۲۳)	اے لوگو، تمہارے رب کی طرف سے یہ رسول تمہارے پاس حق کے ساتھ آیا ہے، پس ایمان لاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر کفر کرتے ہو تو تحقیق جان لو کہ اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱: ۷)	اے محمد، ہم نے تمکو تمام اہل عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (۲۵: ۱) پاک ہے وہ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تاکہ تمام اہل عالم کے لئے تنبیہ کرنیوالا ہو۔

اس سے چند امور مستنبط ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کسی زمانے یا کسی قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ ہمیشہ کے لئے تمام نوع بشری کے ہادی و رہنما ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمام نوع انسانی آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے کے لئے مکلف ہے۔

تیسرے یہ کہ آپ پر ایمان لائے بغیر اور آپ کا اتباع کئے بغیر ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ تینوں امور ایمانیات میں داخل ہیں، کیونکہ اسلام جس عالمگیر بشری تہذیب کا نام ہے اس کی عالمگیری اور آفاقیت اسی اعتقاد پر مبنی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے باہر بھی ہدایت میسر آسکتی ہے تو دعوت اسلام سے اس کی عمومیت سلب ہو جاتی ہے اور اسلام کی عالمگیری ختم۔

تکمیل دین رسالت محمدی کا دوسرا امتیاز جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے، یہ ہے:-

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (۹: ۵) وہی ہے جس نے اپنے رسول کو الھدیٰ اور دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (۵: ۱) آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت جس چیز کا نام ہے، اور دین حق کا اطلاق جس چیز پر ہوتا ہے وہ تمام و کمال رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھیج دی گئی ہے، "الدین" (یعنی جنس دین) پر آپ کی رسالت کلیۃً حاوی ہو چکی ہے، آپ کے ذریعہ سے دین کو مکمل کر دیا گیا ہے، اور ہدایت کی وہ نعمت جو پہلے انبیاء کے

توسط سے تھوڑی تھوڑی کرکے عطا کی جارہی تھی، اب اتمام کو پہونچا دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہدایت اور دین، اور علم حق میں سے کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جسے ظاہر کرنے کے لئے کسی اور نبی یا رسول کے آنے کی حاجت ہو۔ ان واضح الفاظ کے ساتھ جس تکمیل دین اور اتمام نعمت کا اعلان کیا گیا ہے، اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پچھلی نبوتوں کے ساتھ اطاعت اور اتباع کا تعلق منقطع ہوا اور آیندہ کے لئے نبوت کا دروازہ بند ہو جائے۔ یہ دونوں امور یعنی نسخ ادیان سابقہ اور ختم نبوت، رسالت محمدی صلعم کے امتیازی خصائص ہیں، اور قرآن مجید میں ان دونوں کو صاف طور پر پیش کر دیا گیا ہے؟

نسخ ادیان سابقہ نسخ ادیان سابقہ سے مراد یہ ہے کہ پچھلے انبیاء نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ اب منسوخ ہو گیا۔ ان کی نبوت وصداقت پر اجمالی اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے کیونکہ وہ سب اسلام ہی کے داعی تھے، اور ان کی تصدیق دراصل اسلام ہی کی تصدیق ہے، لیکن عملاً اطاعت اور اتباع کا تعلق اب ان سے منقطع ہو کر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، اس لئے کہ اول تو اصولاً کامل کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہی، دوسرے انبیائے سابقین کی تعلیم اور سیرت کے آثار تحریف ونسیان کی نذر ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کا صحیح اتباع ممکن نہیں رہا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے وہاں "الرَّسُولَ" یا "النَّبِیّ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے۔ مثلاً اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۳: ۱۴) اور اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴: ۸) اور مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۴: ۱۱) پھر یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انبیائے سابقین میں سے کسی کی ماننے والی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلُنَا اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو

يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ
الْكِتٰبِ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم
مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتٰبٌ مُّبِينٌ ۔ يَهْدِي
بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ
وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ
وَيَهْدِيهِمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵:۳)

تم سے بہت سی ایسی باتیں بیان کریگا جن کو تم کتاب
میں سے چھپاتے تھے نیز وہ بہت سی باتوں سے معاف
بھی کردے گا۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی
اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے
ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کا اتباع
کریں گے، سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت بخشے گا
اور انھیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے گا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کریگا۔

اور :-

اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي
التَّوْرٰةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ
لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰئِثَ
وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ
وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ
مَعَهُ ۙ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ قُلْ
يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ

اہل کتاب میں سے ایمان دار وہ ہیں جو اس ان پڑھ
رسول نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں
توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں
نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، پاک چیزوں
کو ان کے لئے حلال کرتا ہے ناپاک چیزوں کو حرام
قرار دیتا ہے، اور ان پر سے اس بوجھ اور ان بندشوں
کو اتار دیتا ہے جو ان پر مسلط تھیں۔ پس جو لوگ اس
ایمان لائے اور اس کی حمایت اور امداد کی اور اس
نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے، وہی
فلاح پانے والے ہیں۔ اے محمد کہدے کہ لوگو! میں تم
سب کی طرف اس خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں جو

وَالْاَرْضِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ (۷: ۱۵۸)

آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ کرنے اور مارنے والا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے ان پڑھ رسول ونبی پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان لایا ہے اور اس کی پیروی کرو۔ امید ہے کہ تم ہدایت پاؤ گے۔

ان آیات بینات میں نسخ ادیان سابقہ کی تصریح بھی ہے، اس کے معنی بھی بتا دیے گئے ہیں اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی گئی ہے، اس کے منطقی نتائج سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اب ہدایت اور فلاح کا دامن نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اتباع سے وابستہ ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ نبی امی کا دین دراصل اسی دین کی اصلاح و تکمیل ہے جو توراۃ اور انجیل کے ماننے والوں اور دنیا کی دوسری قوموں کے پاس بھیجا گیا تھا۔

ختم نبوت اسی طرح تکمیل دین کے دوسرے نتیجہ یعنی ختم نبوت کو بھی قرآن مجید میں بالفاظ صریح بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۳: ۴۰)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہوئے مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

نبوت کے سد باب کا یہ اتنا واضح اور کھلا ہوا اعلان ہے کہ اگر کسی کے دل میں زیغ اور کجی نہ ہو تو اس اعلان کے بعد وہ اسلام میں نبوت کے فتح باب کی گنجائش کسی طرح نہیں نکال سکتا۔ خاتم کو خواہ تائے مفتوح پڑھئے یا تائے مکسور، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ اس خدا کے علم میں ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے جس کے علم کے خلاف کوئی امر واقع

نہیں ہوسکتا۔

عقیدہ رسالت محمدی کے لازمی اجزاء

تکمیل دین، نسخ ادیان سابقہ، اور ختم نبوت کے اعتقادات دراصل اسلام کے ایمانیات میں داخل اور عقیدۂ رسالت محمدی کے لازمی اجزاء ہیں۔ اسلام کی دعوت عام اس بنیاد پر قائم ہے کہ نوع انسانی کے لئے اسلام کی شکل میں ایک ایسا مکمل مذہب پیش کر دیا گیا ہے جس میں پچھلے تمام مذاہب کی کمی پوری کر دی گئی ہے، اور آیندہ کے لئے کوئی کمی ایسی نہیں چھوڑی گئی جس کو پورا کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے۔ اس مکمل مذہب نے ہمیشہ کے لئے اسلام اور کفر، حق اور باطل کے درمیان ایسا متعین اور مستقل امتیاز قائم کر دیا ہے کہ اب قیامت تک اس میں کسی قسم کا گھٹاؤ اور بڑھاؤ نہیں ہوگا۔ جو کچھ اسلام اور حق ہے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کر دیا اب اس جنس کی کوئی مزید چیز آنے والی نہیں ہے کہ آیندہ کسی زمانے میں انسان کا مسلم اور حق پرست ہونا اس نئی چیز کو تسلیم کرنے پر موقوف ہو۔ اور جس چیز کو محمد صلعم نے کفر اور باطل قرار دیدیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے کفر اور باطل ہے۔ اس میں سے کوئی چیز نہ اب حق اور اسلام ہو سکتی ہے، اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز پر کفر اور اسلام کی تفریق قائم ہو سکتی ہے۔ یہی ٹھوس اور غیر تغیر پذیر بنیاد ہے جس پر عالمگیر اور دائمی ملت و تہذیب اسلامی کی عمارت تعمیر کی گئی ہے، اور ایسی بنیاد پر اس کی تعمیر اسی لئے کی گئی ہے کہ تمام دنیا کے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی ملت ایک ہی دین اور ایک ہی تہذیب کے اتباع پر متفق ہو سکیں، ایسی ملت جس کے کامل اور مستقل ہونے کا انہیں پورا یقین ہو، ایسا دین جو حق اور ہدایت پر پوری طرح حاوی ہو، حتی کہ اس جنس کی کسی شئے کے اس سے باہر رہ جانے کا اندیشہ نہ رہے، ایسی تہذیب جس کی عمارت میں کفر و اسلام کی کسی نئی تفریق سے رخنہ پڑ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ اسی اعتماد پر اسلام کی دعوت عام مبنی ہے، اور اسی پر اسلام کے دوام و استحکام کا انحصار ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ اسلام آجانے کے بعد بھی ادیان سابقہ کا اتباع درست ہے وہ دراصل اسلام سے دعوت عام کا حق

چھینتا ہے، کیونکہ جب اسلام کے سوا دوسرے طریقوں سے بھی ہدایت ممکن ہو تو تمام اقوام و ملل کو اسلام کی طرف دعوت دینا ایک فضول حرکت ہوگی ۔ اور جو شخص کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر زمانے کی ضروریات اور حالات کے لحاظ سے حذف و ترمیم اور اصلاح و اضافہ ہو سکتا ہے وہ دراصل اسلام سے دوام کا حق سلب کرتا ہے کیونکہ جو دین ناقص ہوا ور حذف و اضافہ کا محتاج ہو، وہ ہمیشہ کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کا دعوی کرے تو اس کا دعوی جھوٹا ہوگا ۔ پھر جو شخص کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کی گنجایش ہے، وہ درحقیقت اسلام کے استحکام پر ضرب لگاتا ہے ۔ نبوت کا دروازہ کھلا رہنے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جمعیت ہمیشہ پراگندگی اور تفرق کے خطرہ میں مبتلا رہے ۔ ہر نئے نبی کے آنے پر کفر اور اسلام کی ایک نئی تفریق ہو، اور ہر ایسے موقع پر بہت سے وہ لوگ اسلام سے خارج ہوتے چلے جائیں جو خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ پس اسلام میں نبوت کا فتح باب درحقیقت فتنے کا فتح باب ہے ۔ اسلام کی بیخ کنی کے جتنے اسباب ممکن ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام میں نبوت کا دعوی کرے ۔ امت مسلمہ کا نظام جمعیت اسی بنیاد پر تو قائم کیا گیا تھا کہ جو لوگ محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ سب مسلم اور مومن ہیں ایک ملت ہیں، ایک قوم ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں، رنج اور راحت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں ۔ اب اگر کوئی شخص آئے اور کہے کہ محمد اور قرآن پر ایمان لانا کافی نہیں ہے جو مجھ پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اگرچہ وہ محمد اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، پھر اس بنا پر وہ مسلمانوں میں کفر اور اسلام کی تفریق کرے، اور اس قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کردے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم بنایا تھا، ان لوگوں کے درمیان برادری کے رشتے کو کاٹ دے جنہیں قرآن نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کہکر بھائی بھائی بنایا تھا، ان کی نمازیں الگ کردے، ان کے درمیان مناکحت کے تعلقات توڑ دے، حتی کہ ان میں عیادت اور تعزیت اور شرکت جنازت

کا تعلق بھی باقی نہ رکھے، تو اس سے بڑھ کر اسلام اسلامی قومیت، اسلامی تہذیب، اور اسلام کے نظام جماعت کے ساتھ اور کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

اس بحث سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ رسالت محمدی کے ساتھ تکمیل دین، نسخ ادیان سابقہ اور ختم نبوت کا اعتقاد کس قدر اہمیت رکھتا ہے، اور اسلام کے بقا و استحکام اور اس کے شیوع عام کے لئے اس کا داخل ایمان ہونا کیوں ضروری ہے۔ (باقی)

بازار ساحری

کرشمۂ کن و بازار ساحری بشکن

از جناب مولانا عبداللہ العمادی

(۱)

ہرچند قرآن پاک نے پیشینگوئیوں سے بہت کم بحث کی ہے اور واقعات کی تاریخ بیان کرنے میں تو حصہ لیا ہی نہیں تاہم جہاں کہیں دیکھا کہ عوام میں کوئی ایسی بات مشہور ہے کہ اصل ایمان پر اس سے برا اثر پڑنے کا احتمال ہے وہاں فوراً واقعہ کی اصلیت بیان کرکے مناسب لفاظ میں شبہات کی تکذیب کر دی گو اس زمانے کے ہوا پرستوں کو اس کے ماننے میں تامل ہوا لیکن بعد کی دریافتوں نے ثابت کر دیا کہ هٰذَا الْقُرْاٰنُ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ

یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام شیطانوں کی پیروی کرکے کافر ہوگئے تھے ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں۔ جن پر خدا نے جادو اتارا ہے اور وہ لوگوں کو جادو کرکے ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

اس افواہ سے اول تو حضرت سلیمان کی رسالت میں شک پڑتا تھا اور دوسرے بڑا شبہ یہ ہوتا تھا کہ جادو جب ایسی بری چیز ہے کہ اس کے اثر سے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں تو خدا نے اس کو فرشتوں پر کیوں اتارا؟ تباہ و ہلاک کرنے کی قدرت تو صرف خدا میں ہے پھر دو اور شخص اس میں کیوں شریک ہو گئے کلام اللہ نے اس شبہ کو دو لفظوں میں صاف کر دیا ہے کہ "حضرت سلیمان" نے کفر نہیں کیا بلکہ

۱؎ - تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۱۵۱ -

شیاطین کفر کرتے تھے - اور ہاروت وماروت پر جادو خدا کی طرف سے اُترا نہیں تھا اور نہ وہ اُس کے ذریعہ سے کسی کو ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ اس سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے"۔

ظاہر ہے کہ اس بیان کے بعد شُبہ کی گنجایش باقی نہیں رہی تھی لیکن مواپرستوں کو اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک موسیو مورگن کو آثار بابل میں وہ کتابے نہ ملے جن میں ہاروت وماروت اور ان کی معشوقہ زہرہ کی سیاہ کاریوں کی پوری داستان درج ہے۔ ان کتابوں سے جو پختہ اینٹ کی سلوں پر ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں بظاہر تو ایسے فرشتہ صفت تھے کہ لوگ ان کو بادشاہ فرشتہ اور دیوتا سمجھتے تھے لیکن دراصل پھنسانے کے لئے انہیں بڑے بڑے ہتھکنڈے یاد تھے۔

کلام اللہ نے آج سے بہت پہلے اس غلط فہمی کو رفع کیا ہے اور مفسرین نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے امام رازی کہتے ہیں:-

قرء الحسن "الملكين" بكسر اللام وهو مروی ایضًا عن ابن عباس ثم اختلفوا فقال الحسن كانا علجين اقلفين ببابل يعلمان الناس السحر وقيل كان رجلين صالحين من الملوك[1]	حسن بصریؒ نے "ملکین" کے لام کو زیر سے پڑھا ہے اور یہی ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے - اختلاف پھر اس کے بعد ہے۔ چنانچہ حسنؒ کا قول ہے کہ ہاروت وماروت بیدین وناختنہ بریدہ تھے اور بابل میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ دوتوں صالح بادشاہوں سے تھے۔

ان بزرگوں نے جن میں حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ بصری ایسے صحابی وتابعی شامل ہیں تصریح کردی کہ ہاروت وماروت فرشتے نہیں تھے آدمی تھے اور یہی مشہور مفسر ضحاک کا بھی قول ہے

[1] تفسیر کبیر - جلد ۱ - صفحہ ۱۵۱۔

فتح البیان میں ہے۔

قَال الضحاکُ هما ارای هاروت و ماروت علجان من اهل بابل۔ ؎۱

ضحاک کا قول ہے کہ ہاروت و ماروت بابل کے دو بیدین آدمی تھے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ ہاروت و ماروت کا قصہ یہودیوں سے ماخوذ ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتہ نہ تھے بلکہ فرشتہ صفت ہونے کی وجہ سے ان کا یہی لقب پڑگیا تھا۔ فرماتے ہیں

وَمَاروی انهما مثلا بشرین ورُکّب فیهما الشهوة.. فحکی عن الیهود... وقیل رجلان سُمیا ملکین باعتبار صلاحهما ویؤیده قراءة الملکین بالکسر وَقیل "ما انزل" نفی معطوف علیٰ ما کفر وتکذیب للیهود فی هٰذهِ القصّة

یہ جو روایت ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے سے آدمی بنائے گئے اور ان میں شہوت دی گئی .... تو یہ یہودیوں سے مروی ہے .... ایک روایت میں ہے کہ یہ دونوں آدمی تھے اور زہد و تقوی کی وجہ سے لوگ انہیں فرشتہ کہتے تھے اور "ملکین" بالکسر کی قراءۃ اسی کی تائید کرتی ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ "ما انزل" نفی ہے اور "ماکفر" پر عطف ہے اور اس قصہ میں یہودیوں کی تکذیب ہے ؎۲۔

صاحب تفسیر مظہری یہ لکھ کر کہ "مَا انزل علی الملکین" میں "ما" نفی کے لئے ہے یعنی سحر خدا کی جانب سے نہیں اترا تھا۔ قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

وهٰذه القصّة من اخبار الاحاد بل من الروایات الضعیفة الشاذة ولا دلالة علیها فی القران بشیٔ ... وان

یہ قصہ خبر احاد ؎۳ بلکہ ضعیف و شاذ روایت سے منقول ہے اور قرآن میں اس پر کوئی دلیل نہیں ...... اس قسم کی کوئی حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ تو

؎۱ فتح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۳۴۔ ؎۲ بیضاوی شریف صفحہ ۷۰۔

؎۳ خبر احاد وہ حدیث جس کا راوی اول صرف ایک شخص ہو ایسی خبریں یقین کے لئے مفید نہیں ہوتیں۔

هٰذه الاخبار لم یرو منها شئ صحیح ولا سقیم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم [1] صحیح مروی ہے۔ اور نہ غلط۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "ملکین" سے مراد جبریل و میکائیل ہیں اور ہاروت و ماروت "شیاطین" سے بدل ہے۔

ان کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

اِتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَى الْمَلَكَيْنِ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۔ فیکون معنیا با لملکین جبریل ومیکائیل لان سحرۃ الیهود فیما ذکرکانت تزعم ان اللہ انزل السحر علی لسان جبرئیل ومیکائیل الی سلیمان بن داؤد فاکذبهم اللہ بذلك واخبر نبیه صلی اللہ علیه وسلم ان جبریل ومیکائیل لم ینزلا بسحر وبرا سلیمان مما نحلوہ من السحر واخبرهم ان السحر من عمل الشیاطین وانها تعلم الناس ذٰلك ببابل وان الذین یعلموهم ذٰلك رجلان احدهما هاروت والاٰخر ماروت فیکون هاروت وماروت علی هٰذه التاویل ترجمة عن الناس وردًا علیهم۔"

یعنی یہودیوں کا گمان تھا کہ خدا نے جبریل و میکائیل کے ذریعہ سے حضرت سلیمان پر جادو اتارا ہے۔ خدا نے اس کی تکذیب کی کہ ان دونوں فرشتوں پر کچھ نہیں اترا۔ جادو تو شیاطین سکھایا کرتے ہیں۔ اور بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو خاص آدمی ہیں جن کا یہی نام ہے۔

اس مطلب کو علامہ قرطبی نے بھی پسند کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے سوا کوئی تاویل

---

[1] تفسیر مظہری صفحہ ۸۶۔

قابل التفات نہیں. لکھتے ہیں۔ ھذا اولی ما قیل فیھا و لا یلتفت الی سواہ[۱]

---- ۲ ----

سحر کی تاثیر میں ہم خود کلام کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ البتہ فرماتے ہیں کہ "انہ خدع لا اصل لہ ولا حقیقۃ"[۲]۔ یعنی سحر ایک قسم کا فریب ہے جس کی کوئی اصلیت وحقیقت نہیں۔"

یہ امر کہ سحر اگر کوئی چیز نہیں تو تخت بلقیس کے اٹھا لانے کا عفریت نے کیوں کر دعوی کیا "خارج از بحث ہے اس لئے کہ مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ طرفۃ العین میں تخت کے اٹھا لانے سے بہت جلدی اٹھا لانا مراد ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

اختلفوا فی قولہ قبل ان یرتد الیک طرفک' علی وجھین الاول انہ اراد المبالغۃ فی السرعۃ کما تقول لصاحبک افعل ذلک فی لحظۃ وھذا قول مجاھد[۳]۔

غرض کہ ہاروت ماروت کو بعضوں نے فرشتہ لکھا ہے اور بعضوں نے آدمی لیکن اس آیت کو کسی نے متشابہ نہیں بتایا ہے

---- (۳) ----

اس ضمن میں ہم یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ سحر و جادو سے حقیقی عربی تمدن کو بھی تعلق نہ تھا یہ بنائے فساد عرب میں غیر قوموں کے طفیل سے دخیل ہوئی۔

اہل عرب ان چیزوں کو جو لطیف المأخذ اور دقیق الصنعت ہوتیں "سحر" کہا کرتے تھے۔

---

[۱] فتح البیان ج ۱ ص ۱۳۳۔ [۲] عینی ج ۱۰ ص ۶۹۵ طبع قسطنطنیہ و فتح البیان۔ ج ۱ ص ۱۳۲ طبع مصر [۳] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۶۶۶

اور جن چیزوں میں چابکدستی اور سحر کی سی گرفت ہوتی کہ چیز اپنی اصلی حقیقت کے خلاف نظر آتی، اس کو "شعبدہ" کہتے تھے۔ یہ لفظ معرب ہے جس کے معنی افسوں کے ہیں۔ سحر میں اصلی چیز فریب ہے۔ جس شخص پر سحر ہوتا اس کو فریفتہ (فریب دادہ) کہتے۔ شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ اپنی تفسیر عزیزی میں آلات صنعت و مکانیکس اور یورپ کی گھڑیوں کو بھی ایک قسم کے سحر میں شمار کرتے ہیں۔[1]

جاہلیت میں عرب کے قرب وجوار میں جو قومیں رہتی تھیں ان کا گمان یہ تھا کہ سحر و شعبدہ کا استفادہ جوہروں کے خواص اور حسابی امور میں اور مطالع نجوم کے علم سے ہوتا ہے جس پر سحر کرنا ہوتا اس کی صورت کا ایک ہیکل بناتے اور اس کے لئے ایک مخصوص وقت کے منتظر رہتے جس میں خاص خاص ستارے نکلتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ جلے ملا کر شیطانوں سے فریادی ہوتے تھے جس شخص پر سحر ہوتا ان کے خیال میں ان سب باتوں کی وجہ سے اُس کی عجیب حالت ہو جاتی اور حقیقت بدل جاتی۔ اس غرض کے لئے جن و شیاطین کو غلام بنانے کے لئے قربانی اور بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور اس فن میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں ابن وحشیہ کلدانی کی کتاب القرابین زیادہ مشہور ہے جس کو اس نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

عہد تمدن میں جب غیر قومیں اسلام کے زیر اثر آئیں اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اکثر لوگ مسلمان بھی ہوئے تو مسالۂ سحر کی اصلاح پر بھی توجہ کی اور اب یہ کہنے لگے کہ ہم لوگ خدا کی عبادت میں مستغرق رہتے ہیں تضرع کیا کرتے ہیں، شیاطین وارواح کو اس کے نام کی قسم دیتے ہیں،

---

[1] شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کی اصل عبارت یہ ہے: "قسم ہفتم سحر حیل است باستعانت آلات عجیبۃ الصنعت امور غریبہ حادث کنند و اتخاذ آن آلات بیشتر بر عمق در ریاضات مبنی می باشد مثل حیل بنی موسیٰ و آلات ساعت شناسی کہ درین زمان فرنگیان می سازند" (فتح العزیز مطبوعہ ۱۲۶۸ھ صفحہ ۲۵۸)۔

عربی میں "حیل" آلات کو کہتے ہیں اور بنی موسیٰ سے مراد موسیٰ بن شاکر کے تینوں بیٹے محمد و احمد و حسن ہیں جو بہت سے عجیب وغریب آلات کے موجد گزرے ہیں۔

اور نفسانی خواہشوں کو ترک کرکے عبادت کا التزام رکھتے ہیں لہٰذا جن وشیاطین و ارواح ہماری اطاعت و خدمت کرتے ہیں۔ ہمارے امر و نہی کے مطابق تصرف کیا کرتے ہیں اور خدا کے نام سے قسم دینے کی وجہ سے مطیع رہتے ہیں اس لئے کہ اسمارا آلہی کی خاصیت یہ ہے کہ ان کو مطیع کر سکتے ہیں۔"

قدیم زمانہ کفر و جہالت میں جادوگروں نے بہت سی کتابیں سحر میں لکھی تھیں۔ مثلاً کتاب آریوس بن اصطفان بن بطلینس رومی جو رومی افسونگروں میں سب سے بڑا عالم اور سربرآوردہ قوم کے لقب سے ملقب تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں جنوں اور دیووں کے حسب و نسب اور ابلیس کی اولاد اور ملکوں میں ان کے متفرق ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں ہر جنس سے جو عمل وارواح و استہلاکات و افعال مخصوص ہیں سب کو بیان کیا ہے۔ ایک دوسری کتاب لوہق ساحر کی ہے جس میں جنوں کی سرشت و موالید و مواخید اور سرکش ارواح کا بیان ہے یہ کتاب آریوس رومی کی کتاب سے بڑی ہے۔

محمد بن اسحاق صاحب مغازی و سیر کا بیان ہے کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں اور خصوصاً بعہد خلیفہ مقتدر باللہ عباسی افسانوں اور خرافات سے بڑی دلچسپی لیجاتی تھی۔ اس وجہ سے افسانہ نویسوں نے خرافات میں کتابیں تصنیف کیں اور جس تدریج میں آیا اُن میں جھوٹ بکا۔ اس قسم کے خرافات بہت سے لوگ بنایا کرتے تھے جن کو علامہ ابن الندیم بغدادی نے مع نام و لقب بیان کیا ہے علمی کتابوں کے ضمن میں جب سحر کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں تو عوام پوری طرح سے ادھر ملتفت ہوئے۔ اس لئے کہ وہم یہ سمایا ہوا تھا کہ سحر کے ذریعہ سے ہر قسم کے عجیب وغریب کام مثلاً ابھارنا۔ توجہ دینا۔ تسلط جمانا۔ فوجوں کو شکست دینا۔ دشمنوں کو قتل کرڈالنا۔ پانی پر چلنا اور دور و دراز مسافتوں کو تھوڑی دیر میں قطع کرنا ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ سحر میں اکثر کتابیں تالیف ہوئیں۔

اس کا بادی ابن ہلال تھا۔ پیشتر اہل عرب ان امور سے ذرا بھی واقف نہ تھے۔ یہ دروازہ اسی نے کھولا۔ وہ اس فن میں سرآمد تھا اور اس نے اکثر کتابیں لکھی تھیں مثلاً۔

۱۔ ارواح پراگندہ۔

۲۔ مفاخر اعمال۔

۳۔ تفسیر اقوال شیاطین بحضرت سلیمان علیہ السلام۔

۴۔ عہد سلیمانؑ با شیاطین[1] اس کے بعد ابن ہلال کے بہت سے مقلد نکل آئے جنہوں نے اپنی تصانیف میں اس کی پیروی کی۔ مثلاً ابن امام۔ صالح حدیری۔ عقبہ اذرعی۔ ابو خالد خراسانی۔ ابن ابی رصاصہ۔ خلف بن یوسف۔ حماد بن مرہ۔ وغیرہ وغیرہ جن کے نام گنانے سے کچھ حاصل نہیں۔

مسلمانوں میں شعبدہ کا بھی رواج نہ تھا۔ پہلے پہل عبید الکیس (فرزانہ) اور ایک اور شخص نے جو قطب الرحا کے نام سے مشہور تھا اس بازی گری میں نام پیدا کیا۔ اس فن میں ان دونوں کی کئی کتابیں ہیں۔ مثلاً عبید فرزانہ کی کتاب شعبدہ و کتاب الخرافات اور قطب الرحا کی کتاب جس میں چاکو دتی اور ریزہ ریزہ کر ڈالنے اور بیخ کنی کا بیان ہے اور ایک اور کتاب جس میں تلوار اور لکڑی اور پتھر اور چونا نگل لینے اور صابون و شیشہ چبانے اور کھانے کا تذکرہ ہے اور ان سب کی تدبیریں اور طریقے لکھے ہیں[2]

غرض کہ اسلام کو ان نکمے خرافات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ آلائش جس سے اس کا دامن آلودہ ہوا یونانی اور رومی تمدن کا بقیہ تھی اور اس پر علماء اسلام نے سخت اعتراضات کئے اور سحر و شعبدہ میں مشغول ہونے والوں کی بڑی توبیخ کی۔

---

[1] کتاب الفہرست صہ ۳۱۲ ؛ طبع لیپزک ۔

[2] کتاب الفہرست صہ ۳۱۲

کتب سماوی پر ایک نظر

از جناب ذوقی شاہ صاحب

(۳)

توریت اور دیگر کتب عہد عتیق کی ہیئت مجموعی پر مضامین ما قبل میں کافی حد تک اجمالی نظر ڈالی جا چکی ہے اعدا کے ہاتھوں سات مرتبہ اُن کی پوری بربادی اور احباب کے ہاتھوں اُن میں تحریفات و تغیرات و تبدلات کے قصے آپ سُن چکے ہیں۔ اب ان کتابوں پر فرداً فرداً تفصیلی نظر ڈالنا باقی ہے مگر اس کے لیے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہے۔ اس لیے سردست یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مُشتے نمونہ از خروارے صرف چند کتابوں کے مضامین پر کسی قدر تفصیلی نگاہ ڈال کر یہ تبلا یا دیا جائے کہ ان کتابوں کی اندرونی شہادت ہمیں کس نتیجہ کے نکالنے پر مجبور کرتی ہے۔

توریت جن کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ مروجہ توریت موسیٰ علیہ السلام کی الہامی تصنیف ہے اُن کے دعویٰ کی تائید اس توریت سے نہیں ہوتی کیونکہ ان کتابوں میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف کوئی متکلم کی ضمیر نہیں پائی جاتی بلکہ غائب کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً خروج باب ۳ میں درج ہے کہ:۔ "ا۔ اور موسیٰ اپنے سسر یترو کے جو مدین کا کاہن تھا گلے کی نگہبانی کرتا تھا۔" "۳۔ تب موسیٰ نے کہا کہ میں اب نزدیک جاؤں اور اس بڑے منظر کو دیکھوں کہ یہ بوٹا کیوں نہیں جل جاتا۔" "ا۔ موسیٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں۔" "۱۴۔ خدا نے موسیٰ کو کہا کہ میں وہ ہوں جو میں ہوں۔" "۱۵۔ پھر خدا نے موسیٰ کو کہا کہ تو بنی اسرائیل سے یوں کہیو کہ......"۔ اس قسم کی مثالیں توریت میں بکثرت موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عبارات کا لکھنے والا موسیٰ علیہ السلام

غیر کوئی اور شخص ہے۔ یہاں کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ تصنیف و تالیف میں اس زمانہ کا انداز بیان ہی یہ تھا کیونکہ یہ خیال غلط ہے۔ بائیبل خود شہادت دیتی ہے کہ اُس زمانہ میں بھی مصنف اپنی تصنیف میں اپنے لئے غائب کی ضمیر استعمال نہ کرتا تھا بلکہ متکلم کی ضمیر استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ دیکھو واعظ کی کتاب باب ۱ آیہ ۱۲ و ۱۳:۔ "میں واعظ یروشلم میں بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ اور میں نے اپنا دل لگایا کہ جو کچھ آسمان کے نیچے کیا جاتا ہے اُس سب کی تفتیش و تحقیق کروں"۔ آیہ ۱۶ میں ہے کہ: "میں نے یہ بات اپنے دل میں کہی" اسی طرح زبور اور امثال سلیمان اور کتاب نحمیاہ اور یرمیاہ اور حزقی ایل اور ہزاروں دیگر مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کتابوں میں اس زمانہ کا انداز بیان صاف تبلاتا تھا کہ مصنف اپنا حال بیان کر رہا ہے یا کسی غیر کا مگر توریت میں موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہر جگہ غائب ہی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور عبارت کی کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا کہ موسیٰ علیہ السلام موجودہ مروجہ توریت کے مصنف ہوں۔

علاوہ ازیں ان کتابوں میں بعض ایسے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جن کا وقوع مسلّمہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰ کی تصنیف سے نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کتاب پیدائش باب ۱۳ آیہ ۱۸ میں لکھا ہے کہ:۔ "اور ابرہام نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون (Hebron) میں ہے جا رہا"۔ اسی کتاب کے باب ۳۵ آیہ ۲۷ اور باب ۳۷ آیہ ۱۴ میں بھی حبرون کا نام آیا ہے جو ایک گاؤں کا نام ہے مگر یہ نام اس گاؤں کا اس وقت رکھا گیا جبکہ بنی اسرائیل نے فلسطین کو فتح کیا۔ اس سے قبل اس کا نام قریہ اربع تھا (دیکھو کتاب یوشع باب ۱۴ آیہ ۱۵)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ "توریت" فتح فلسطین کے بعد لکھی گئی اور فتح فلسطین موسیٰ علیہ السلام کے بعد واقع ہوئی۔

پیدائش باب ۳۵ آیہ ۲۱ میں ہے کہ:۔ "پھر بنی اسرائیل نے کوچ کیا اور اپنا خیمہ مجدال

عدر کے اوس طرف استادہ کیا۔" عدر (Edar) اُس منیارہ کا نام ہے جو یروسلم کے دروازہ پر تھا اور یروسلم کی تعمیر موسیٰ علیہ السلام کے سینکڑوں برس بعد وجود میں آئی۔ تو گویا اس "توریت" کا لکھنے والا وہ شخص تھا جو موسیٰ علیہ السلام سے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوا۔

پیدائش باب ۳۶ آیہ ۳۱ میں ہے کہ :- "اور بادشاہ جو ملک ادوم پر مسلط ہوئے پیشتر اس سے کہ بنی اسرائیل کا کوئی بادشاہ ہووے ہیں۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب پیدائش بنی اسرائیل میں چند بادشاہ ہو چکنے کے بعد لکھی گئی۔ اور اول صموئیل باب ۹ و نیز بائبل کے چند دیگر مقامات کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بعد کی ہے۔

خروج باب ۱۶ آیۃ ۳۵ و ۳۶ میں ہے کہ :- "اور بنی اسرائیل چالیس برس تک جب تک کہ وے بستی میں آئے من کھاتے رہے جب تک کہ وے زمین کنعان کی نواحی میں آئے من کھاتے رہے۔ اور ایک اومر ایفہ کا دسواں حصہ ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب خروج اس وقت لکھی گئی جبکہ بنی اسرائیل کنعان میں پہنچ چکے تھے اور من کا کھانا موقوف ہو چکا تھا اور ایفہ کا وزن رائج ہو چکا تھا اور مطابق کتاب یشوع باب ۵ آیۃ ۱۱ و ۱۲ کے یہ باتیں موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع نہیں ہوئیں۔

گنتی باب ۲۱ آیہ ۳ میں ہے کہ :- "خداوند نے اسرائیل کی آواز سنی اور کنعانیوں کو گرفتار کر دیا اور اُنہوں نے اُنہیں اور اُن کی بستیوں کو حرم کر دیا اور اُس نے اس مقام کا نام حرمہ رکھا"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس وقت تصنیف ہوئی جب کنعانی قتل ہو چکے تھے اور اُن بستیوں کا نام حرمہ ہو گیا تھا اور قاضیوں کے باب اول آیہ ۱۷ کی رو سے یہ واقعات موسیٰ علیہ السلام سے بہت بعد کے ہیں۔

گنتی باب ۲۱ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :- "اس سبب خداوند کے جنگنامہ میں لکھا ہے کہ خداوند آندھی میں وہیب پر قابض ہوا اور ارنون کی نہروں پر۔" اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے

مصنف موسیٰ علیہ السلام نہیں بلکہ اس کا لکھنے والا کوئی اور شخص ہے جس نے بعض حالات کو "جنگنامہ خداوند" سے نقل کیا اور یہ کتاب بقول طامس اسکاٹ مفسر کے کسی اسرائیلی یا بُت پرست نے خداوند کے نام سے تصنیف کی اور فتحین صیحون کے حالات کو اُس میں درج کیا۔ ان فتحین کا وقوع موسیٰ علیہ السلام سے بعد ہوا اور یہ جنگ نامہ بھی حضرت موسیٰ کے بعد کی تصنیف ہے۔ اول تو یہی بات تعجب کی ہے کہ ایک بُت پرست نے خداوند کے نام سے اِس جنگنامہ کو تصنیف کیا۔ اور دوسری اِس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس جنگ نامہ سے مضامین علانیہ طور پر "توریت" میں نقل کئے جاتے ہیں اور اس توریت کو موسیٰ علیہ السلام کی الہامی تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔

گنتی باب ۳۲ آیہ ۴۱ میں ہے کہ :- "اور منسی کا بیٹا یائیر نکلا اور اُس نے اُس نواحی کی بستیوں کو لے لیا اور اُن کا نام یائیر بستی رکھا" ونیز استثنار باب ۳ آیہ (۱۴) میں ہے کہ :- "منسی کے بیٹے یائیر نے ارجوب کی ساری مملکت کو جسوریوں اور معکاتیوں کی نواحی تک لیلیا اور اس نے اپنے نام پر ان کا نام یائیر کی بستیاں رکھا اور وہی نام آج تک ہے"۔ اول تو یائیر کا منسی کا بیٹا ہونا ہی غلط ہے۔ کیونکہ یائیر منسی کا نہیں بلکہ شجوب کا بیٹا ہے (دیکھو اول تواریخ باب ۲ آیہ ۲۲) شجوب اولاد یہوداہ میں سے تھا اور منسی اولاد یوسف ہے۔ دوم یہ واقعہ یعنی یائیر کا ان بستیوں کو لے لینا موسیٰ علیہ السلام سے بہت مدت بعد کا واقعہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ فقرہ کہ "وہی نام آج تک ہے" دلالت کرتا ہے کہ "توریت" کا یہ مصنف یائیر کے بھی بہت بعد ہوا۔ ہینری اسکاٹ صاحب اپنی تفسیر میں اس جملۂ آخری کا الحاقی ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

کتاب استثنار اگر موسیٰ علیہ السلام ہی کی تصنیف ہے جسے آپ نے اپنی دنیا کی اسی زندگی میں تصنیف فرمایا تو اس کتاب کا باب ۳۴ بھی عجیب وغریب باب ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کے انتقال اور آپ کی قبر اور آپ کے دفن ہونے اور آپ کی عمر کے ایکسو بیس (۱۲۰) برس ہونے اور آپ کے انتقال کے بعد آپ کے غم میں بنی اسرائیل کے تیس ۳۰ دن تک روتے رہنے کا حال درج ہے۔ اور اس باب کی آیہ ۱۰

میں یہ بھی لکھا ہے کہ :۔ "اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا"۔ اس آیت میں لفظ "اب تک" جو واقع ہوا ہے اس سے اب کونسا زمانہ سمجھا جائے ۔ اس باب نے عیسائی مفسرین کو بھی چکر میں ڈالدیا۔ چنانچہ تفسیر ہنری اسکاٹ میں ہے کہ :۔ "کلام موسیٰ باب گذشتہ پر ختم ہوا اور یہ باب (یعنی باب ۳۴) کسی کا ملایا ہوا ہے وہ شخص یشوع ہو یا سموئیل یا عزرا یا اُن کے بعد کوئی پیغمبر ٹھیک دریافت نہیں ہوتا۔ اس باب کی پچھلی آیات شاید بابل کی رہائی کے بعد عزرا کے عہد میں لکھی گئی ہوں گی"۔ جارج ڈوالی اور رچرڈ منٹ اور پادری یونس سنگھ اور پادری والش بھی اس موقع پر تقریباً اسی قسم کے الفاظ لکھتے ہیں۔ پادری فانڈر صاحب "اختتام دینی مباحثہ" کے صفحہ ۲۴۲ پر لکھتے ہیں کہ :۔ "موسیٰ کی پانچویں کتاب کی آخری فصل (یعنی استثنا کا باب ۳۴) جس میں موسیٰ کے وفات کی خبر ہے کسی اور نبی سے اُس کتاب میں الحاق ہوئی ہے"۔ سبحان اللہ! کیا حسن ظن ہے الحاق کرنے والے کے نام کا تو ابھی تک صحیح پتہ چلا نہیں صرف انکلیں ہی دوڑائی جارہی ہیں۔ مگر اس کے نبی ہونے کا یقین ہوگیا۔

یہ جو بعض اہل کتاب کا خیال ہے کہ عزرا نے گمشدہ توریت کو دوبارہ لکھدیا اور اپنے اس خیال کی تائید میں کتاب عزرا کے باب (۹) اور (۱۰) اور کتاب نحمیاہ کے باب (۸) کو پیش کرتے ہیں یہ خیال اُن کا درست نہیں۔ کیونکہ ان ابواب سے بس اسی قدر پایا جاتا ہے کہ عزرا نے بنی اسرائیل کی حرکتوں پر افسوس کیا اور عید وغیرہ سے متعلق اور طہارت وعبادت کی بابت جو احکام شریعت موسوی میں آئے تھے اور جنھیں بنی اسرائیل اسیری بابل کے زمانہ میں بھول چکے تھے اُن میں سے جو کچھ عزرا کو معلوم تھا وہ انہوں نے بنی اسرائیل کو سکھادیا کیونکہ کتاب عزرا باب ۷۔ آیہ ۶ کے مطابق عزرا موسیٰ کی شریعت میں فقیہ کامل تھا۔ کسی اور مقام اور کسی اور بات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ موجودہ توریت عزرا یا کسی اور نبی کی لکھی ہوئی ہو۔ مضمون نمبر۱ میں صراحت کردی گئی ہے کہ مروجہ توریت ان پانچ کتابوں پر مشتمل ہے (۱) پیدائش ۔ (۲) خروج ۔ (۳) احبار ۔ (۴) گنتی ۔ (۵) استثنار۔ انہیں اہل کتاب خمیس موسیٰ کے نام سے نامزد

کرتے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ کتابیں کسی ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ ان کا ماخذ مختلف تحریرات ہیں اور ان میں اگر غور کیا جائے تو باہمی تخالف اور تباین صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً کتاب پیدائش باب ۲۲ آیہ ۱۴ میں ہے کہ ابراہیم نے اس مقام کا نام جہاں اپنے بیٹے اسحٰق کی قربانی کرنا چاہی تھی "یہواہ یری" رکھا لیکن خروج باب ۶ آیہ ۳ میں خدا فرماتا ہے کہ ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب مجھے "خدائے قادر مطلق" کے نام سے جانتے تھے اور "یہواہ" کے نام سے واقف نہ تھے۔ استثنا باب ۵ آیہ ۲۲ میں ہے کہ خداوند نے دو لوحوں پر احکام لکھدیے اور اس سے زائد نہ فرمایا لیکن خروج باب ۲۰ آیہ ، سے پتہ چلتا ہے کہ اور بھی احکام بڑھائے گئے۔ پیدائش باب ۶ آیہ ۶ میں ہے کہ خدا انسان کو پیدا کرکے پچھتایا۔ مگر گنتی باب ۲۳ آیہ ۱۹ میں ہے کہ خدا آدم زاد نہیں جو پچھتاوے۔ استثنا باب ۵ آیہ ۹ میں خداوند کا یہ قول درج کیا گیا ہے کہ میں باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک لیتا ہوں۔ مگر اسی کتاب کے باب ۲۴ آیہ ۱۶ میں ہے کہ اولاد کے بدلے باپ دادے نہ مارے جائیں نہ باپ دادوں کے بدلے اولاد قتل کی جاوے۔ پیدائش باب اول کی رو سے پہلے جانور پیدا ہوئے اور بعد میں انسان۔ مگر اسی کتاب کے دوسرے باب کی رو سے پہلے انسان کی پیدائش ہے پھر حیوان کی۔ اس قسم کے اختلافات "خمیس موسیٰ" میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اس بنا پر زمانہ حال کے محققین یورپ بھی ان کتابوں کے مختلف ماخذ ہونیکو تسلیم کرتے ہیں۔

کتاب عزرا گو بعض علمائے عیسائی موجودہ توریت کو عزرا کی جمع کردہ کتاب تصور کرتے ہیں مگر تماشہ کی بات تو یہ ہے کہ خود عزرا کی کتاب جو بائیبل میں شامل ہے عزرا کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ مفتاح الکتاب (لندن ٹریکٹ سوسائٹی) کے صفحات ۱۳۲ و ۲۳۳ کی رو سے پہلی اور دوسری تواریخ اور عزرا اور نحمیاہ اور آستیر اور ملاکی قیاساً شمعون الصادق کی لکھی ہوئی ہیں اور ان چھ کتابوں کی تصنیف کا وقت دو سو بانوے (۲۹۲) برس قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے یعنی عزرا سے قریب ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال بعد "کتاب عزرا" کو شمعون نے لکھا۔ اس کتاب پر تنقیدی نظر ڈالنے سے بھی پورا یقین ہوجاتا ہے کہ یہ حضرت عزرا کی تصنیف کسی

صورت سے نہیں ہوسکتی بلکہ ان کے حالات میں شمعون نے چند سنی سنائی باتیں لکھدیں۔ یہی حال ملاکی نحمیاہ اور آستر کی کتابوں کا بھی ہے۔

کتاب یشوع کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت یشوع کی کتاب کس کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر لائٹ فٹ کے نزدیک فنحاس کی اور کالون کے نزدیک العاذر کی اور ہنری کے نزدیک یرمیاہ کی اور واٹل کے نزدیک سموئیل کی یہ تصنیف ہے۔ پادری یوس سنگھ اور پادری والش اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر گمان کرتے ہیں کہ پچھلی پانچ آیتوں کے سوا باقی کل کتاب یوشع نے لکھی۔ لیکن یہ صرف گمان ہے یقین نہیں۔ مضامین کتاب پر تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف یا تو مصنف کتاب یسیر کا ہمعصر ہے یا داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے بعد یعنی حضرت یشوع کے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوا۔

قاضیون کی کتاب اس کتاب کے مصنف کا بھی صحیح حال معلوم نہیں۔ بعض لوگ سموئیل کو قاضیون کی کتاب اور روت کی کتاب کا مصنف خیال کرتے ہیں مگر یہ محض اٹکل ہے نہ کہ امر یقینی۔

کتاب ایوب اس کتاب کے متعلق عیسائی علماء نے جو کچھ تحریر کیا ہے اسے دیکھکر اس نتیجہ پر آنا پڑتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف اس کتاب بلکہ ایوب علیہ السلام کے صحیح حالات تک سے باخبر نہیں۔ بعض الیہو کو بعض موسیٰ کو اور بعض ایوب کو اس کا مصنف خیال کرتے ہیں۔ مگر اسی کتاب کے باب ۳۲ آیہ ۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ الیہو حضرت ایوب سے تقریر کرنے والوں میں تھا نہ کہ مصنف کتاب۔ موسیٰ علیہ السلام بھی اس کتاب کے مصنف نہیں ہوسکتے کیونکہ عیسائی مصنفین ہی کی تحقیقات کی رو سے ایوب علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے گذرا۔ مفتاح الکتاب کے صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے کہ اکثر مفسرین نے ایوب علیہ السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے قبل ٹھیرایا ہے اور لکھا ہے کہ ایوب اس زمانہ کا نور تھا جو نوح اور ابراہیم کے درمیان گذرا۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۵ پر یہ بھی درج ہے کہ کتاب ایوب (۲۱۸۰) یا (۲۱۳۰) برس قبل مسیح تصنیف ہوئی۔ ایسی صورت میں موسیٰ علیہ السلام اس کتاب کے مصنف نہیں ہوسکتے۔ ٹامس اسکاٹ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں

کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایوب علیہ السلام کی اس کتاب کو عربی زبان سے عبرانی زبان میں ترجمہ کیا لیکن اس کا کوئی معقول ثبوت پیش نہیں کرتے۔ اگر بفرض محال اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تب بھی یہی کہنا پڑیگا کہ اصل عربی نسخہ مفقود ہے اور صرف ترجمہ موجود ہے جس کی صحت کی بابت کچھ نہیں کہا جاسکتا بلکہ جسمیں غلطیوں کا احتمال قوی ہے۔ کتاب کے مضامین پر اگر غور کیا جائے تو حضرت ایوب کی تصنیف بھی اسے نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں ایوب علیہ السلام کا نام ہر جگہ بصیغۂ غائب آیا ہے۔ ٹامس اسکاٹ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں ایوب علیہ السلام کے متعلق بھی اختلاف ہے بعض انھیں ل لبسا ؤ سے بتلاتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور اُن کی تیسری بی بی قطورہ سے ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ناحور کی اولاد سے ہیں غرضکہ نہ صرف کتاب ایوب بلکہ ایوب علیہ السلام کا حال بھی اہل کتاب کو تحقیقی طور پر معلوم نہیں۔ علاوہ اس کے اگر ان اقوال میں سے ایک بھی قول صحیح نکلا تو لازم آئیگا کہ حضرت ایوب بنی اسرائیل میں سے نہ تھے اور ثابت ہو جائیگا کہ نبوت خاندان بنی اسرائیل ہی میں محدود نہیں۔

زبور | مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق زبور وہ صحیفۂ سماوی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے داؤد علیہ السلام پر نازل ہوا لیکن جو زبور کہ موجودہ مجموعہ کتب عہد عتیق میں شامل ہے وہ ایک مرتبان ہے چوں چوں کے مربے کا جس میں متعدد و مختلف مصنفین کی قابلیت کی چاشنیاں مجتمع ہیں۔ تمہیدی باب کسی عیسائی کا لکھا ہوا ہے۔ اور بقول پادری جوسف آدوین کے ایک زبور کے مصنف موسیٰ علیہ السلام ہیں، جو کہ داؤد علیہ السلام سے قریب پانچ سو برس پہلے مبعوث ہوئے تھے بہتر (۷۲) زبوروں کے مصنف داؤد علیہ السلام، دو زبوروں کے مصنف سلیمن علیہ السلام، بارہ زبوروں کے مصنف آصف ایک زبور کے مصنف ایتان، گیارہ زبوروں کے مصنف بنی قرح، اور راکیاون (۵۱) زبوروں کے مصنف نامعلوم ہیں۔ یہ سب ملکر ایک سو پچاس (۱۵۰) زبوریں ہوئیں جو کہ موجودہ مجموعہ میں درج ہیں

بلحاظ مصنفین کے ان زبوروں کی ترتیب بھی بے تکی اور بے اصول واقع ہوئی ہے۔

سموئیل سموئیل کی دونوں کتابوں کے مصنف کا حال بھی معلوم نہیں۔ مفتاح الکتاب کے صفحہ ۹۳ پر ہے کہ ان دونوں کتابوں کا نام سموئیل اس لئے رکھا گیا کہ اس مشہور نبی نے پہلی کتاب کے اکثر باب تصنیف کئے۔ چنانچہ ربیوں کی روایت سے معلوم ہوا کہ پہلی کتاب کے چوبیں باب جن میں سموئیل کی پیدائش اور اعمال و احوال کا بیان ہے خود اسی نبی کے لکھے ہوئے ہیں اور اس کتاب کے باقی باب اور دوسری کتاب بالکل جاد اور ناتن نبیوں نے لکھی۔ چنانچہ اول سموئیل باب ۲۵ آیہ ۱ میں حضرت سموئیل کی وفات کا ذکر ہے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ اول کتاب سموئیل از باب ۲۵ تا آخر کتاب اور پوری کتاب دوم سموئیل کو حضرت سموئیل نے اپنی وفات کے بعد تصنیف کیا۔ ان دونوں کتابوں پر تنقیدی نظر ڈالنے سے بکثرت ایسے مقامات ان میں ملتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنف نہ حضرت سموئیل ہیں نہ حضرت جاد نہ حضرت ناتن۔

سلاطین سلاطین کی دونوں کتابوں کے متعلق بھی اسی قسم کی بحث ہے۔ عیسائی مفسرین میں ان کے مصنفوں کے متعلق اختلاف ہے اور کتابوں کے مضامین ان مفسرین کے کسی بیان کی تائید نہیں کرتے

واعظ کتاب واعظ عام طور پر سلیمان علیہ السلام کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہودیوں کا ایک بہت بڑا عالم ربی قمحی اسے یسعیاہ کی تصنیف کہتا ہے بعض علماء اسے تصنیف خرقیاہ قرار دیتے ہیں علماء جرمنی کا خیال ہے کہ قید بابل کے بعد یہ تصنیف وجود میں آئی یعنی سلیمان علیہ السلام سے قریب چار سو برس بعد۔

امثال سلیمان اس کتاب کے باب ۲۵ آیہ ۱ میں ہے کہ: "یہ بھی سلیمانؑ کے امثال ہیں جنہیں شاہ یہوداہ خرقیاہ کے رفیقوں نے قلمبند کیا" یعنی سلیمان علیہ السلام کے تین سو برس بعد۔ اور آیت مندرجہ بالا بھی خرقیاہ کے رفیقوں کے بعد کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ان کا ذکر بصیغہ غائب آیا ہے۔ اسی کو ا ۔ ب

کہتے ہیں۔ امثال کے آخری دو باب اجور اور لموئیل کے تصنیف کئے ہوئے ہیں اور ان دونوں اشخاص کا حال اہل کتاب کو بھی صحیح طور پر معلوم نہیں صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ہولڈن کا خیال ہے کہ لموئیل سلیمان علیہ السلام کا نام ہے۔ ہینری واسکاٹ اپنی تفسیر میں اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔

سلاطین اول باب ۴ آیہ ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے تین ہزار امثال بیان کیں لیکن یہ امثال سب کی سب موجودہ کتاب امثال میں درج نہیں۔ اس سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ کتاب امثال میں چند ابواب بعد میں بڑھا دئے گئے بلکہ اس کتاب سے بہت کچھ ضائع بھی ہو چکا ہے یعنی دونوں طرح کی آفتیں اس کتاب پر نازل ہوئیں۔ بڑھانے کی بھی اور گھٹانے کی بھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ کتاب واعظ اور کتاب امثال سلیمان علیہ السلام کے بڑھاپے کے زمانے کی تصنیف بیان کی جاتی ہیں۔ اور بڑھاپے میں جو ان کی کیفیت تھی وہ کتاب سلاطین اول باب ۱۱ میں بالتفصیل درج ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں کو چاہتا تھا اور یہ عورتیں ان بت پرست اقوام کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ نہ تم ان کے پاس جاؤ نہ وہ تمہارے پاس آویں ورنہ وہ یقیناً تمہارے دلوں کو اپنے باطل معبودوں یعنی بتوں کی طرف مائل کر دیں گی مگر سلیمان انہیں سے عاشق ہو کر لپٹا۔ اس کی سات سو بیگمات اور تین سو خواص تھیں جنہوں نے بڑھاپے میں اس کے دل کو خدا کی طرف سے برگشتہ کر کے بتوں کی طرف مائل کر دیا۔ اس نے بیت المقدس کے مقابلے میں بت خانہ بنوایا اور بتوں کو پوجنے لگا۔ اس لئے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا۔"

اب اگر اس تمام کذب بیانی اور بیہودہ گوئی کو مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک بت پرست جس پر خدا غضب ناک ہوا الہام یافتہ ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس پر الہامی کتابیں اللہ کی طرف سے نازل ہو سکتی ہیں؟ اگر یہ کتابیں یا ان میں سے ایک بھی الہامی نہیں تو ۲ طمطاؤس باب ۳ کی آیہ ۱

غلط ٹھیر گئی جس میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ عہد عتیق کی ہر کتاب الہام سے ہے اور لوگوں کی تعلیم و تربیت و اصلاح کے لئے آئی ہے۔

غزل الغزلات | اب کتاب غزل الغزلات کا بھی حال سن لیجئے۔ ٹامس اسکاٹ اپنی تفسیر میں اس کتاب کے متعلق پہلے یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"تحقیقی طور پر معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مصنف سلیمان ہیں جیسے امثال اور واعظ کے اور ہمیشہ اسے ایسا سمجھنا چاہیے جیسے پاک کتاب پس جس طرح اور الہامی کتابوں کو پڑھتے ہیں اسی طرح (یعنی عقیدت و ادب سے) اس کو بھی پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ کتاب بھی مثل اور کلام الٰہی کے ہے۔"

پھر یہی مفسر پہلی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"سلیمان نے بہت سی غزلیں کہیں ان میں بیشک سب بہت دانشمندی کی تھیں لیکن صرف یہی مقدس غزلیں بچ رہیں اور کتب مقدسہ میں شامل کی گئیں۔"

مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔ "حضرت سلیمان نے جب کہ فرعون کی بیٹی سے اُن کی شادی ٹھہری یہ پاک غزلیں تصنیف کیں"۔

سلاطین اول باب ۴ آیہ ۳۲ کی رو سے سلیمن علیہ السلام نے ایکہزار پانچ (۱۰۰۵) گیت کہے تھے مگر اب ان میں سے صرف اسی قدر باقی ہیں جو کتاب غزل الغزلات میں شامل ہیں۔ اور اس پوری کتاب میں آجکل صرف آٹھ ہی مختصر ابواب پائے جاتے ہیں جن میں کل ایکسو سترہ (۱۱۷) آیات ہیں۔ اہل کتاب کا اتفاق ہے کہ بقیہ گیت ضایع ہوگئے۔ اس سے عہد عتیق کی کتب مقدسہ کی بربادی کے قصوں کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے مضمون کے نمبر ۱ میں ان کتابوں کی بربادی کے واقعات رجعام شاہ یہود کے عہد (۹۷۱ قبل مسیح) کے بیان کئے ہیں۔ اور بقول علمائے اہل کتاب حضرت سلیمن کی کتاب غزل الغزلات کی تصنیف رجعام کے عہد سے

قبل ۹۱۴ء قبل مسیح میں ہوئی۔ کیا عجب ہے کہ ان بربادیوں کے واقعات کا عدد جو ہمنے سات یا آٹھ بیان کیا ہے وہ حقیقتاً اس سے بھی زاید ہو۔

اس سلسلہ میں جو اہم بات قابل غور ہے یہ ہے کہ استثناء باب ۷ آیہ ۲ و ۳ کی رو سے بنی اسرائیل کو غیر اقوام کے لوگوں اور اجنبی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا ناجائز ہے ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے خود ہی تو بنی اسرائیل کو اجنبی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی ممانعت فرمائی اور خود ہی فرعون کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے میں حضرت سلیمان کو عاشقانہ غزلوں کا الہام فرمایا۔

بعض عیسائی کہتے ہیں کہ اس کتاب میں استعارہ کے طور پر مسیح اور کلیسا کی محبت باہمی کا بیان ہے مگر غزل الغزلات میں اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ ساری کتاب حسن و عشق کے مضامین سے پر ہے جن میں مجازی کا پہلو غالب ہے اور اول سے آخر تک خدا کا کہیں ذکر تک نہیں آیا ہم چاہتے تھے کہ اس مقدس الہامی کتاب کے چند اقتباسات یہاں درج کرتے تاکہ ناظرین خود ہی فیصلہ کر لیتے اور انہیں اطمینان ہو جاتا کہ ان مضامین کو مسیح اور کلیسا کے عشق باہمی سے بہت بعد ہے لیکن یہ کتاب اس درجہ مقدس واقع ہوئی ہے کہ اس کے دو چار فقرے بھی یہاں درج کر دئے جائیں تو یہ مضمون ہمارے ملک کی شریف خاتونوں اور ہمارے بھولے اور معصوم لڑکوں کے پڑھنے کے قابل نہ رہے اس لئے جو حضرات ان الہامی برکات سے متمتع ہونا چاہتے ہیں وہ کتاب غزل الغزلات ہی کی سیر فرمائیں۔ مگر حق بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان بہت ارفع ہے اس سے کہ یہ کتاب اُن سے منسوب کی جاوے۔

آستر آستر کی کتاب جو کہ الہامی نوشتوں میں شامل ہے عجیب قسم کی الہامی کتاب ہے جس میں نہ کہیں خدا کا نام آیا ہے نہ کسی نبی کا ذکر ہے نہ پند ہیں نہ نصائح بلکہ ایران کے ایک بت پرست بادشاہ کی عیاشی، مے نوشی اور حرامکاری کے واقعات اس میں درج ہیں۔ بادشاہ عیش و عشرت کا ایک جشن مقرر کرتا ہے اُس کے سب امرا اور عہدہ دار اُس میں شریک ہوتے ہیں شراب کا دور چلتا ہے۔ بادشاہ شراب کی مستی میں

حکم دیتا ہے کہ ملکہ جو کہ نہایت حسین عورت ہے زیب و زینت سے آراستہ ہو کر اُس محفل جشن میں حاضر ہوتا کہ سب درباری اُس کے حسن و جمال کو دیکھیں اور اس شمع حسن کے پروانہ بنیں۔ مگر ملکہ اس حکم کی تعمیل سے انکار کرتی ہے۔ بادشاہ اس حکم عدولی پر غضب آلود ہوتا ہے۔ اور ملکہ کو معزول کر دیتا ہے اُس کے بعد بادشاہ کا دل بہلانے اور اُس کی تفریح کے لئے سلطنت کے ہر کونے اور ہر صوبے اور ہر شہر سے سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان خوبصورت اور باکرہ لڑکیاں چھانٹ کرلائی جاتی ہیں اور خواجہ سرا کے سپرد کی جاتی ہیں جو زیب و زینت سے ان لڑکیوں کو آراستہ کرتا ہے۔ پھر وہ لڑکیاں باری باری سے شام کو بادشاہ کے محل میں داخل ہوتی ہیں اور صبح کے وقت وہاں سے رخصت ہوتی ہیں اور دوبارہ ان کے محل میں داخل ہونے کی نوبت نہیں آتی تاوقتیکہ کسی خاص لڑکی کو خاص طور پر بادشاہ دوبارہ طلب نہ کرے۔ اسی سلسلہ میں ایک یہودی کی لڑکی بھی محل شاہی میں داخل ہوتی ہے جو اپنے غیر معمولی حسن و جمال اور اپنی دلکش اداؤں سے بادشاہ کو اپنا غلام بنا لیتی ہے۔ اور بالآخر وہاں کی ملکہ بن جاتی ہے۔ اس یہودی ملکہ کے بادشاہ پر تسلط پا لینے کی بدولت یہودیوں کی قوم جو اُس ملک میں ذلیل تھی باعزت ہوگئی، غلام تھی آقا بن گئی، مظلوم تھی ظالم ہوگئی، محکوم تھی حاکم ہوگئی۔ اس "نوشتہ الہامی" میں اسرائیلی مبلغین کے لئے شاید کوئی تعلیمی نکتہ مخفی ہو تو ہو، مگر متبعین مذہب کی تعلیم و اصلاح کے لئے ایک بھی بات نہیں پائی جاتی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے وقت الف لیلہ کے قصوں اور بائیبل میں امتیاز اٹھ جاتا ہے۔ بکثرت عیسائی متقدمین کو بھی اس کتاب کی صحت میں شبہ تھا چنانچہ کے۔ ہیر بلڈ اپنی کتاب کے جلد ۲ صفحہ ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ۔ "سینٹ ملیٹو نے کتب واجب التسلیم کی فہرست میں اس کا نام درج نہیں کیا" یوسی بیس اپنی تاریخ کلیسا میں لکھتے ہیں کہ "سینٹ گریگری نازین زین نے اپنے اشعار میں صحیح کتابوں کے نام درج کئے ہیں مگر ان میں اس کتاب کا نام نہیں لائے" پادری یونس سنگھ اور پادری وائش اپنی کتاب سوال و جواب میں سوال نمبر ۱۳ کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:- اس کتاب

کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خدا کا نام مذکور نہیں۔"

کتب بقیہ عہد عتیق کی بقیہ کتب مروجہ کا بھی کم وبیش ایسا ہی حال ہے۔ نہ ان کے مصنفین کا کسی کو یقینی طور پر علم ہے، نہ ان کے ماخذ کی بابت کچھ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے، نہ ان کے متعلق علمائے اہل کتاب بالتحقیق کہہ سکتے ہیں کہ ان میں اصلی حصہ کس قدر ہے اور الحاقی حصہ کس قدر، اور ان میں سے جو عبارات غائب کر دی گئی ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ بعض کتابوں کے غیر معتبر ہونے کا اقرار کرنے پر تو عیسائی علما بھی مجبور ہو گئے ہیں۔ مثلاً نحمیاہ یسعیاہ ذکریاہ روت حبقوق وغیرہم۔ یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ پادری فانڈر صاحب اپنی کتاب "اختتام دینی مباحثہ" کے صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ:- "توریت کے سب صحیفے (جو انتالیس ہیں) نبیوں کے وسیلہ سے لکھے گئے حضرت موسیٰ کے ایام تخمیناً پندرہ سو برس قبل مسیح سے حضرت ملاکی نبی تک کہ چار سو برس قبل مسیح میں تھے مگر بعض صحیفوں کی بابت معلوم نہیں کہ کس نبی کے ہاتھ سے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ایوب روت سلاطین وغیرہ کے حق میں یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کس نبی نے ان کو لکھا ہے اور بعض کتب میں اور نبیوں کی بات بھی داخل ہے۔ مثلاً زبور میں اکثر زبوریں جو حضرت داؤد سے نہیں ہیں اور ایسے ہی حضرت موسیٰ کی کتاب کی آخری فصل جس میں موسیٰ کی وفات کی خبر ہے کسی اور نبی سے اس کتاب میں الحاق کی گئی۔" پھر اسی صفحہ پر آگے چلکر پادری فانڈر صاحب لکھتے ہیں کہ:- "نبیوں کے سب گذارشات اور نام اور کلام اور ان کا سب لکھا ہوا بھی توریت میں داخل نہیں ہوا ہے۔"

کذب وافترا ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ پر بھی نعوذ باللہ بہت کچھ کذب اور بہتان لگایا گیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ نقل کفر کفر نباشد۔ پیدائش باب ۶ آیہ ۶ میں ہے:-

"خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا دونگا انسان کو اور

حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندے تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں"۔

یہاں اللہ تعالیٰ کو بھی معاذ اللہ ایک انسان سمجھ لیا گیا ہے جو بے سوچے سمجھے ایک کام کر بیٹھتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔ حزقی ایل باب ۲۰ آیہ ۲۵ میں ہے:۔

"میں نے انہیں وہ سنتیں دیں جو بھلی نہ تھیں (یعنی بری تھیں) اور وہ قوانین دیے جن سے وہ جیتے نہ رہیں"۔

معلوم ہوا کہ ان کا خدا اس دنیا میں ایسے احکام بھی نافذ کرتا ہے جن کی تعمیل موجب ہلاکت ہو۔ پیدائش باب ۱۸ آیہ ۲۱ میں ہے:۔

"میں اب اتر کے دیکھونگا کہ انہوں نے سراسر اس چلانے کے مطابق جو مجھ تک پہنچی ہے کیا ہے یا نہیں اور اگر نہیں تو میں دریافت کرونگا"۔

یعنی ان کا خدا عالم الغیب نہیں۔ یسعیاہ باب ۳ آیہ ۱۷ میں ہے:۔

"خداوند صیحون کی بیٹیوں کی چندیوں کو گنجی کرڈالے گا اور خداوند ان کی اندام نہانی کو برہنہ کرے گا"۔

سبحان اللہ! ان لوگوں کا تخیل خدا کے متعلق کس قدر غیر ممدانہ اور حیا پرور واقع ہوا ہے۔ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ کتاب ہوسیع کے باب ۱ آیہ ۲ کو بھی ذرا ملاحظہ فرمائیے:۔

"خداوند نے ہوسیع کو (جو کہ ایک پیغمبر تھے) فرمایا کہ جا اور ایک زناکار عورت اور زنا کے لڑکے اپنے لئے لے"۔

یعنی ایک زانیہ عورت سے زنا کر کے ولد الحرام لڑکے اپنے لئے پیدا کر۔ چنانچہ اس کتاب کا بیان ہے کہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ اسی باب میں اس "حکم خداوندی" کے بعد آیہ ۳ میں ہے:۔

"پس اس نے (یعنی ہوسیع نے) جاکر دبلیم کی بیٹی جومر کو لیا ۔ وہ حاملہ ہوئی اور بیٹا جنی"

پھر اسی کتاب کے باب ۳ آیہ ۱ و ۲ میں انہیں پیغمبر صاحب سے یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ :۔

"خداوند نے مجھے فرمایا کہ پھر جا اور ایک عورت سے جو اس کے دوست کی پیاری ہے مگر زانیہ ہے محبت کر ۔ ۔ ۔ سو میں نے اس کو پندرہ چاندی کے سکوں اور ڈیڑھ خومر جَو میں اپنے لئے مول لیا"

نکاح میں لانے کا کوئی ذکر نہیں آیا ۔ جس قوم نے اپنے خدا کے ساتھ اس قسم کی بیہودگیاں اور گستاخیاں کی ہیں اس کے ہاتھ سے انبیاء علیہم السلام کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں ۔ چنانچہ ہوسیع نبی پر زنا کی تہمت کے علاوہ سلیمان علیہ السلام کی غزل الغزلات اور اپنی بت پرست بیویوں کے اثر سے بڑھاپے میں ان کے بت پرست بن جانے کا جو اتہام آپ کی قوم نے آپ پر لگایا اس کا حال تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں ۔ مگر توہین انبیاء کے چند اور نمونے بھی ذرا ملاحظہ ہوں ۔

۱ ۔ لوط علیہ السلام پر اتہام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے شراب پی اور نشہ کی حالت میں اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ زنا کیا اور وہ دونوں بیٹیاں اس زنا سے حاملہ ہوئیں ۔ اس کی تفصیل کتاب پیدائش باب ۱۹ میں آیہ ۳۰ سے آخر باب تک درج ہے ۔ بڑی بیٹی کے جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام موآب رکھا گیا ۔ اسی موآب کی نسل سے داؤد علیہ السلام کا پیدا ہونا بھی تسلیم کیا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ۔ حالانکہ کتاب استثنار باب ۲۳ آیہ ۱ تا ۳ میں یہ بھی درج ہے کہ کوئی حرامی بچہ خداوند کی جماعت میں داخل نہیں ہوتا اور اس کی اولاد دسویں پشت تک خداوند کی جماعت میں داخل نہ ہوگی ۔

۲ ۔ یہوداہ اپنے بڑے بیٹے عیر کیلئے ایک عورت جس کا نام تمر تھا بیاہ لایا ۔ چند روز بعد عیر مر گیا ۔ تب یہوداہ نے اپنے دوسرے بیٹے اونان کو حکم دیا کہ ۔ اپنے بھائی کی جورو کے پاس جا اور اپنی بھاوج کا حق ادا کر اور اپنے بھائی کے لئے نسل چلا ۔ کچھ دن بعد اونان بھی مر گیا ۔ اس کے بعد ایک ایسا موقعہ آتا ہے جب یہوداہ

خود اپنی بہو سے زنا کرتا ہے اور اُس زنا سے توام لڑکے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام پھارس اور دوسرے کا ضارہ رکھا گیا ۔ اس افسانہ کی تفصیل کتاب پیدائش باب ۳۸ میں درج ہے ۔ تماشہ کی بات یہ ہے کہ یہ وہی پھارس ہیں جو داؤد علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کے اجداد میں شمار کیے گئے ہیں

۳ ۔ داؤد علیہ السلام پر یہ اتہام کہ انہوں نے اوریاہ کی بیوی کے ساتھ نعوذ باللہ زنا کیا سموئیل دوم کے باب ۱۱ میں بتفصیل درج ہے ۔ جو صاحب اس طرح تولد ہوئے اُن کا نام بھی مسیح علیہ السلام کے اجداد کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے ۔

۴ ۔ ابراہیم علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت پیدائش باب ۱۲ آیہ ۱۹ میں درج ہے ۔

۵ ۔ اسحٰق علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کی تہمت پیدائش باب ۲۶ آیہ ۹ میں موجود ہے ۔

۶ ۔ یعقوب علیہ السلام کا جھوٹ بولکر بڑے بھائی کی برکت خود لے لینا پیدائش باب ۲۷ میں مذکور ہے ۔

۷ ۔ سمرون کے چار سو نبیوں کا نعوذ باللہ خدا کے ایماء اور رضا کی بھیجی ہوئی ایک روح کے ورغلانے سے جھوٹ بولنے کی عجیب و غریب کہانی تواریخ دوم باب ۱۸ میں بیان کی گئی ہے ۔

۷ حضرت نحمیاہ کا فارس کے بُت پرست بادشاہ کی شراب پلانے کی نوکری کرنا اور اسے شراب پلانا اور اس نبی کا اُس بادشاہ سے (یعنی غیر اللہ سے) ڈرنا کتاب نحمیاہ باب ۱ آیہ ۱۱ اور باب ۲ آیہ ۱ اور آیہ ۲ میں لکھا ہوا ہے ۔

۸ ۔ اسحٰق علیہ السلام کا اپنے بیٹے یعقوب علیہ السلام کے ہاتھ سے شراب پینا اور اس کے بعد اپنے بیٹے کو دعائے برکت دینا بھی کتاب پیدائش باب ۲۷ آیہ ۲۵ میں مندرج ہے ۔

۹ ۔ کتاب پیدائش کے باب ۲۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحٰق علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے اور اسحٰق علیہ السلام ہی ذبیح اللہ تھے ۔ گو یہ اسمٰعیل علیہ السلام پر ظلم ہے تعجب تو یہ ہے کہ اسحٰق علیہ السلام کے

اکلوتے بیٹے ہونے کی تردید اسی کتاب پیدائش سے ہوتی ہے جس کے ابواب ۱۵-۱۶ - اور ۱۷ کے مطالعہ سے نہایت صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام (۸۶) برس کی عمر تک بے اولاد رہے۔ انہیں اولاد کی تمنا ہوی تو حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے جو ایک عرصہ تک اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے رہے جب ابراہیم علیہ السلام (۱۰۰) برس کے ہوے تو فضل آلہی سے آپ کے دوسرے فرزند یعنے اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوے - اس سے کتاب پیدائش کے باب ۲۲ کا الحاقی ہونا ظاہر ہے - اور اگر یہ باب الحاقی نہیں تو ابواب ۱۵-۱۶- اور ۱۷ کو الحاقی ماننا پڑیگا -

۱۰ - محرفین توریت نے بہت بڑا غضب یہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کو کتاب خروج کے باب ۳۲ میں بانی گوسالہ پرستی بنا کر خدا پرستوں کے زمرہ سے خارج کر دیا - مگر اسی کتاب کے اسی باب کی آیات ۳۳ و ۳۵ و ۲۸ سے اس اتہام کی صاف تردید ہوجاتی ہے - آیہ ۳۳ میں ہے کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اُسی کو اپنے دفتر سے میٹ دونگا - اور آیہ ۳۵ میں ہے کہ خدا نے اُس بچھڑے کے بنائے جانے کے سبب لوگوں پر مری یعنی وبا بھیجی - اور آیہ ۲۸ میں ہے کہ اُس دن گوسالہ پرستی کی سزا میں تین ہزار آدمی مارے گئے - مگر ہارون علیہ السلام ان تین سزاوں میں سے کسی ایک سزا کے بھی متوجب نہ ٹھیرے نہ وہ قتل کئے گئے - نہ مری یعنی وبا نے انھیں ستایا - نہ خدا کے دفتر سے ان کا نام کاٹا گیا بلکہ متعدد موقعوں پر انہیں برگزیدہ اور مقدس کہا گیا اور انہیں کی نسل میں کاہن کا عہدہ مقرر رہا -

شاعرانہ مبالغے قطع نظر ان جملہ امور کے جو اب تک اِس سلسلۂ مضامین میں بیان ہو چکے ہیں اگر صرف زبان اور انداز بیان اور عبارت کے وقار اور اُس کی متانت کو دیکھا جائے تو مروجہ کتب عہد عتیق نہ کلام الٰہی معلوم ہوتی ہیں نہ انبیاء علیہم السلام کے الہامی نوشتے - کہیں شاعرانہ مبالغے ہیں کہیں رکیک الفاظ کہیں حیا سوز کلمات جن کی مثالوں کے پیش کرنے کے لئے نہ یہاں موقع ہے نہ گنجایش - یہ رکاکت اور بعید از صدق مبالغے عادت انسانی ہی سے متعلق ہیں نہ کہ الہام ربانی سے -

ناقابل ہدایت عہد عتیق کی کتابوں پر اپنے اس تبصرہ کو ہم ایک عیسائی محقق کے کلام پر ختم کرتے ہیں۔ پادری بیدلی صاحب ایک رومن کیتھولک محقق ہیں جنہوں نے پراٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائیوں کو مخاطب کرکے ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ ٹامس انگلس صاحب نے اردو میں کرکے اس کا نام مرآت الصدق رکھا ہے۔ اس کے صفحہ ۱۶۹ پر کتب عہد عتیق و جدید کے ناقابل اعتبار ہونے پر زور دیا گیا ہے اور بالآخر لکھا ہے کہ:-

"اب میں کسی پراٹسٹنٹ سے پوچھتا ہوں کہ بھلا کیا وہ اپنی نجات کی پونجی صرف ایک ایسی کتاب کے بھروسہ پر رکھ سکتا ہے جسے وہ کلام الٰہی ثابت نہیں کرسکتا ایک کتاب جسے وہ سمجھ نہیں سکتا ایک کتاب جسے جُہلا و ضعفاء (یعنی ضعیف اعتقاد والے) اپنی ہلاکت کے لئے پڑھتے ہیں ایک کتاب جس کے اکثر حصّے کھوئے گئے ہیں ایک کتاب جو بدبختی غلطیوں سے بھری گئی اور ناقص کی گئی ہے اور جس میں نجات پانے کی سب ضروری چیزیں نہیں ہیں۔ ایسی کتاب کیا ایمان کا قاعدہ کل و مکفل نجات ہوسکتی ہے؟"

اب ہم اس سلسلہ مضامین کے آیندہ نمبر میں عہد جدید کی کتب مقدسہ پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

(باقی)

قرآنی نسخۂ اصلاح

الحاج مولنا ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب خیر سنوسی القادری (ورنگل)

دنیا جانتی ہے کہ اسلام سے پہلے شراب عرب کی گھٹی میں پڑی ہوی اور اپنے چاہنے والوں کا عیب نہیں سنبر بنی ہوی تھی چھوٹے نہیں بڑے ادنی نہیں اعلی طبقہ کے لوگ علانیہ خم کے خم لنڈھاتے اور داد امتیاز حاصل کرتے تھے جس طرح اور دوسرے امور میں احکام اسلام بتدریج نازل ہوتے رہے ہیں۔ اس خصوص میں بھی ایک تدریجی تعلیم کا مرقع اسلام نے اپنے فرزندوں کے روبرو پیش فرمایا۔

شراب میں جہاں شدت کی خرابیاں ہیں وہاں خوش وقتی اور سرور خاطر اور ہیجان جذبات بھی ہے جب اس کی حقیقت کی نسبت سوال کیا گیا تو صاف صاف تبلا دیا گیا کہ بے شک اس میں کچھ تھوڑا سا نفع بھی ہے۔ مگر اس سے جو نقصان مترتب ہوتا ہے وہ اس نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ اسی نقصان کثیر و عصیان کبیر کی وجہ سے یہ چیز شدید گناہ میں داخل ہے۔

اس علت ترک و اجتناب کو واضح کرنے کے بعد "نماز" جو ایک مسلمان کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ اہم ضروری اور پیاری چیز ہے (گو ہماری کج فہمی اور بد نصیبی سے وہ اس زمانہ میں ایسی نہ رہی ہو)۔ اس سے نشیات کا معارضہ و مقابلہ کرایا گیا اور ارشاد ہوا۔ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى یعنی جب تم نشہ میں رہو تو نماز کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ اب مسلمانوں کے لئے یہ ایک مذہبی امتحان درپیش ہو گیا کہ انھیں اب کا مذہب اور نماز پیاری ہے یا سکر و شراب۔ نماز جسے دیدہ و دانستہ ترک کر کے ایک مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا اس سے شراب کے اس مقابلے اور معارضہ نے مسئلہ کی صورت کذائی میں ایک

خاص اہمیت پیدا کردی۔ یعنی جو شراب کا استعمال کرے وہ مسجد میں نہ آنے پائے جو مسلمان کا واحد دینی و روحانی کلب اور ایسا کلب ہے جو دن بھر میں پانچ دفعہ کھلتا اور بند ہو جاتا ہے۔

یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو ایک مسلمان کو عملاً اپنی قوم اپنے گروہ اور اپنے جتھے سے ذات باہر کرنے والی ثابت ہوتی۔ اب جو شخص مسجد میں پی کر آتا اس کا آنا ممنوع اس پر آوازے کسے جاتے اور اس کے ساتھ شدت کا برتاؤ ہوتا اور جو نہ آتا وہ اس لطف اجتماعی اور سوسائٹی سے محروم پھر اس کی نسبت یہ بدگمانی پیدا ہوتی کہ وہ ضرور کہیں پیے پڑا ہوگا۔

پرہیزگاری کی تعلیم کو اس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ موثر پیرایہ میں اور دلنشین طریقہ پر اس درجہ تک پہنچانے کے بعد اب صاف الفاظ میں فرمان قضا توامان نازل ہوا۔ "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" یہ ایک ناپاک شیطانی کام ہے اس سے باہمی بغض و عناد جھگڑا و فساد ہونے کے علاوہ (کہ یہ ام الخبائث تمام برائیوں کی جڑ ہے) یہ چیز تم کو نماز اور یاد الٰہی سے بھی روکتی ہے۔ "وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ" پھر تم ہی کہو کہ ایک مسلم جس کی مایۂ ناز سوشل اجتماعی زندگی میں یہ اس قدر انقلاب پیدا کرنے والی ہو وہ اس سے پرہیز کرنے اور پرحذر رہنے پر مجبور ہوگا یا اس کے خانہ خراب شوق وذوق کو جاری رہنے دیگا؟ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ کیا تم اس سے باز نہیں آؤ گے چونکہ جواب ظاہر اور بوجوہ بالا تم خود اس کے ترک و پرہیز پر مجبور ہو جاتے ہو لہٰذا تمہارے اس طرح قائل ہونے کے بعد فرمان ذیشان حضرت سبحان شرف صدور لاتا ہے "فَاجْتَنِبُوْهُ" آیندہ اس سے ہمیشہ کے لئے باز رہو۔ کہ اب یہ قطعاً حرام کر دی گئی۔ اس حکم قضا شیم کے نفاذ و اعلان کے بعد گھروں میں جو شراب رکھی ہوئی تھی اس کو فوراً موریوں سے نکل کر مدینہ کی گلیوں میں بہتے ہوئے دنیا نے دیکھ لیا۔

غور کرنے سے پہلے یہ صاف معلوم ہوگیا کہ قرآن حکیم نے نماز و شراب کو ضدین اور نقیضین قرار دیا ہے

یعنی جو شراب پیے وہ نماز نہ پڑھے اور جو نماز پڑھے وہ شراب پی نہیں سکتا۔ یا اور صاف الفاظ میں جو شراب پیے وہ مسلمانوں کی دینی اور روحانی تفریح گاہ (مساجد) کی ہیچ وقتہ لطف اندوزی سے محروم، اسلام کی اجتماعی دلچسپیوں اور اس کے روحانی کلب کی مسرتوں سے بے نصیب رہے یعنی خدا کے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے پائے۔ یا صاف صاف یہ کہ اسلامی برادری سے نکل کر ذات باہر ہو جائے۔ چونکہ یہ ام الخبائث تمام برائیوں کی جڑ ہے اس کے استیصال کے لئے نماز کو اس طرح پر اس کا مدمقابل ہی بنا کر نہیں کھڑا کیا گیا بلکہ نماز کو اس کے ترک و امتناع کا باعث بنا کر یہ ارشاد فرمایا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ نماز اس کی ذمہ دار ہے کہ وہ ایک نمازی کو تمام بدکاریوں اور برائیوں سے روک رکھے۔

اس ساری روئداد کا حاصل کیا اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو شراب سے نماز اور صرف نماز ہی بچا سکتی ہے؟ واضح ہو گیا کہ جس طرح شراب ام الخبائث (برائیوں کی جڑ) ہے اسی طرح نماز بھی "ام الطیبات" (ساری نیکیوں کی منبع) ہے۔ اس کی پابندی ایک مسلمان کے لئے سعادتوں کے بے انتہا خزانے مہیا کر دیتی ہے۔ اسی بنا پر حضور صاحب شریعت علیہ التحیۃ والثنا نے فرمایا "اَلصَّلٰوۃُ مِفْتَاحُ کُلِّ خَیْرٍ" نماز ہر نیکی کے خزانے کی کنجی ہے جو اس کا پابند ہوگا اس کے وجود سے جتنی برائیاں ہیں خارج اور جس قدر بھلائیاں ہیں داخل ہو جائیں گی۔ غرض یہی نماز ایک مسلم کی مصلح اور مفلح اور یہی اس کے واسطے ایک اخلاق آفریں نسخہ ہے جس کو اسلام نے تجویز فرمایا اور اسی بنا پر ارشاد ہوا۔ "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ۔

تو کیا آج مسلمان اس نسخہ کیمیا سے غافل ہو گئے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں نے نماز کو کھو کر سب کچھ کھو دیا۔ اور ساری برائیوں کو اس کی بجائے سمیٹ لیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

قرآن اور حدیث

منکرین حدیث کے مسلک پر ایک ناقدانہ نظر

(۲)

اس سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لئے ہے اور جب ایسا ہے تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لئے ہیں جن میں آنحضرت کے احکام کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے آپ کی ذات کو اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے، آپ کے اتباع کو رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ کہا گیا ہے، اور ہدایت کا دامن آپ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَھْتَدُوْا (۲۴ : ۷) رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے، اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو رہے گی۔ پس جب یہ دونوں چیزیں رسول اللہ کے اتباع اور آپ کے نمونۂ حیات کی تقلید کے ساتھ وابستہ ہیں تو لازم ہوا کہ سیرت نبوی کے وہ پاک نمونے اور زبان وحی ترجمان کے وہ مقدس احکام بھی قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہیں جن سے رسول اکرم کے ہم عہد لوگوں نے ہدایت پائی تھی، ورنہ بعد کی نسلوں کے لئے ہدایت ناقص رہ جائیگی۔

میں نے "ہدایت ناقص رہ جائیگی" کے الفاظ بہت ہی نرم استعمال کیے ہیں تنزیل کتب کے ساتھ رسالت کا جو ناقابل انقطاع رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے، اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کی جو غیر متبدل سنت ابتدا سے چلی آرہی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ اگر اسوۂ رسول باقی نہ رہتا، اگر رسول اللہ کے احکام باقی نہ رہتے، اگر ہدایت کا وہ پاک چشمہ بند ہو جاتا جو رسول اللہ کی سیرت میں تھا، تو محض کتاب اللہ سے دنیا کی ہدایت ہی نہ ہو سکتی۔ اس لئے کہ رسالت کے آثار مٹ جانے کے

بعد کتاب اللہ کا باقی رہجانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے رسول کے بغیر تنہا کتاب اللہ کا نازل ہونا۔ اگر کتاب کی تنزیل کے بعد آثار رسالت کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں ہے تو سرے سے تنزیل کے لیے رسالت ہی کی ضرورت نہیں ہے یہ خدا کی حکمت پر کھلا ہوا طعن ہے۔ اور اگر تنزیل کے ساتھ رسالت کا ہونا لازم ہے تو یقیناً اس کے ساتھ آثار رسالت کا رہنا بھی لازم ہے۔ بغیر آثار رسالت کے تنہا کتاب اللہ موجب ہدایت نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں اگر آثار رسالت محو ہو جاتے تو مسلمانوں کا حشر ان قوموں کا سا ہو جاتا جن کے پاس بجز افسانوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لوگ کہتے کہ جس شخص پر تمہارے قول کے مطابق یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کے حالات تو بتاؤ کہ ہم ان کو جانچ کر دیکھیں کہ آیا فی الواقع وہ رسول خدا ہونے کے قابل تھا بھی یا نہیں۔ مگر ہم انہیں کچھ نہ بتا سکتے۔ لوگ پوچھتے کہ تمہارے پاس قرآن کے دعوی کی تائید میں کونسی ایسی خارجی شہادت ہے جس سے تمہارے نبی کی نبوت ثابت ہو سکتی ہو؟ مگر ہم کوئی شہادت نہ پیش کر سکتے۔ ہم کو خود یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ کب اور کن حالات میں قرآن نازل ہوا؟ کس طرح اس نے دلوں کو مسخر کیا؟ کس طرح اس نے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کیا؟ کس طرح رسول اللہ کی شخصیت اور آپ کی پاک زندگی کو دیکھ کر لوگ فوج در فوج ایمان لائے؟ کس طرح آپ نے نفوس کا تزکیہ کیا، حکمت کی تعلیم دی اور آیات الٰہی کی تلاوت سے معرفت حق کا نور پھیلایا؟ کس طرح آپ نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں تنظیم اور اصلاح کا وہ زبردست کام انجام دیا اور شریعت کا وہ ہمہ گیر اور حکیمانہ ضابطہ بنایا جو محض انسانی عقل کے بس کا کام نہیں ہے، اور جو اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ آپ حقیقت میں اللہ کے رسول تھے؟ یہی نہیں بلکہ اگر وہ روایات نہ ہوتیں جو منکرین حدیث کے نزدیک دریا برد کر دینے کے قابل ہیں تو ہم قرآن کی سند اس کے لانے والے تک نہ پہونچا سکتے، ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ ہوتا کہ یہ قرآن حقیقت میں وہی ہے اور اسی عبارت میں ہے جس میں رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ ہماری اس کتاب کی حیثیت وہی رہ جاتی جو ژند اوستا، گیتا، ویدوں اور بودھ مذہب کی کتابوں کی حیثیت ہے۔

اسی طرح ہماری مذہبی زندگی کے جتنے اعمال اور جتنے اصول و قوانین ہیں سب کے سب بے سند ہوتے۔ نماز روزہ حج زکوٰۃ اور دوسرے اعمال جس صورت میں ادا کئے جاتے ہیں ان کے متعلق ہم نہ بتا سکتے اور خود نہ جانتے کہ یہ سب رسول اللہ کے مقرر کئے ہوئے طریقوں پر ہیں۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ان سب اعمال کے لئے "سنت متواترہ" کافی ہے۔ مگر مدون اور مستند روایات کی غیر موجودگی میں اس "سنت متواترہ" کی حیثیت بجز اس کے اور کیا ہوتی کہ اگلوں سے پچھلوں تک نسلاً بعد نسلٍ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے؟ اس قسم کی متواتر سنتیں تو ہندو، بودھوں، پارسیوں اور دوسری قوموں میں بھی ہیں۔ وہ سب بھی یہی کہتے ہیں کہ جو عبادتیں ہم کرتے ہیں اور جو رسمیں ہم میں جاری ہیں وہ بزرگوں سے یونہی چلی آرہی ہیں۔ مگر کیا آج ان کی "سنت متواترہ" پر دنیا اور خود ان قوموں کے روشن خیال لوگوں میں یہ شک نہیں کیا جاتا کہ خدا جانے ان طریقوں کی اصل کیا تھی اور امتداد زمانہ کے ساتھ وہ کس طرح بدلتے چلے گئے؟ کیا ان تمام طریقوں پر آج رسوم پرستی (Ritualism) کی پھبتی نہیں اُڑائی جاتی؟ اگر کوئی شخص ان میں کوئی تغیر کرکے کوئی نئی بدعت ایجاد کرنا چاہے تو کیا ان کے پاس اس بدعت کے خلاف کوئی حجت بجز اس ایک دلیل کے موجود ہے کہ جو کچھ باپ دادا کرتے چلے آرہے ہیں اس میں تغیر نہیں ہوسکتا؟ پھر اگر منکرین حدیث کی خواہش کے مطابق ہمارے ہاں بھی ایسی مسلسل مستند اور مرتب روایات نہ ہوتیں جو ہمارے عہد سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر واقعہ یا ہر قول کی سند ہم پہونچا دیتی ہیں، اور اگر ہمارے پاس بھی صرف عمل متواتر ہی باقی رہ جاتا جس کو "حق گو" صاحب "سنت متواترہ" سے تعبیر فرماتے ہیں، تو ہمارے مذہبی اعمال اور معتقدات کا حال ان طریقوں اور ان اوہام سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں، اور جن کو "رسوم" اور "مذہبی فسانوں" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غور کیجئے، یہ اسلام کے لئے قوت اور استحکام کا سبب ہوتا یا کمزوری و نا استواری کا؟

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسول کا رہنا قطعاً ضروری اور ناگزیر ہے۔

اب اس سوال کی طرف آئیے کہ سنت رسول کے ہم تک پہنچنے کی صورت کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد سے رحلت تک تقریباً ربع صدی کا جو زمانہ بسر کیا وہ محض قرآن پڑھنے اور سنانے میں بسر نہیں ہوا ہوگا، بلکہ آپ تلاوت آیات کے علاوہ بھی شب و روز اپنے دین کی تبلیغ اور اپنے گمراہ ابنائے نوع کی تعلیم و تلقین اور اپنی عبادات اپنے اخلاق اور اپنے اعمال حسنہ کا نمونہ پیش کرکے لوگوں کی تربیت اور اصلاح میں مشغول رہتے ہوں گے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲: ۱۵۱) یہ حکیمانہ زندگی ایسی شدید مصروفیت میں بسر ہوتی تھی کہ آپ کو اپنے آرام کا ذرہ برابر خیال نہ تھا۔ ہر لمحہ یا تو عبادت میں بسر ہوتا تھا یا وعظ و نصیحت، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس میں، حتیٰ کہ بار بار اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اپنے آپ کو کیوں ہلاک کیے ڈالتے ہیں؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسی سرگرم مصلحانہ زندگی میں آیات قرآنی کے سوا کوئی بات بھی آپ کی زبان سے ایسی نہ نکلتی تھی جو یاد رکھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوتی؟ کوئی کام بھی آپ کی زندگی کا ایسا نہ تھا جس کو لوگ اپنے لیے نمونہ سمجھتے اور دوسروں کو اس پاکیزہ نمونے کی تقلید کا مشورہ دیتے؟ آپ کے اقوال و اعمال کے متعلق تو اہل ایمان کا اعتقاد تھا اور قرآن نے بھی ان کو یہی اعتقاد رکھنے کا حکم دیا تھا کہ آپ کا ہر ارشاد برحق ہے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (۵۳: ۱) آپ کا ہر عمل واجب التقلید ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے تو مسلمان یقیناً آنحضرت کے ہر ارشاد کو دل سے سنتے ہوں گے، ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کے سامنے حضور کے اقوال و اعمال کے چرچے کرتے ہوں گے۔ جہاں رسالت یا کسی قسم کے تقدس کا اعتقاد نہیں ہوتا وہاں بھی بڑے لوگوں کی باتوں اور ان کی حرکات و سکنات پر لوگ نظر رکھتے ہیں، اور ان کے اقوال و اعمال کے چرچے کیا کرتے ہیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ صحابہ کرام جیسے مقدس انسان کو [illegible] اور [illegible]

دوسرے تمام ارشادات اور اس کے تمام اعمال کی طرف سے کان اور آنکھیں بند کر لیتے۔

اس زمانہ میں فوٹوگرافی کے آلات نہ تھے کہ آنحضرت کی تمام حرکات و سکنات کے فلم لے لئے جاتے نہ آواز بھرنے کے آلات تھے کہ آپ کی تقریروں کے ریکارڈ بھر کر رکھ لئے جاتے نہ مکہ و مدینہ سے اخبارات نکلتے تھے کہ روزانہ آپ کی تبلیغی سرگرمیوں اور آپ کے اعمال حیات کی رپورٹیں شایع ہوتیں۔ ضبط اور نقل کا ذریعہ جو کچھ بھی تھا وہ لوگوں کا حافظہ اور زبانیں تھیں قدیم زمانہ میں نہ صرف عرب بلکہ تمام قوموں کے پاس واقعات کو محفوظ رکھنے اور بعد کی نسلوں تک پہونچانے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ مگر عرب خصوصیت کے ساتھ اپنے حافظہ اور صحت نقل میں ممتاز تھے اور ان کی یہ خصوصیت ایسی تھی کہ شاید خون کر کے بھی کوئی اس سے انکار نہ ہو۔ جو قوم ایام العرب کلام جاہلیت انساب قبائل حتیٰ کہ اونٹوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد کرتی ہو اور اپنی اولاد کو یاد کراتی ہو اس سے بعید تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کے ارشادات کو یاد نہ رکھتی اور آنے والی نسلوں تک انہیں منتقل نہ کرتی۔

پھر جب آنحضرت صلعم کا وصال ہوا تو فطری بات تھی کہ لوگوں میں آپ کے احوال و اقوال کی جستجو اور زیادہ بڑھ جاتی۔ جو لوگ حضور کی زیارت اور صحبت سے محروم رہ گئے تھے ان میں یہ شوق پیدا ہونا بالکل فطری امر تھا کہ آپ کے صحبت یافتہ بزرگوں سے آپ کے ارشادات اور آپ کے حالات پوچھیں۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی پیر مرد ایسا نکل آتا ہے جس نے پچھلی صدی کے اکابر میں سے کسی بڑے نامور شخص کی صحبت پائی ہو تو لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور اس کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے شمالی ہندوستان سے حیدرآباد دکا سفر صرف اس غرض کے لئے کیا کہ اگر یہاں کوئی پرانا آدمی ایسا مل جائے جس نے سید جمال الدین افغانی کی صحبت پائی ہو تو اس سے سید صاحب کے حالات معلوم کریں۔ یہ معاملہ جب معمولی انسانوں کے ساتھ پیش آتا ہے تو کیا یہ ممکن تھا کہ خدا کے سب سے بڑے پیغمبر اور دنیا کے سب سے بڑے مسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں میں اس کے حالات پوچھنے اس کے ارشادات سے مستفید ہونے کی خواہش

نہ ہوتی؟ کیا تاریخ کے ان واقعات میں کوئی استبعاد ہے کہ لوگ جہاں کسی صحابی کی خبر پا لیتے وہاں سینکڑوں میل سے سفر کر کے جاتے اور آنحضرت صلعم کے حالات پوچھتے یہی معاملہ یقیناً صحابہ کے بعد تابعین کے ساتھ اور تابعین کے بعد تبع تابعین کے ساتھ پیش آیا ہوگا۔ کم از کم دو صدی تک سماعتِ حدیث اور نقل حدیث کا غیر معمولی شغف مسلمانوں میں پایا جانا یقینی ہے اور یہ بات نہ صرف قیاس کے عین مطابق ہے بلکہ تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے۔ منکرین حدیث قیاس عقلی سے تو کام ہی نہیں لیتے۔ رہی تاریخ تو وہ اس کے صرف اسی حصے کو مانتے ہیں جس سے ان کے مسلک کی تائید نکلتی ہو۔ اس کے سوا تاریخ کی جتنی شہادتیں ہیں سب ان کے نزدیک نامعتبر ہیں لیکن جن لوگوں میں انکار حدیث کے لئے ضد پیدا نہیں ہوئی ہے وہ یقیناً یہ بات تسلیم کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست شخصیت اور آپ کی تابناک پیغمبرانہ زندگی اتنی ناقابل اعتنا تو نہ تھی کہ مسلمانوں میں کم از کم دو سو برس تک بھی آپ کے حالات معلوم کرنے اور آپ کے ارشادات سننے کا عام شوق نہ رہتا۔ اس سے انکار کرنے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرون اولیٰ کے لوگوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اثر نہ تھا، اور وہ لوگ بھی آپ کی جانب کوئی توجہ نہ رکھتے تھے جو آپ کی رسالت کے قائل ہو چکے تھے۔ منکرین حدیث کو اختیار ہے کہ رسول اللہ کی ذات اور ان لوگوں کے متعلق جو آپ سے قریب تر تھے، یہ یا اس سے بھی زیادہ بری کوئی رائے قائم کریں، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی مسلمان تو کجا، اسلامی تاریخ اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے والا کوئی منصف مزاج غیر مسلم بھی اس رائے کو صحیح باور نہ کریگا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ عہد رسالت سے دور ہونے کے بعد مسلمانوں میں بیرونی اثرات بھی داخل ہونے لگے تھے اور یہ اثرات بیشتر وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے جنہوں نے عراق، ایران، شام اور مصر میں مذہب اسلام قبول کر لیا تھا، مگر قدیم مذاہب کے خیلات ان کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا تھا جو اپنے دل سے گھڑ کر باتیں نکالتا تھا اور محض لوگوں پر اثر قائم کرنے کے لئے ان باتوں کو

رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ یہ دونوں باتیں تاریخ سے بھی ثابت ہیں، اور قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہوگا۔ مگر کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں سب کے سب ایسے ہی لوگ تھے؟ سب جھوٹے اور بے ایمان تھے؟ سب ایسے منافق تھے کہ اسی ہستی پر بہتان گھڑتے جس کی رسالت پر وہ دن بھر میں کم از کم پانچ مرتبہ گواہی دیا کرتے تھے؟ سب ایسے دشمن دین تھے کہ دنیا بھر کی خرافات لے کر رسول اللہ کے نام سے دین میں داخل کرتے اور اس کی جڑیں کاٹتے؟ یہ نتیجہ نہ عقلاً نکالا جا سکتا ہے اور نہ تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور جب یہ صحیح نہیں ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ پہلی صدی کے آخر سے حدیث کے ذخیرے میں ایک حصہ ایسی روایات کا بھی داخل ہونے لگا تھا جو موضوع اور بعد کی نسلوں کو جو احادیث پہنچیں ان میں صحیح اور غلط اور مشکوک سب قسم کی حدیثیں ملی جلی تھیں۔

کھرے اور کھوٹے کی اس آمیزش کے بعد صحیح طریق کار کیا تھا؟ کیا یہ صحیح ہو سکتا تھا کہ آمیزش کی بنا پر صحیح اور غلط سب کو ایک ساتھ رد کر دیا جاتا، اور بعد کے مسلمان رسالت سے اپنا تعلق یکسر منقطع کر لیتے؟ منکرین حدیث اس کو ایک آسان بات سمجھتے ہیں۔ مگر جو قرآن پر ایمان رکھنے والے رسول اللہ کی ذات کو اسوہ حسنہ سمجھتے تھے اور جن کے نزدیک حضور کی پیروی کے بغیر ہدایت کا میسر ہونا ناممکن تھا، ان کے لئے ایسا کرنا بہت دشوار تھا، اتنا دشوار جتنا کسی کے لئے برضا و رغبت آگ میں کود پڑنا ہو سکتا ہے انہوں نے سب کو رد کر دینے کی بہ نسبت پہاڑ کھود کر جو اہر نکالنے کی مشقت کو زیادہ آسان سمجھا۔ رسالت سے اپنا اور مسلمانوں کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے شب و روز محنتیں کیں، حدیثوں کو جانچنے اور پرکھنے کے اصول بنائے، کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کیا، ایک طرف اصول روایت کے اعتبار سے حدیثوں کی تنقیح کی، دوسری طرف ہزاروں لاکھوں راویوں کے احوال کی جانچ پڑتال کی، تیسری طرف درایت کے اعتبار سے حدیثوں پر نقد کیا، اور اس طرح سنت رسول کے متعلق ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا جس کے برابر مستند اور معتبر ذخیرہ آج دنیا میں گذشتہ زمانے کے کسی شخص اور کسی عہد کے متعلق موجود نہیں ہے۔ منکرین حدیث کو

آزادی ہے کہ ان کی ساری محنتوں پر بیک جنبشِ قلم پانی پھیر دیں۔ منکرینِ حدیث کو اختیار ہے کہ دین کے ان سچے خادموں کو وضاعِ حدیث، پروردۂ عجم، آلۂ کار بایانِ بنی امیہ و بنی عباس اور جو کچھ چاہیں کہیں لیکن حق یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان محدثین کا اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ قیامت تک اس کے بار سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ یہ انہی عاشقانِ رسول کی محنتوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس رسولِ اکرمؐ اور صحابۂ کرامؓ کے عہد کی پوری تاریخ اپنی جزئیات کے ساتھ موجود ہے، اور وہ وسائل بھی ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ہم حدیث کے ذخیرہ کی جانچ پڑتال کر کے آج بھی واقعات کی صحیح صحیح تحقیق کر سکتے ہیں۔ یہ وہ ذخیرہ ہے جس پر مسلمان تمام دنیا کی قوموں کے مقابلے میں اگر فخر کریں تو بجا ہوگا۔

منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ بجز متواتر روایات کے جو بہت کم ہیں، باقی جتنی احادیث ہیں، یقینی نہیں ہیں۔ ان سے علمِ یقین حاصل نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے۔ پھر ایسی ظنی چیزوں پر مذہب کا مدار رکھنا کیا معنی؟ ہم کہتے ہیں کہ مشاہدۂ عینی اور تجربۂ حسی کے سوا دنیا میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو مفیدِ یقین ہو سکتا ہو۔ تواتر کو بھی محض اس قیاس کی بنا پر یقینی سمجھا جاتا ہے کہ بہت سے آدمیوں کا جھوٹ پر متفق ہو جانا مستبعد ہے لیکن خبرِ متواتر کے لئے جو شرائط ہیں وہ بہت کم ایسی خبروں میں پائی جاتی ہیں جن پر تواتر کا گمان ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر امورِ غیب میں خواہ وہ زمانۂ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں یا حال سے، ہمارے علم اور ہمارے فیصلوں کا مدار اسی ظنِ غالب پر ہے جو کم از کم دو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خود قرآن نے اس ظنی شہادت کو اتنا معتبر قرار دیا ہے کہ اس کی بنا پر ایک مسلمان کا خون مباح ہو سکتا ہے، درآں حالیکہ مسلمان کا خون اتنا محترم ہے کہ جو کوئی مسلمان کو عمداً قتل کر دے اسے خلود فی النار کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح زنا، قذف اور سرقہ کی حدود میں بھی ایسے اہم فیصلوں کا مدار صرف دو یا چار شہادتوں پر رکھا گیا ہے جن سے ایک مسلمان کا ہاتھ کاٹ دیا جا سکتا ہے،

یا ایک مسلمان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے ہیں۔ پس جب قرآن مجید میں غیر متواتر شہادتوں ہی پر پورے نظام عدل کی بنیاد رکھی گئی ہے تو قرآن کے مقابلہ میں کس مسلمان کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ کسی حدیث کو حدیث رسول مان لینے کے لئے ہر مرتبۂ اسناد میں دو یا چار راویوں کا ہونا کافی نہیں ہے؟ البتہ راویوں میں ہم ہر راوی پر اعتبار نہ کریں گے جس طرح شاہدوں میں سے ہر شاہد پر اعتبار نہیں کرتے ہم حکم قرآن کے بموجب "ذَوَا عَدْلٍ" کی شرط لگاتے ہیں، اور اسی کی تحقیق کے لئے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا گیا ہے تاکہ راویوں کے حالات کی تحقیق کی جائے۔ اسی طرح ہم راویوں پر جرح بھی کریں گے کہ حدیث کے جوہری نکات میں ان کے درمیان ایسا اختلاف تو نہیں ہے جو ان کے بیان کی صحت کو مشکوک کر دیتا ہو؟ اسی طرح ہم درایت سے بھی کام لیں گے جیسے ایک قاضی مقدمات میں درایت سے کام لیتا ہے۔ مگر جس طرح شاہدوں کے بیانات کا جانچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اسی طرح درایت بھی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حدیث کو اصول درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصول اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو، اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہونچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی صحیح روح اس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں؟ یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں؟ پھر جس طرح ایک معاملہ میں دو قاضیوں کا اجتہاد مختلف ہوتا ہے، اور جس طرح قرآن مجید کے معانی میں دو فاضلوں کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں اسی طرح دو محدثوں کی درایت میں بھی اختلاف ممکن ہے۔ خدا نے ہمکو انسانی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا مکلف نہیں قرار دیا ہے۔ اختلاف رائے انسانی فطرت کا مقتضی ہے، اور اس کی وجہ سے نہ قرآن چھوڑا جا سکتا ہے، نہ حدیث، اور نہ عدالت کی

کرسی۔ پس ایک حدیث کے متعلق جس حد تک تحقیق انسان کے بس میں ہے، اس کا سامان محدثین نے فراہم کر دیا ہے۔ ہمارا کام اس سامان سے فائدہ اٹھا کر صحیح کو غلط سے ممتاز کرنا اور صحیح کا اتباع کرنا ہے، نہ یہ کہ صحیح و غلط کے اختلاط کو دیکھ کر سرے سے رسالت ہی سے قطع تعلق کر لینا۔

منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ہم حدیث کو صرف تاریخ کی حیثیت سے لیں گے، حجت شرعی نہ بنائینگے مگر کیا ان حضرات نے رسولؐ کی تاریخ کو سکندر اور نپولین کی تاریخ سمجھا ہے کہ اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو؟ کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ اس انسان کی تاریخ ہے جس کا اتباع فرض ہے جس کی اطاعت پر نجات کا مدار ہے، جس کی سیرت مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے؟ اس ذات پاک کی تاریخ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا صحیح ہوگی یا غلط۔ اگر غلط ہے تو اس کو لینا کیا معنی نذر آتش کر دیجئے؟ رسول پر بہتان اور آپ اس کو تاریخ کی حیثیت سے قبول کریں؟ اور اگر وہ صحیح ہے تو اس کا اتباع فرض ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے اس کی پیروی سے آپ بچ کہاں سکتے ہیں؟ (باقی)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اگر ایک ہی شے کو ایک شخص سیاہ کہے، دوسرا سپید، تیسرا زرد اور چوتھا سرخ، تو ممکن نہیں ہے کہ یہ چاروں معاً سچے ہوں۔ اگر ایک ہی فعل کو ایک برا کہتا ہے اور دوسرا اچھا، ایک اس سے منع کرتا ہے اور دوسرا اس کا حکم دیتا ہے، تو کسی طرح ممکن نہیں کہ دونوں کی رائے صحیح ہو، دونوں برحق ہوں اور دونوں امر و نہی کا کھلا ہوا اختلاف رکھنے کے باوجود اپنے حکم میں درست ہوں۔ جو شخص ایسے متضاد اقوال کی تصدیق کرتا ہے، اور ایسے متضاد احکام کو برحق قرار دیتا ہے، اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو وہ سب کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ یا اس نے اس مسئلہ پر سرے سے غور ہی نہیں کیا، اور بے سمجھے بوجھے اسے ظاہر کردی۔ بہرحال دونوں صورتیں عقل اور صداقت کے خلاف ہیں، اور کسی دانشمند اور حق پسند انسان کے لئے یہ زیبا نہیں کہ ان میں سے کسی وجہ سے بھی مختلف الخیال لوگوں کی تصدیق کرے۔

عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دس مختلف خیالات رکھنے والے آدمیوں کے مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دینا "رواداری" ہے۔ حالانکہ یہ دراصل رواداری نہیں عین منافقت ہے۔ رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کرکے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور انہیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لئے جبر و اکراہ کا طریقہ نہ اختیار کریں۔ اس قسم کا تحمل اور اس طریقہ سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا، نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے

کے لئے ضروری بھی ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں، اور خود ایک دستور العمل کے پیرو ہوتے ہوئے، دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں، تو اس منافقانہ اظہار رائے کو کسی طرح بھی رواداری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مصلحۃً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔

صحیح رواداری وہ ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو دی ہے۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۶: ۱۰۸)

یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو، کیونکہ اس کے جواب میں نادانی کے ساتھ ناحق یہ خدا کو گالیاں دیں گے۔ ہم نے تو اسی طرح ہر قوم کے لئے اس کے اپنے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے پھر ان سب کو اپنے پروردگار کی طرف واپس جانا ہے وہاں ان کا پروردگار انہیں بتا دے گا کہ انہوں نے کیسے عمل کئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵: ۷۲)

خدا کے نیک بندے وہ ہیں جو جھوٹ پر گواہی نہیں دیتے اور جب کسی نامناسب فعل کے پاس سے گذرتے ہیں تو خودداری کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ۔ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ

اے محمد ان سے کہو کہ اے گروہ کفار! نہ میں ان معبودوں کو پوجتا ہوں جن کو تم پوجتے ہو اور نہ تم اس معبود کے پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ اور آئندہ بھی نہ میں

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۱۰۹) ان معبودوں کو پوجنے والا ہوں جن کو تم نے پوجا ہے، اور نہ تم اس معبود کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲:۲۴۳) دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۶:۲۸) وہ بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی نامناسب بات سنتے ہیں تو اس سے درگذر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم کو سلام ہے ہم جاہلوں سے کچھ غرض نہیں رکھتے

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔ (۲:۴۲) پس تم ان کو حق کی طرف دعوت دو اور حق پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر میں ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت نہیں۔ اللہ ہم سب کو قیامت میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف واپس جانا ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (۱۶:۱۲) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے مباحثہ کرو۔

یہی وہ رواداری ہے جو ایک حق پرست صداقت پسند اور سلیم الطبع انسان اختیار کرسکتا ہے۔ وہ جس مسلک کو صحیح سمجھتا ہے اس پر سختی کے ساتھ قائم رہے گا، اپنے عقیدہ کا صاف صاف اظہار و اعلان کریگا، دوسروں کو اس عقیدہ کی طرف دعوت بھی دے گا، مگر کسی کی دل آزاری نہ کرے گا، کسی سے بدکلامی نہ کرے گا، کسی کے مسلک سے تعرض نہ کریگا، کسی کے معتقدات پر حملے نہ کرے گا، کسی کی عبادات اور اعمال میں مزاحمت نہ کریگا، کسی کو زبردستی اپنے مسلک پر لانے کی کوشش نہ کریگا۔ باقی رہا حق کو حق جانتے ہوئے حق نہ کہنا، یا باطل کو باطل سمجھتے ہوئے حق کہدینا، تو یہ ہرگز کسی سچے انسان کا فعل نہیں ہو سکتا، اور خصوصاً لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کرنا تو نہایت مکروہ قسم کی خوشامد ہے۔ ایسی خوشامد نہ صرف اخلاقی حیثیت سے ذلیل ہے، بلکہ اس مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوتی جس کے لئے انسان اپنے آپ کو اس پست منزل تک گراتا ہے۔ قرآن کا صاف اور سچا فیصلہ ہے کہ:-

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ	یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تو
حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ	ان کی ملت کا پیرو نہ بن جائے گا صاف کہدے کہ اللہ کا راستہ
هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم	ہی سیدھا راستہ ہے۔ ورنہ اگر تو نے اس علم کے بعد جو تیرے
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ	پاس آیا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو کوئی
مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۲: ۱۴)	حامی و مددگار تجھ کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا۔

جھوٹی رواداری کا اظہار تو خیر سیاسی اغراض کے لئے کیا جاتا ہے، اور اس دور میں یہ جائز ہے، کیونکہ مغربی ارباب سیاست کی کوششوں سے، مدت ہوئی کہ اخلاق اور سیاست کے درمیان مفارقت کرادی گئی ہے، لیکن افسوس کے قابل ان "محققین" کا حال ہے، جو عقل کو سوچنے، اور فکر کو حرکت کرنے کی زحمت دیے بغیر اپنی مذہبی تحقیقات کا یہ عجیب نتیجہ ظاہر فرمایا کرتے ہیں کہ "تمام مذاہب برحق ہیں"۔ یہ جملہ اکثر ان لوگوں کی

بان سے سنا جاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ہم کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے اور نہ تسلیم کرتے ہیں جب تک کہ اس کو میزان عقل میں تول نہ لیں لیکن میزان عقل کا حال یہ ہے کہ وہ ان کی اس تحقیق انیق کو پرکاہ کے برابر بھی وزن دینے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ جن مذاہب کو مطابق حق ہونے کی سند عطا کی جاتی ہے ان کے اصول میں سیاہ اور سپید کا کھلا ہوا تخالف موجود ہے۔ ایک کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ دوسرا کہتا ہے دو ہیں، چوتھا کہتا ہے بہت سی ہستیں خدائی میں شریک ہیں، پانچویں کی تعلیم میں سرے سے خدا کا تصور ہی موجود نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پانچوں صحیح ہوں؟ ایک انسان کو خدائی کے مقام میں لے جاتا ہے، دوسرا خدا کو کھینچ کر انسانوں کے بیچ میں اتار لاتا ہے، تیسرا انسان کو عبد اور خدا کو معبود قرار دیتا ہے، چوتھا عبد اور معبود دونوں کے تخیل سے خالی ہے۔ کیا صداقت میں ان چاروں کے لئے اجتماع کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ ایک نجات کو صرف عمل پر موقوف رکھتا ہے، دوسرا نجات کے لئے صرف ایمان کو کافی سمجھتا ہے، تیسرا ایمان اور عمل دونوں کو نجات کے لئے شرط قرار دیتا ہے، کیا یہ تینوں بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں؟ ایک نجات کی راہ دنیا اور اس کی زندگی سے باہر نکالتا ہے۔ دوسرے کے نزدیک نجات کا راستہ دنیا اور اس کی زندگی کے اندر سے گذرتا ہے۔ کیا یہ دونوں راستے یکساں درست ہو سکتے ہیں؟ ایسے متضاد امور کو صداقت کی سند عطا کرنے والی شے کا نام اگر عقل ہے، تو پھر جمع بین متضادین کو ناجائز قرار دینے والی شے کا نام کچھ اور ہونا چاہئے۔

مذاہب میں جو تصورات متضاد نظر آتے ہیں، افسوس کہ سطحی نظر رکھنے والے ان کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے، اور محض سطح پر نگاہ ڈال کر چند غلط مقدمات کو غلط طریقے سے ترتیب دے کر غلط نتائج نکال لیتے ہیں حالانکہ دراصل یہ اشتراک ایک اہم حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ وہ پتہ دیتا ہے کہ درحقیقت تمام مذاہب ایک ہی اصل سے نکلے ہیں، ان تمام تصورات اور تعلیمات کا مبدأ ایک ہے۔ کوئی ایک ذریعہ ہے جس نے انسان کو مختلف ممالک اور مختلف زمانوں میں، ان مشترک صداقتوں سے روشناس کیا

کوئی ایک بصیرت ہے جو مشرق و مغرب کا بعد رکھنے والے اور سینکڑوں ہزاروں برس کا فصل رکھنے والے لوگوں کو حاصل ہوئی، اور اس بصیرت سے وہ سب کے سب ایک ہی قسم کے نتائج تک پہنچے لیکن مذاہب اپنی اصل اور اپنے مبدأ سے دور ہو گئے تو ان میں کچھ خارجی تصورات، اور اجنبی معتقدات و تعلیمات نے راہ پائی، اور چونکہ یہ بعد والی چیزیں اس مشترک مبدأ، اور مشترک بصیرت سے ماخوذ نہ تھیں، بلکہ مختلف طبائع، مختلف رجحانات، اور مختلف علمی و عقلی مراتب رکھنے والے انسانوں کی طبعزاد تھیں، اس لئے انہوں نے ان مشترک بنیادوں پر جو عمارتیں تعمیر کیں وہ اپنے نقشوں اور اپنی وضع و ہیئت میں بالکل ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

پس حق اور صدق کا حکم اگر لگایا جا سکتا ہے تو اس اصل مشترک پر لگایا جا سکتا ہے جو تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے، نہ کہ ان مختلف تفصیلی صورتوں اور ہیئتوں پر جن میں موجودہ مذاہب پائے جاتے ہیں کیونکہ حق ایک جنس بسیط ہے۔ اس کے افراد میں اختلاف نہیں ہو سکتا جس طرح ہم سیاہ اور سپید، سرخ اور سبز پر لفظ "رنگ" کا اطلاق یکسانی کے ساتھ کرتے ہیں، اُس طرح خدا ایک ہے، اور خدا دو ہیں، اور خدا کروڑوں ہیں کے مختلف احکام پر لفظ "حق" کا اطلاق نہیں کر سکتے۔

یہ بات کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے، اور "ایک ہی" صداقت ہے جو مختلف قوموں پر مختلف زمانوں میں ظاہر کی گئی قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کتاب میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہر قوم میں خدا کے رسول اور پیغامبر آئے ہیں۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا (۱۶: ۵) وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۳۵: ۲) یہ تمام انبیاء اور رسل ایک ہی سرچشمے سے صداقت کا پیغام حاصل کرتے تھے۔ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۳: ۱۹) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ (۵۷: ۳) ان سب کا پیغام ایک ہی تھا، اور

اور وہ یہ تھا کہ:-

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶ : ۵) خدا کی پرستش کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو۔

سب پر خدا کی طرف سے ایک ہی وحی آئی تھی:-

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (۲۱ : ۲) اے محمدؐ تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔

ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ ہماری اپنی عقل و فکر کا نتیجہ ہے بلکہ سب یہی کہتے رہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے:-

وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا۔ (۱۴ : ۲) ہم یہ قدرت نہیں رکھتے کہ خدا کے اذن کے بغیر کوئی حجت لاسکیں جو ایمان لانے والے ہیں وہ تو خدا ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ رکھیں جبکہ اسی نے ہم کو ہدایت بخشی ہے۔

پھر ان میں سے کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم ہماری بندگی کرو، بلکہ سب یہی کہتے رہے کہ خدا پرست بن جاؤ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (۳ : ۸) کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ جب اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو یہی کہیگا کہ خدا پرست بنو۔

یہی وہ مشترک تعلیم جو تمام قوموں کو ان کے مذہبی رہنماؤں نے دی تھی۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ اول اول تمام انسان ایک ہی امت تھے، اور ایک ہی دین کے

پیرو تھے، پھر انہوں نے اپنے الگ الگ مذہب نکال لئے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے، اور یہ تفرقہ اس وقت ہوا جب کہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ پھر اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء کتابیں اور کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ مگر اختلاف دور نہ ہوا۔ صرف ایک گروہ جو انبیاء پر ایمان لایا اور ان کی تعلیم پر قائم رہا، اس نے ہدایت پائی، اور باقی سب مختلف گروہ گمراہی میں مبتلا ہوگئے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰: ۲)

لوگ دراصل ایک ہی امت تھے۔ پھر مختلف ہوگئے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۲: ۲۶)

لوگ پہلے ایک ہی امت تھے۔ (پھر ان میں اختلاف ہوا) پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے اور متنبہ کرنے والے تھے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان اس امر میں فیصلہ کرے جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور یہ اختلاف ان لوگوں نے آپس کی ضد سے کیا تھا جن کے پاس پہلے کتاب آچکی تھی اور کھلی کھلی دلیلیں دی جاچکی تھیں۔ پھر جو لوگ ایمان لائے ان کو اللہ نے اس حق کی راہ دکھا دی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت بخشتا ہے۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ "اسلام" وہی اصل دین ہے جس کو ابتداء سے تمام قوموں میں تمام انبیاء پیش کرتے رہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا پیغام لے کر نہیں آئے تھے جو پہلے کبھی نہ پیش کیا گیا ہو۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ (۴۶ : ۱) بلکہ آپ کا پیغام وہی ہے جو ہر نبی نے ہر قوم تک ہر زمانے میں پہونچایا ہے۔ اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (۴: ۲

اس پیغام سے عرب، مصر، ایران، ہندوستان، چین، جاپان، امریکہ، یورپ، افریقہ، غرض کوئی سرزمین محروم نہیں رکھی گئی۔ سب جگہ اللہ کے رسول اللہ کی کتابیں لے کر آئے ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ بودھ، کرشن، رام، کنفیوشس، زردشت، مانی، سقراط، فیثاغورس وغیرہم انہی رسولوں میں سے ہوں لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان میں فرق یہ ہے کہ ان کی اصل تعلیمات لوگوں کے اختلافات میں گم ہو گئیں اور آنحضرت نے جو کچھ پیش فرمایا وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔

پس حقیقت یہ ہے کہ "اسلام" مذاہب میں سے ایک مذہب نہیں ہے، بلکہ نوع انسانی کا اصل مذہب یہی ہے، اور باقی مذاہب اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ مذاہب میں جو کچھ "حق" اور "صدق" پایا جاتا ہے وہ اسی اصل "اسلام" کے بچے کھچے اثرات ہیں جو اختلافات کے باوجود باقی رہ گئے ہیں، اور جس مذہب میں اس باقی ماندہ حق کی مقدار جتنی زیادہ ہے، اس میں اتنا ہی زیادہ "اسلام" موجود ہے۔ رہے وہ اختلافات جو اصل "اسلام" کے خلاف ہیں، تو وہ سب یقیناً باطل ہیں، اور ان پر "حق" کا حکم لگانا صریح ظلم ہے۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی

(۱۳)

ایمان

۴۔ ایمان بالکتب

اسلام کی اصطلاح میں "کتاب" سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کتاب گویا اسی پیغام کا سرکاری بیان (Official VERSION) یا اسلامی اصطلاح کے مطابق "آلہی کلام" ہے، جسے لوگوں تک پہنچانے، اور جس کی توضیح و تشریح کرنے، اور جس کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے پیغمبر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ "کتاب" کس معنی میں اللہ کا کلام ہے، اور اس کے کلام اللہ ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ خاص الٰہیات کی بحث ہے جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم کو اس پر صرف اس پہلو سے نظر ڈالنی ہے کہ تہذیب اسلامی کی تاسیس میں ایمان بالکتب کا کیا حصہ ہے؟ اور اس کے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ پیغمبر کے ذریعہ سے جو تعلیم بندوں کو دینی مقصود ہے اس کے اصول اور امہات مسائل، خاص خدا کی طرف سے پیغمبر کے دل پر القا ہوتے ہیں، اس کے الفاظ اور معانی دونوں میں پیغمبر کی اپنی عقل و فکر، اس کے ارادے، اور اس کی خواہش کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا، اس لئے وہ لفظاً اور معنیً خدا کا کلام ہوتا ہے نہ کہ پیغمبر کی تصنیف۔ پیغمبر اس کلام کو ایک امانت دار قاصد کی حیثیت سے خدا کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر خدا کی عطا کی ہوئی بصیرت سے اس کے معانی اور مطالب کی تشریح کرتا ہے، انہی آلہی اصولوں پر اخلاق، معاشرت، تہذیب اور تمدن کا نظام قائم کرتا ہے، اپنی تعلیم و تلقین اور اپنی پاکیزہ سیرت سے لوگوں

کے خیالات، رجحانات اور افکار میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے، تقویٰ وطہارت، پاکیزگی نفس اور حسن عمل کی روح ان میں پھونکتا ہے، جو صداقت پسند اور حق پرست لوگ اس کی پیروی اختیار کرتے ہیں، ان کو وہ اپنی تربیت اور عملی رہنمائی میں اس طور پر منظم کرتا ہے کہ ان سے ایک نئی سوسائٹی نئی ذہنیت، نئے افکار و خیالات، نئے آداب و اطوار، اور نئے آئین و قوانین کے ساتھ وجود میں آتی ہے پھر وہ ان میں اللہ کی کتاب اور اس کے ساتھ اپنی تعلیم، اور اپنی پاکیزہ سیرت کے آثار چھوڑ جاتا ہے جو ہمیشہ اس جماعت اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

رسالت اور کتاب کا تعلق "رسالت" اور "کتاب" دونوں اسی ایک خدا کی طرف سے ہیں دونوں ایک ہی امر ربانی کے اجزاء، اور ایک ہی مقصد، اور ایک ہی دعوت کی تکمیل کے ذریعے ہیں۔ وہی اللہ کا علم اور اس کی حکمت رسول کے سینے میں بھی ہے اور کتاب کے اوراق میں بھی۔ جس تعلیم کا لفظی بیان "کتاب" ہے اسی کا عملی نمونہ رسول کی زندگی ہے۔

انسان کی فطرت کچھ اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ وہ مجرد کتابی تعلیم سے کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کو علم کے ساتھ ایک انسانی معلم اور رہنما کی بھی حاجت ہوتی ہے جو اپنی تعلیم سے اس علم کو دلوں میں بٹھا دے، اور اس کا مجسمہ بن کر اپنے عمل سے لوگوں میں وہ روح پھونک دے جو اس تعلیم کا حقیقی منشا ہے۔ آپ کو پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی نہ مل سکیگی کہ تنہا کسی کتاب نے، انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں انقلاب پیدا کیا ہو۔ جن رہنماؤں نے قوموں کے افکار و اعمال میں زبردست انقلابات پیدا کئے ہیں، اگر وہ خود اپنی تعلیم کے مکمل عملی نمونے بن کر نہ پیدا ہوتے، اور صرف ان کی تعلیمات اور ان کے اصول کسی کتاب کی شکل میں شائع ہو جاتے تو انسانی فطرت کا کوئی رازداں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ محض اس کتاب سے وہی انقلابات رونما ہوتے جو ان رہنماؤں کی عملی تعلیم سے ہوئے۔

دوسری طرف یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ انسانی رہنما کے ساتھ اس کی تعلیم کا ایک مستند اور معتبر بیان بھی چاہتی ہے، خواہ وہ کاغذ پر لکھا ہوا ہو، یا سینوں میں محفوظ ہو۔ رہنما جن اصولوں پر جماعت کے افکار و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنا رکھتا ہے، وہ اگر اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ رہیں تو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم کا نقش دھندلا ہوتا جاتا ہے، اور اس نقش کے مٹنے کے ساتھ انفرادی سیرت اور اجتماعی نظم و آئین کی بنیادیں بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ آخر میں اس جماعت کے پاس صرف افسانے ہی افسانے رہ جاتے ہیں، جن میں ایک طاقتور نظام تمدن کو سنبھالنے کی قوت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن رہنماؤں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی ان کے متبعین گمراہی میں پڑ گئے، ان کی بنائی ہوئی امت ہر قسم کے اعتقادی، فکری، عملی، اخلاقی اور تمدنی مفاسد میں مبتلا ہو گئی، اور کوئی ایسی چیز ان کے پیچھے باقی نہیں رہی، جس سے وہ صحیح اور اصلی اصول اخذ کئے جا سکیں جن پر ابتداً اس امت کی شیرازہ بندی کی گئی تھی۔

فاطر کائنات اپنی مخلوق کی اس فطرت سے واقف تھا، اس لئے اس نے جب نوع بشری کی ہدایت کا ذمہ لیا، تو اس کے لئے رسالت اور تنزیل دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری کیا۔ ایک طرف بہترین سیرت رکھنے والے انسانوں کو رہنمائی کے منصب پر مقرر کیا اور دوسری طرف اپنا کلام بھی نازل کیا، تاکہ یہ دونوں چیزیں انسانی فطرت کے ان دونوں مطالبوں کو پورا کر دیں۔ اگر رہنما کتاب کے بغیر آتے، یا کتابیں رہنماؤں کے بغیر آتیں تو حکمت کا مقصود پورا نہ ہو سکتا۔

چراغ اور رہنما کی قرآنی مثال رسالت اور کتاب کے اس تعلق کو قرآن مجید ایک تمثیلی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس نے جگہ جگہ رسول کو رہنما اور بدرقہ سے تشبیہ دی ہے جس کا کام گمراہوں کو سیدھا رستہ بتانا ہے، مثلاً وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (۲۱: ۵)، وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳: ۷)، فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (۱۹: ۴۳)، وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۷۹: ۱۹)

دوسری طرف وہ کتاب کو "نور" اور "ضیاء" اور "برہان" اور "فرقان" اور "منیر" اور "مبین" کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً: وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ (۷: ۱۹) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً (۲۱: ۴) قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ (۵: ۳) قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ (۴: ۲۴) یہ تشبیہات محض شاعری نہیں ہیں، بلکہ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ معمولی انسان کو فطری عقل اور اکتسابی علم سے اتنی روشنی اور رہنمائی حاصل نہیں ہوتی جس سے وہ حق کی سیدھی راہ پر چل سکے۔ اس اجنبی اور اندھیری منزل میں اس کو ایک ایسے غیر معمولی رہنما کی ضرورت ہے جو اس منزل کی رسم و راہ سے واقف ہو، اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک چراغ بھی ہو، تاکہ وہ اسے لئے ہوئے قدم قدم پر بتاتا چلے کہ یہاں گڑھا ہے، یہاں قدم پھسلتا ہے، یہاں کانٹے اور جھاڑیاں ہیں، یہاں سے دوسرے ٹیڑھے اور غلط راستے نکلتے ہیں اور اس کے پیچھے چلنے والا انسان خود بھی اس چراغ کی روشنی میں راہ کے نشانات کو دیکھ کر سیدھی راہ کی علامات کو پہچان کر ٹیڑھے راستوں کے موڑوں اور ٹکڑوں سے واقف ہو کر علیٰ وجہ البصیرت اس کا اقتدا کرے۔ رات کے اندھیرے میں رہنما اور چراغ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہی تعلق رسول اور کتاب میں بھی ہے۔ اگر ہم رہنما کے ہاتھ سے چراغ چھین لیں اور خود اس کو لے کر چلنے لگیں تو راستے میں ہم کو بہت سے ایسے ترچھے جو راہے اور متشابہ راستے ملیں گے جہاں ہم کو یا تو حیران و پریشان ہو کر ٹھیر جانا ہوگا، یا ہم اس چراغ کی روشنی میں کسی غلط راستے پر چلنے لگیں گے، کیونکہ محض چراغ کا وجود انسان کو رہنما سے بے نیاز نہیں کرتا۔[۱]

---

[۱] آیہ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ (۲: ۳) میں منجملہ اور باتوں کے ایک اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے۔ انسان کو زمین پر اتارتے وقت فرمایا گیا تھا کہ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۲۰: ۷) اس لئے جو لوگ خدا کے بھیجے ہوئے ہادی کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر، اور اس تعلق کو جو خدا نے رسالت اور کتاب کے درمیان قائم کیا ہے قطع کر کے کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ گمراہ ہو جاتے ہیں اور کتاب منیر باوجود منیر ہونے کے انکو سیدھا راستہ نہیں بتاتی

اسی طرح اگر رہنما کے ہاتھ میں چراغ نہ ہو تو ہم محض اندھے مقلد کی طرح اس کا دامن پکڑتے ہوئے چلیں گے اور روشنی کے بغیر ہم میں خود اتنی بصیرت پیدا نہ ہوگی کہ سیدھے راستے کو ٹیڑھے راستوں سے ممتاز کر کے دیکھ سکیں اور سیدھی راہ کے ان نازک مقامات کو بھی پہچان لیں جہاں انسان ٹھوکر کھاتا ہے یا اس کا قدم پھسل جاتا ہے۔ پس جس طرح ہم کو رات کی تاریکیوں میں اجنبی راہوں پر چلنے کے لئے ایک ایسے بدرقے کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس منزل کی رسم و راہ سے خوب واقف ہو اور ایک مشعل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی روشنی میں ہم اس راستے کو خوب پہچان سکیں، اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے، اسی طرح حقیقت کی اجنبی منزل میں جہاں ہماری عقل کی روشنی تنہا کام نہیں دیتی، ہم کو رسول اور کتاب دونوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے اور ان میں سے کسی کے اتباع کو چھوڑ کر ہم سیدھی راہ نہیں پا سکتے۔

رسول وہ ماہر بدرقہ ہے جو خدا کی دی ہوئی بصیرت سے ہدایت کی صراط مستقیم کو جانتا ہے اور اس منزل کی رسم و راہ سے ایسا واقف ہوتا ہے جیسا کسی راہ پر سینکڑوں مرتبہ چلا ہوا بدرقہ اس کے ہر ہر قدم کی تفصیلی کیفیات سے واقف ہوا کرتا ہے۔ اسی بصیرت کا نام "حکمۃ" اور "علم" اور "شرح صدر" اور "تعلیم الٰہی" و "ہدایت ربانی" ہے جسے خصوصیت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو عطا کئے جانے کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے مثلاً اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴: ۱) وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (۴: ۱۷) وَكُلًّا اٰتَيْنَهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۲۱: ۶) اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶: ۲) اور کتاب وہ روشن چراغ ہے جس کی مدد سے رسول اپنے پیروؤں کو نہ صرف سیدھی راہ چلاتا ہے بلکہ انہیں اسی نورِ علم اور روشنیٔ فکر اور عرفانِ حق سے بہرہ مند کر دیتا ہے جو ایک بالاتر درجے میں اللہ کی طرف سے خود اس کو عطا ہوا ہے، اور اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ اگر وہ اس کے نقش قدم پر چلیں اور اس چراغ کو ہاتھ میں رکھیں تو نہ صرف خود ہدایت پائیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی رہنما اور امام بن جائیں۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (۱۴:۱)	کتاب جس کو ہم نے تیری طرف اتارا تاکہ تو لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے۔
وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۶:۴۴)	اور ہم نے تجھ پر ذکر (قرآن) اتارا تاکہ تو لوگوں کے لیے اس ہدایت کو واضح کردے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔

پھر ایک بلیغ انداز میں قرآن نے یہ بھی بتادیا کہ مادی جسمانی عالم میں چراغ اور رہنما کے درمیان جو مغائرت ہے وہ عالم حقیقت میں رسول اور کتاب کے درمیان نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اتحادی رشتہ ہے چنانچہ بعض جگہ جس چیز سے کتاب کو تشبیہ دی گئی ہے اسی چیز سے کسی دوسری جگہ رسول کو بھی تشبیہ دی گئی ہے اور اسی طرح اس کے برعکس آیہ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيْرًا وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳:) میں رسول کو چراغ روشن کہا ہے اور آیہ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (۱۷:) میں کتاب کو رہنما کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور رسول کا تعلق حقیقۃً ناقابل انقطاع ہے ان کو ہدایت کیلئے دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔ اسلام جس فکری وعملی نظام اور جس تہذیب وتمدن کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے قیام واستحکام اور اس کے دائماً اپنی صحیح شکل میں رہنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہمیشہ رسالت اور کتاب دونوں کے ساتھ اس کا تعلق برقرار رہے اسی شدید ضرورت کی بنا پر رسالت اور کتاب دونوں کو الگ الگ مستقل اجزائے ایمان قرار دیا گیا، اور ہر ایک پر ایمان لانے کی بار بار تاکید کی گئی۔ اگر تاکید مقصود نہ ہوتی تو ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ رسول کی تصدیق اس کی لائی ہوئی کتاب کی تصدیق کو متضمن ہے اور کتاب کی تصدیق اس کے لانے والے کی تصدیق کو۔

تمام کتب آسمانی پر ایمان جہاں تک ایمان کا تعلق ہے، اسلام ان تمام کتابوں کو ماننے کا حکم

دیتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں۔ مسلمان ہونے کے لیے جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح تمام کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (۲:۱)۔	اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تیری طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں۔
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۲:۴۰)	رسول اور سب مومن ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر
نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ (۳:۱)	اللہ نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو تصدیق کرتی ہے ان تمام کتابوں کی جو اس کے آگے آچکی ہیں
قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۳:۹)	کہہ دے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہم پر اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتاری گئی تھیں اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دی گئی تھیں ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کو ماننے والے ہیں۔
اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ فِی	جن لوگوں نے اس کتاب اور ان کتابوں کو جھٹلایا جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا ان کو عنقریب اس کا انجام معلوم ہوجائے گا جب طوق و سلاسل

الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ (۴۰: ۸)۔ ان کی گردنوں میں پڑے ہوں گے اور وہ کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷: ۳) بہ تحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا تھا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری تھی، اور ترازو تاکہ لوگ حق پر قائم ہوں۔

اس اجمالی بیان کے ساتھ بعض کتابوں کے نام لے کر بھی ان پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ مثلاً توریت کو ہدایت، نور، فرقان، ضیاء، امام اور رحمت کہا گیا ہے (۲۸: ۵-۵: ۶-۲۱: ۴-۴۶: ۲) اور انجیل کو بھی ہدایت، نور اور موعظت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے (۵: ۴) پس یہ بات اسلام کے اصول میں سے ہے کہ جن کتابوں کا ذکر تصریح کے ساتھ قرآن میں کیا گیا ہے ان پر صراحتہً اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ان پر اجمالاً ایمان لایا جائے۔ اسلامی اعتقاد کے مطابق دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کے رسول، اس کی طرف سے کتابیں لے کر نہ آئے ہوں اور جتنی کتابیں دنیا کے مختلف خطوں مختلف قوموں میں آئی ہیں، وہ سب ایک ہی سرچشمے کی نہریں، ایک ہی آفتاب کی شعاعیں تھیں۔ سب اسی حق اور صداقت، اور ہدایت اور نور کے ساتھ آئی تھیں جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس لئے جو "مسلم" ہے وہ ان سب پر ایمان لاتا ہے، اور جو ان میں سے کسی کی تکذیب کرتا ہے وہ سب کی تکذیب اور درحقیقت اصل سرچشمے کی تکذیب کا مجرم ہے۔

صرف قرآن کا اتباع لیکن ایمان کے بعد جہاں سے بالفعل اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کے ساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں:

اوّلاً کتب آسمانی میں سے بہت سی کتابیں تو اب معدوم ہیں۔ اور جو پائی جاتی ہیں ان میں قرآن کے سوا کوئی کتاب اپنے اصل الفاظ اور معانی میں محفوظ نہیں ہے۔ کلام الٰہی کے ساتھ کلام انسانی لفظاً

اور معنیً دونوں طرح شریک ہوگیا ہے۔ ہدایت کے ساتھ گمراہی جو خواہشات نفسانی کے اتباع کا لازمی نتیجہ ہے ان کتابوں میں مل جل گئی ہے، اور اب یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ ان میں حق کس قدر ہے اور باطل کس قدر۔ یہی حال ان کتابوں کا بھی ہے جن پر مختلف ملتیں اپنے دین کا مدار رکھتی ہیں، اور جن کے آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں۔ جن میں منزل من اللہ ہونے کا تخیل ہی سرے سے موجود نہیں بعض کے متعلق یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ اگر وہ خدا کی طرف سے آئیں تو کن نبیوں کے پاس آئیں اور کس زمانے میں آئیں بعض کی زبانیں ایسی مردہ ہوچکی ہیں کہ آج ان کے صحیح معانی متعین کرنا مشکل ہے۔ بعض میں انسانی خواہشات، اور غلط تخیلات و اوھام کی صریح آمیزش معلوم ہوتی ہے بعض میں شرک، غیر اللہ کی پرستش، اور ایسے ہی دوسرے غلط عقاید اور اعمال کی صریح تعلیم موجود ہے جو کسی طرح حق نہیں ہوسکتی۔ ایسی کتابیں جن کا یہ حال ہو انسان کو صحیح علم اور صحیح روشنی نہیں دے سکتیں۔ انسان ان کا اتباع کرکے گمراہی سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً قرآن کے سوا جتنی کتابیں اس وقت موجود ہیں، عام اس سے کہ آسمانی ہوں یا ان کے متعلق آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہو، ان کی تعلیمات اور ان کے احکام میں یا تو محدود نسلی قومیت کا اثر نمایاں ہے، یا مخصوص زمانی حالات کا اقتضاء غالب۔ وہ ہر زمانے میں تمام نوع بشری کے لئے ہدایت و رہنمائی کا نہ کبھی ذریعہ بنی ہیں اور نہ بن سکتی ہیں۔

ثالثاً اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک میں ایسی تعلیمات موجود ہیں جو حق اور صدق ہیں، اور ان میں انسان کے اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے لئے بعض اچھے اصول اور قوانین بھی موجود ہیں، لیکن ان میں کوئی ایک کتاب ایسی نہیں ہے جو تمام خیرات کی جامع ہو، جس میں پورا حق ظاہر کردیا گیا ہو، جو تنہا انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی صحیح رہنمائی کرسکتی ہو۔

قرآن مجید ان تینوں خامیوں سے پاک ہے۔

۱۔ وہ انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پیش کیا تھا اول روز سے سینکڑوں ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے ہر زمانے میں اس کو لفظ بہ لفظ یاد کیا ہے، لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے روزانہ اس کی تلاوت کی ہے، ہمیشہ اس کے نسخے ضبط کتابت میں لائے جاتے رہے ہیں، اور کبھی اس کی عبارت میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ جو قرآن نبی عربی صلعم کی زبان سے سنا گیا تھا وہی آج دنیا میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس میں کبھی ایک لفظ کا تغیر و تبدل نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ وہ عربی زبان میں اترا ہے جو زندہ زبان ہے۔ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے آج کروڑوں انسان موجود ہیں، اور آج تک اس زبان کا فصیح اور معیاری لٹریچر وہی ہے جو نزول قرآن کے وقت تھا۔ اس کے معانی اور مطالب معلوم کرنے میں انسان کے لئے وہ دقتیں نہیں ہیں جو مردہ زبانوں کی کتابوں کے سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔

۳۔ وہ سراسر حق، اور از اول تا آخر آلہی تعلیمات سے لبریز ہے۔ اس میں کہیں انسانی جذبات، نفسانی خواہشات قومی یا طائفی خود غرضیوں اور جاہلانہ گمراہیوں کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

۴۔ اس میں تمام نوع بشری کو خطاب کیا گیا ہے، اور ایسے عقائد، اصول اخلاق اور قوانین عمل پیش کئے گئے ہیں۔ جو کسی ملک و قوم اور کسی خاص زمانے کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ اس کی ہر تعلیم عالمگیر بھی ہے۔ اور جاودانی بھی۔

۵۔ اس کے اندر ان تمام حقایق و معارف اور خیرات و صالحات کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے کسی مذہب کی کتاب سے ایسی کوئی بات نکال کر نہیں بتائی جا سکتی جو حق اور نیکی ہو، اور قرآن اس کے ذکر سے خالی ہو۔ ایسی جامع کتاب کی موجودگی میں انسان آپ سے آپ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۶- وہ آسمانی ہدایات اور الٰہی تعلیمات کا جدید ترین مجموعہ (Latest edition) ہے بعض ہدایات جو پچھلی کتابوں میں مخصوص حالات کے تحت دی گئی تھیں وہ اس میں سے نکال دی گئیں اور بہت سی نئی تعلیمات جو پچھلی کتابوں میں نہ تھیں، اس میں اضافہ کر دی گئیں۔ لہٰذا جو شخص آباء و اجداد کا نہیں بلکہ فی الواقع خدائی ہدایت کا پیرو ہے اس کے لیے لازم ہے کہ اسی آخری اور جدید ترین ایڈیشن کا اتباع کرے نہ کہ پرانے ایڈیشنوں کا۔

یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسلام نے تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کو متبوع قرار دیا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے کہ وہ اسی ایک کتاب کو اپنا دستور العمل بنائے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (۴ : ۱۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے تجھے دیا ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۷ : ۱۹)

پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی مدد اور حمایت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اترا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ ان قوموں کو بھی قرآن پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے پاس پہلے سے کوئی آسمانی کتاب موجود ہے۔ چنانچہ بار بار قرآن میں حکم دیا جاتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم (۴ : ۷)

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے، ایمان لاؤ اس کتاب (قرآن) پر جسے ہم نے اُتارا ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَٰبِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے

يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتٰبٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ (۵: ۳)

جو تمہارے لئے ان بہت سے چیزوں کو ظاہر کرتا ہے جن کو تم کتاب میں سے چھپاتے تھے، اور بہت سی چیزوں سے معاف بھی کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہوں کی طرف ہدایت بخشتا ہے جو اس کی خوشنودی کا اتباع کرتے ہیں، اور وہ اس کے حکم سے ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفٰسِقُونَ (۲: ۱۲)

اور ہم نے تیری طرف واضح اور کھلی ہوئی آیتیں اتاری ہیں، اور ان کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو فاسق ہیں

قرآن کے متعلق تفصیلی عقیدہ جو کتاب انسان کے لئے فکر و اعتقاد کی صحیح رہنما قرار دی گئی ہو، اور جس کو عملی زندگی کے لئے واجب الاتباع قانون تقرر کیا گیا ہو، اس کی پیروی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان اس کے صحیح اور برحق ہونے اور غلطیوں سے محفوظ ہونیکا پورا پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر اس کی صحت کے متعلق کسی قسم کے شک نے راہ پالی تو اس کتاب پر سے اطمینان اٹھ جائیگا اور پھر جمعیت خاطر کیساتھ اس کی پیروی نہ کی جاسکے گی۔ اس ضرورت کی بنا پر ایمان بالقرآن کے لازمی اجزا حسب ذیل ہیں جن کو قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے:۔

۱۔ قرآن جس عبارت میں اترا تھا اسی عبارت میں محفوظ ہے کسی قسم کی کمی بیشی اس میں نہیں ہوئی اس پر حسب ذیل آیات قرآنی دلالت کرتی ہیں۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنٰهُ اس کو جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے پس جب

فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵:۱۱)
ہم اسے پڑھیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو، پھر اس کے معانی کو سمجھا دینا بھی ہمارا کام ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (۸۷)
ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ تم بھولنے نہ پاؤ گے، بجز اس کے جسے خدا بھلانا چاہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵:۱)
اس ذکر (قرآن) کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۱۸:۴)
تیری طرف تیرے رب کی کتاب سے جو کچھ وحی کیا گیا ہے اس کی تلاوت کر، اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

۲۔ قرآن کی تنزیل میں کسی شیطانی قوت کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۔ (۲۶:۱۱)
اس کو لے کر شیطان نہیں اترے ہیں، نہ یہ کام ان کے کرنے کا ہے۔ نہ وہ اس کو کر سکتے ہیں بلکہ وہ تو وحی کے سننے سے بھی دور رکھے گئے ہیں۔

۳۔ قرآن میں خود نبی کی خواہش کا بھی کوئی دخل نہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳:۱)
وہ اپنے دل کی خواہش سے نہیں بول رہا ہے بلکہ یہ جو کچھ ہے وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔

۴۔ قرآن میں باطل کو ہرگز کوئی راہ نہیں ملی۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱:۵)
یقیناً یہ ایک محفوظ و مضبوط کتاب ہے، باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم اور سزاوار حمد ہستی کی اتاری ہوئی ہے۔

۵۔ قرآن سراسر حق ہے گمان اور اندازہ کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنا پر اتارا گیا ہے، اس میں کجی اور ٹیڑھ نہیں، ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ھُوَ الْحَقَّ وَیَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔ (۳۴:۶)	اور جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو جو تیری طرف تیرے رب کے پاس سے اتاری گئی ہے سمجھتے ہیں کہ وہی حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف ہدایت کرتی ہے
وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (۶۹:۵۱)	اور بلاشبہ وہ یقینی حق ہے۔
وَلَقَدْ جِئْنٰھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ ھُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۷:۵۲)	اور ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مومنوں کے لئے مفصل ہدایت اور رحمت بنایا ہے۔
قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵:۶)	اے محمد کہہ دو کہ یہ کتاب اس نے اتاری ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب راز جانتا ہے۔
ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۲:۲)	یہی ایک کتاب ہے جس میں کوئی بات شک کی بنا پر نہیں کہی گئی ہے۔
وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔ قَیِّمًا (۱۸:۱)	اور خدا نے اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ وہ بالکل سیدھی ہے
وَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ (۱۷:۹)	بے شک یہ قرآن وہی راستہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھا ہے

۶۔ قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات میں رد و بدل کا حق کسی کو حتیٰ کہ پیغمبرؐ کو بھی نہیں ہے۔

قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ	اے محمد کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلنے کا حق نہیں رکھتا میں تو صرف اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں

اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۲:۱۰) جو میری طرف آتاری جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

۷۔ جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ ہرگز قابل تسلیم اور قابل اتباع نہیں ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (۱:۷) جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کی پیروی نہ کرو۔

یہ قرآن مجید کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ ہے اور اس کے ہر جزو پر اعتقاد رکھنا لازم ہے جس کے عقیدہ میں کسی جزو کی بھی کمی ہوگی وہ قرآن کا صحیح اور کامل اتباع نہ کر سکے گا، اور اس راہ راست سے ہٹ جائے گا جس کا نام "اسلام" ہے"۔

جامعۂ اسلامی کا سنگ بنیاد ایک کتاب اور ایک رسول پر ایمان، اسی کا اتباع اسی کے بنائے ہوئے سانچے میں ذہنیتوں کا ڈھل جانا، اسی ایک منبع سے تمام اعتقادات، عبادات، اخلاق و معاملات، اور جملہ مدنی قوانین کا ماخوذ ہونا، اور اسی ایمان، اطاعت اور اتباع کے رشتے میں تمام پیروان اسلام کا منسلک ہونا، اسلام کو ایک مستقل تہذیب اور مسلمانوں کو ہر قسم کے نسلی، لسانی، لونی اور جغرافی اختلافات کے باوجود ایک قوم بناتا ہے۔ علم و عقل، تحقیق و اجتہاد، نقطۂ نظر اور رجحان طبع کے فطری اختلاف سے یہ ممکن ہے کہ آیات قرآنی اور سنت نبوی سے مسائل کے استنباط، اور ان کے مفہوم اور مقصود کے سمجھنے میں اختلاف واقع ہو جائے، لیکن ایسا اختلاف محض جزئی اور فرعی اختلاف ہے، اور یہ ان مختلف فقہی اور کلامی مذاہب کو الگ الگ دین اور ان کے ماننے والوں کو جدا جدا قومیں نہیں بناتا۔ اصل چیز جس پر ملت اسلام کی بنا قائم ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسولِ خدا ہونے کے واحد مقتدا، اور قرآن کو بحیثیت کتاب الٰہی ہونے کے واحد کتاب آئین تسلیم کرنا، اور اسی سرچشمے کو جملہ عقاید اور قوانین کا

ماخذ قرار دیتا ہے۔ اس اصل میں جو لوگ متفق ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ ان کے درمیان فرعی امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ اور اس اصل سے جو لوگ اختلاف رکھتے ہیں، وہ سب اسلام کی نظر میں ایک دوسری قوم ہیں، خواہ وہ خود آپس میں کتنی ہی مختلف قومیتوں میں بٹے ہوئے ہوں۔

قرآن دراصل ان تمام امور کا جامع ہے جن پر اسلام کی بنا قائم ہے۔ جو قرآن پر ایمان لایا، وہ گویا خدا، اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخر پر بھی ایمان لے آیا، کیونکہ یہ تمام ایمانیات اپنی تفصیلات کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں، اور ایمان بالقرآن کے راست اور درست ہونے کا یقینی ثمرہ یہی ہے کہ انسان کو پورا ایمان حاصل ہو جائے۔ اسی طرح قرآن میں شریعت اسلام کے تمام اصول اور اساسی قوانین بھی مندرج ہیں، جن کو صاحب شریعت علیہ السلام نے اپنے قول اور اپنے عمل سے واضح اور شرح کر دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص صحیح ایمان کے ساتھ قرآن اور سنت رسولؐ کو اپنی زندگی کے تمام معاملات میں واجب الاتباع قانون قرار دیتا ہے، وہ یقیناً اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے مسلمان ہے۔ اسی ایمان اور اتباع کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں گی وہاں اسلام بھی ہوگا اور جہاں یہ نہ ہوں گی، وہاں اسلام بھی نہ ہوگا۔ (باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۴)

عہد جدید (اناجیل وغیرہ)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

عہد جدید کی کتابیں بائبل کے حصۂ جدید یعنی کتب عہد جدید کی موجودہ فہرست میں ستائیس (۲۷)
کتابیں شامل ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:-
(۱) متی کی انجیل۔ (۲) مرقس کی انجیل۔ (۳) لوقا کی انجیل۔ (۴) یوحنا کی انجیل۔ (۵) رسولوں کے اعمال
(۶) پولس رسول کا خط رومیوں کو۔ (۷) پولس رسول کا پہلا خط قرنتیوں کو۔ (۸) پولس رسول کا دوسرا خط قرنتیوں کو۔
(۹) پولس رسول کا خط گلتیوں کو۔ (۱۰) پولس رسول کا خط افسیون کو (۱۱) پولس رسول کا خط فلپیون کو۔ (۱۲) پولس
رسول کا خط قلسیون کو (۱۳) پولس رسول کا خط تسلونیقیون کو۔ (۱۴) پولس رسول کا دوسرا خط تسلونیقیون کو۔
(۱۵) پولس رسول کا پہلا خط تمطاؤس کو۔ (۱۶) پولس رسول کا دوسرا خط تمطاوس کو (۱۷) پولس رسول
کا خط طیطس کو۔ (۱۸) پولس رسول کا خط فلیمون کو۔ (۱۹) عبرانیون کو خط۔ (۲۰) یعقوب کا خط۔ (۲۱)
پطرس کا پہلا خط (۲۲) پطرس کا دوسرا خط۔ (۲۳) یوحنا کا پہلا خط۔ (۲۴) یوحنا کا دوسرا خط۔ (۲۵)
یوحنا کا تیسرا خط۔ (۲۶) یہوداہ کا خط۔ (۲۷) یوحنا فقیہ کے مکاشفات کی کتاب۔

کتب غیر مشمولہ جو معاملات کہ کتب عہد عتیق کے ساتھ پیش آئے کچھ اسی نوع کے بلکہ ان سے بھی
زیادہ انوکھے معاملات کتب عہد جدید کے ساتھ بھی پیش آچکے ہیں عیسائی مفسرین و مصنفین ہی کی تحریروں
سے پایا جاتا ہے کہ کم از کم ایک سو اٹھاون (۱۵۸) کتابیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی زمانہ میں کسی نہ کسی گروہ

کے نزدیک معتبر و مقدس تھیں مگر اب محققین کے نزدیک جعلی اور مجموعۂ عہد جدید سے خارج ہیں۔ کم از کم کی قید اس لئے لگائی گئی کہ قوی احتمال ہے کہ اس نوع کی کتابوں کی تعداد اس سے بھی زاید ہو اور ان کا ذکر عیسائی مصنفین کی تحریروں میں نہ آیا ہو یا آیا ہو مگر وہ تحریریں ہم تک نہ پہنچی ہوں جبکہ ان کتابوں کو اہل کتاب ہی نے مجروح کرکے ناقابل اعتماد قرار دیدیا تو ہمیں ان کے نام اور ان کی تفصیل سے ان اوراق کو رنگین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جنہیں ان کے نام دریافت کرنے کا شوق ہو وہ ان کتابوں کو دیکھیں:- ہارن صاحب کی "انٹروڈکشن علوم بائیبل پر" مطبوعہ لنڈن ۱۸۲۵ء جلد ا۔ لارڈنرصاحب کے ورکس مطبوعہ لنڈن ۱۸۲۹ء جلد ۴۔ جارج سیل کی تحریریں مطبوعہ لنڈن ۱۸۶۱ء اکسیہومو اور اپوکرفل نیوٹسٹیمنٹ مطبوعہ لنڈن ۱۸۲۰ء۔ اور عیسائیوں کے شنبری اخبار نور افشاں لدھیانہ کی اشاعت ۲۷ جولائی ۱۸۷۶ء کے صفحہ ۲۳۲ پر پادری ویری صاحب کا مضمون۔ ہارن صاحب نے اپنے انٹروڈکشن میں اس پر زیادہ مفصل بحث کی ہے۔ وہ اپنی کتاب جلد ا کے صفحہ ۲۴۶ پر لکھتے ہیں کہ کتب غیر مشمولہ میں چند کتابیں ایسی بھی تھیں جن کی بابت بیان کیا جاتا تھا کہ وہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کے یہ نام بیان کئے جاتے ہیں:-

(۱) نامہ بنام آبگارس۔ (۲) نامہ بنام پیٹر و پال۔ (۳) کتاب تمثیلوں اور وعظ کی (۴) کتاب مناجات مسیح۔ (۵) کتاب سحر۔ (۶) کتاب پیدائش مسیح و مریم۔ (۷) نامے جو آسمان سے گرے۔ (۸) نامہ حضرت مسیح جو منی کیس نے پیدا کیا۔

روس تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزا پور ۱۸۷۶ء جلد ۲ کے صفحہ ۳۶ پر درج ہے کہ سنہ ۳۰۰ء میں مورخ یوسی بس (Eusibius) نے شہر ادلیسہ کے شاہی دفتر میں دو خط پائے جن میں سے ایک خط ابگرس بادشاہ کی طرف سے مسیح کے نام تھا جس میں اس نے ایک شدید مرض میں اپنے مبتلا ہونے کا حال لکھکر مسیح سے درخواست کی تھی کہ اسے تندرست کردے اور دوسرا خود مسیح کی طرف سے بادشاہ کے خط کا جواب تھا مسیح کا یہ خط بھی

مروجہ مجموعہ کتب عہد جدید میں شامل نہیں۔

اخبار نور افشاں مورخہ ۹ جولائی ۱۸۷۲ء جلد ۲ نمبر ۲ صفحہ ۱۲۳ کالم ۲ میں پادری ویری صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"جعلی انجیلوں کے موجود ہونے سے ہم ناواقف نہیں ہیں بلکہ جن جعلی انجیلوں کا ہارن صاحب نے اپنی تصنیف میں حوالہ دیا ہے وہ ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ان کو بعض بدعتیوں نے مروج کرنا چاہا تھا مگر وے اپنے فاسد ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

جعل و فریب کی گرم بازاری جس زمانے سے یہ جعلی کتابیں متعلق ہیں وہ زمانہ جعل فریب کذب بیانی اور جھوٹی تحریروں کی اشاعت میں اس درجہ شہرۂ آفاق تھا کہ عیسائی مصنفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ لوقا باب ۱ آیہ ۱ تا ۴ میں ہے کہ:۔

"چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کا جو فی الواقع ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں۔ جس طرح سے انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کی خدمت کرنے والے تھے ہم سے روایت کی ہیں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بہ ترتیب لکھوں تاکہ تو ان باتوں کی حقیقت کو جن کی تو نے تعلیم پائی جانے۔"

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ لوقا کے زمانہ میں لوقا کی طرح اور لوگوں نے بھی بکثرت انجیلیں لکھی تھیں مگر کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیسی تھیں۔ جھوٹی یا سچی۔

گلتیوں کے باب ۱۔ آیہ ۶ میں ہے کہ:۔

میں تعجب کرتا ہوں کہ تم اتنی جلدی اس سے جس نے تمہیں مسیح کے فضل میں بلایا پھر کے دوسری انجیل کی طرف مائل ہوئے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ اناجیل اربعہ کے کوئی اور انجیل بھی تھی جو پولوس کے زمانہ میں مشہور ہو چکی تھی اور لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے لگی تھی۔

پولوس کے تسلونیقیوں کے نام دوسرے خط کے باب ۲ آیہ ۲ میں ہے کہ:۔

تم اس خیال سے کہ مسیح کا دن آپہنچا ہے جلد اپنے دل کی ڈھارس مت کھوؤ اور نہ گھبراؤ نہ کسی روح نہ کسی کلام نہ کسی خط سے یہ سوچکر کہ وہ ہماری طرف سے ہے۔ کوئی تمہیں کسی طرح سے فریب نہ دے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پولوس ہی کے زمانے سے جعلی خطوں کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ بلکہ ۲ قرنتیون کے باب ۱۱ آیہ ۱۳ و ۱۴ میں تو اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ پولوس ہی کے زمانہ سے جھوٹے دغاباز اور گمراہ کن مدعیان رسالت کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا تھا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ چنانچہ اسکاٹ صاحب کی رومن تفسیر مطبوعہ آلہ آباد ۱۸۶۲ء کے صفحہ ۱۸۶ پر لکھا ہے کہ:۔

نہ صرف جعلی مصنف بلکہ مسیح ہونے کا بہتوں نے دعویٰ کیا تھا چنانچہ یوسف مورخ کتنوں کا ذکر کرتا ہے وہ یوں لکھتا ہے کہ ملک جادوگروں اور دغابازوں سے بھر گیا تھا جنہوں نے بہتوں کو در غلانا اور بیابان میں لے گئے تاکہ اپنی کرامتیں دکھلائیں۔ ان میں سے دوسیتھیوس سامری کا ذکر ہے جس نے اپنے آپ کو مسیح کہا اور شمعون مجوسی جو اپنے آپکو خدا کا بیٹا کہتا تھا اور تُو دِس جس نے بہت لوگوں کو دھوکہ دیکر کہا کہ میں یردن ندی کو دو حصّہ کرکے بیچ میں راستہ بنا دوں گا۔ القصہ چوبیں شخصوں کا ذکر ہے جنہوں نے ادرین قیصر کے وقت سے لیکر ۱۶۸۲ء تک مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔"

ظاہر ہے کہ ان جعلسازوں اور جھوٹے مدعیان رسالت و الوہیت کی کثرت نے تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سادہ لوحوں کی گمراہی کے لئے کیا کچھ سامان فراہم نہ کیا ہوگا۔ مگر مزید برآں جو بات زیادہ

قابل افسوس ہے یہ ہے کہ اُس زمانہ کے دیندار عیسائیوں نے بھی معاملات دین میں کذب بیانی کا شیوہ اختیار کر لیا تھا اور یہ سمجھ رکھا تھا کہ دین اور خدا پرستی کی ترقی اور حق بات کی تائید میں جھوٹ اور غلط بیانی سے مدد لینا ثواب کا کام ہے۔ اس خیال کی ابتدا کا سراغ ہمیں پولوس مقدس کی تحریر میں ملتا ہے اور ان کا اس پر عامل ہونا بھی انہیں کے بیان سے پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جو خط رومیوں کو لکھا تھا اور جو مجموعہ کتب عہد جدید میں شامل ہے اس کے باب ۳ آیہ ۷، ۸ میں ہے کہ:-

"پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لئے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے۔ اور ہم کیوں برائی نہ کریں تاکہ بھلائی نکلے چنانچہ یہ تہمت ہم پر لگائی بھی جاتی ہے"

پہلی صدی عیسوی کے متعلق موشیم صاحب اپنی تاریخ مطبوعہ ۱۸۶۰ء کے حصہ ۲ باب ۲ صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ متعدد وجوہ تھے جن کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ تمام انجیلوں کو ایک نسخہ میں جمع کر دیا جاوے۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات اور اُن کے آسمان پر جانے کے واقعات غلط کہانیوں کی صورت میں ایسے لوگوں نے لکھے تھے جن کے ارادے بد نہ تھے مگر جو جھوٹے مذہب والوں اور سادہ لوح گمراہی یا فریب خوردہ خدا پرستوں سے اُنس و رغبت رکھتے تھے۔ اس کے بعد دنیا میں بہت سی تحریریں پھیل گئیں جن کی بنیاد کذب پر تھی اور جن پر پاک پیغمبروں کے نام بطور مصنفوں کے درج کر دیے گئے تھے۔

دوسری صدی عیسوی کے ذکر میں رومن تواریخ کلیسا مطبوعہ مرزاپور ۱۸۵۶ء کے صفحہ ۹۰ پر مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:-

دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جاوے تو انہیں کے بحث کا طور اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں اور آخر کار اُریجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقہ مذکور تسلیم ہوا اس سے

البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی اور نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا پھر اسی سبب سے بعضے لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں۔ اس طرح سے کہ جب فیلسوف لوگ کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اُس کے حق میں کتاب لکھکر کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلے سے لوگ اسپر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں اگرچہ اُس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں۔ سو اسی طرح مسیحی جو فیلسوفوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھکر کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسیا میں جاری رہا۔ یہ بات بہت ہی خلاف حق اور قابل الزام شدید تھی"۔

اوڈن صاحب اقرار کرتے ہیں کہ دسویں صدی میں جعل اور جھوٹ کا جو دریا مسیحیوں میں موج زن تھا اُسی کا ایک کرشمہ یہ بھی تھا کہ نامۂ تھائی سس بھی جعل سے بنایا گیا۔ لب التواریخ مطبوعہ ۱۸۲۹ء جلد ۲ باب ۹ فصل ۱ صفحہ ۳۹ پر یہ اعتراف بھی درج ہے کہ ایسو ڈورس کے مکتوب کا جعل سولہویں صدی تک مکمل طور پر آشکارا نہ ہوا تھا۔ ہارن صاحب اپنی تفسیر مطبوعہ لندن ۱۸۲۲ء کی دوسری جلد کے صفحہ ۳۳۱ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"بلاشبہ بعض خرابیاں (یعنی تحریفیں) جان بوجھکر اُن لوگوں نے کی ہیں جو کہ دیندار مشہور تھے اور اس کے بعد انہیں خرابیوں کو ترجیح دی جاتی تھی تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے پر نہ آنے دیں"۔

مختصر یہ کہ دین عیسوی کے متعلق بکثرت جعلی انجیلیں اور جھوٹی مذہبی تحریریں وجود میں آئیں اور وقتاً فوقتاً وجود میں آتی رہیں مگر عیسائی علماء ہی نے انہیں جعلی اور ناقابل اعتماد قرار دیکر مجموعہ

عہد جدید میں شامل نہ ہونے دیا۔ اور ان جعلی تصانیف کے وجود میں آنے کے جو اسباب خود عیسائی مصنفین نے بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ عیسائیوں کے ہر فرقہ نے اپنے مسلک کی تائید میں کتابیں لکھ ڈالیں اور انہیں کسی حواری، حواری کے خادم، یا کسی بڑے شخص کے نام سے نامزد کر دیا۔

۲۔ جعلی مسیح، ابن اللہ اور رسول ہونے کے جھوٹے دعویدار دروغگو کذاب اور فریبیوں کی کثرت مختلف دور میں جعلی تصانیف کے اضافہ کا باعث ہوتی رہی۔

۳۔ دیندار طبقات نے بھی دین کی خاطر حق کی تائید میں جھوٹ بولنا جائز سمجھ لیا اور اس خیال و عمل میں بہ اعتراف خود پولوس بھی شریک تھے۔

اس وقت صرف اسی امر سے بحث ہے کہ یہ اسباب جعلی تحریروں کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے۔ مگر آگے چلکر معلوم ہوگا کہ ان کے اثر سے وہ تحریریں بھی محفوظ نہ رہ سکیں جو علمائے نصاریٰ کے نزدیک معتبر ہیں اور جنہوں نے عیسائیوں کی مہربانی سے عہد جدید کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں جگہ پائی

کتب مشمولہ عہد جدید کی حقیقت عہد جدید میں جو ستائیس (۲۷) کتابیں شامل ہیں اُن میں عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوی وہ شامل نہیں۔ نہ عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی لکھی ہوی کوئی کتاب شامل ہے۔ نہ کوئی ایسی کتاب اس مجموعہ میں پائی جاتی ہے جسے عیسیٰ علیہ السلام اپنے دور میں اپنی ہدایت اپنے اہتمام اور اپنی نگرانی کے تحت میں لکھوا کر اپنی امت کے لئے چھوڑ گئے ہوں۔ حالانکہ انجیل عیسیٰ کا وجود عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اور اس کا ثبوت موجودہ اناجیل عہد جدید سے ہی پایا جاتا ہے۔ مرقس باب ۱ آیہ ۱۵ میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول درج ہے کہ:۔

"وقت پورا ہوا اور خدائی بادشاہت نزدیک آئی۔ توبہ کرو اور انجیل پر ایمان لاؤ"

مرقس باب ۱۰ آیہ ۲۹ و ۳۰ میں ہے کہ:۔

یسوع نے جواب میں کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں ایسا کوئی نہیں جس نے گھر یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا جورو یا لڑکے بالوں یا کھیتوں کو میرے اور انجیل کے لئے چھوڑ دیا ہے جو بالفعل اس جہان میں سو گنا نہ پاوے۔"

متی باب ۲۶ آیہ ۱۳ میں مسیح کا یہ قول درج ہے۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمام دنیا میں جہاں کہیں اس انجیل کی منادی ہوگی۔"

وہ کونسی انجیل ہے جس کی بابت آیات مندرجہ بالا میں اشارہ ہے؟ وہ انجیل کہاں ہے جس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے؟ جس کے لئے ماں باپ بہن بھائی بیوی بچے گھر بار کھیتی باڑی چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اجر کا وعدہ ہے؟ عہد جدید کی اناجیل اربعہ عیسیٰ علیہ السلام سے بہت بعد کی تصانیف ہیں جو حواریوں اور حواریوں کے شاگردوں سے منسوب کر دی گئی ہیں اور جن کے مصنفین و مآخذ کے متعلق بھی خود عیسائیوں ہی میں بڑی بڑی بحثیں پیش آچکی ہیں۔ عہد جدید کی موجودہ ستائیس (۲۷) کتابوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں بلکہ متی مرقس لوقا اور یوحنا کی انجیلیں شامل ہیں۔ رسولوں کے اعمال کی ایک کتاب ہے پولوس کے چودہ (۱۴) خطوط، یعقوب کا ایک خط، پطرس کے دو خطوط، یوحنا کے تین (۳) خطوط، یہوداہ کا ایک خط، اور یوحنا فقیہ کے مکاشفات کی ایک کتاب شامل ہیں۔ یہ سب ملکر (۲۷) کتابیں ہوئیں۔ ان کتابوں کے متعلق مورخ یوسی بئیس کا قول ہے کہ یہ بھی تین اقسام میں منقسم ہیں۔ ایک وہ جن کے معتبر ہونے پر سب کو اتفاق ہے۔ اس میں یہ کتابیں شامل ہیں:۔

اناجیل اربعہ، رسولوں کے اعمال، پولوس کے چودہ خط۔ پطرس کا پہلا خط۔ یوحنا کا پہلا خط۔ یہ سب ۲۱ کتابیں ہوئیں جن کی صحت پر عیسائیوں کا اتفاق بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یوسی بیس یہ بھی کہتا ہے کہ شاید موقع ہے کہ مکاشفات کی کتاب بھی اس میں شامل کر لی جائے۔

دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جن کی بابت یوسی بیس کہتا ہے کہ صحت میں اختلاف ہے اور بعض کو

ان کی صحت میں شک ہے۔ اس میں یہ کتابیں شامل کی گئی ہیں:۔

یعقوب کا خط یہوداہ کا خط۔ پطرس کا دوسرا خط۔ اور یوحنّا کا دوسرا اور تیسرا خط۔ یہ سب ملکر پانچ (۵) کتابیں ہوئیں۔

تیسری قسم ان کتابوں کی ہے جن کے غیر معتبر ہونے پر سب کو اتفاق ہے۔ مگر اس نوع کی کتابوں میں یوسی بیس کو جرارت نہ ہوی کہ شمولہ کتب عہد جدید میں سے کسی کا نام داخل کرے۔ مفتاح الکتاب کے مصنف نے البتہ باوجود عیسائی ہونے کے اخلاقی جرارت سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس نوع کی کتابوں میں بعض نے اس خط کو جو عبرانیوں کے نام ہے، اور یوحنّا کے مکاشفات کو داخل کیا ہے۔ بہرحال مشکوک کتابیں سات ہیں جن کے مشکوک ہونے کی بابت بقول پادری فانڈر صاحب عیسائیوں میں رائے عام ہے۔ یہ کتابیں بائبل کے اُس سُریانی ترجمہ سے بھی خارج ہیں جو عیسائیوں کے قول کے مطابق ۱۲۰ء اور ۲۰۰ء کے درمیان کا لکھا ہوا ہے۔ ان سات کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

یعقوب کا خط۔ یہوداہ کا خط۔ پطرس کا دوسرا خط۔ یوحنّا کا دوسرا خط۔ یوحنّا کا تیسرا خط۔ عبرانیوں کو خط۔ مکاشفات یوحنّا۔

اب ہم سب سے پہلے اُن کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں جو تمام عیسائیوں کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔ ان میں سب سے مقدم چار انجیلیں ہیں۔ یہ انجیلیں متی یوحنّا مرقس اور لوقا کی ہیں۔ متی اور یوحنّا عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد اور حواری بیان کئے جاتے ہیں۔ اور مرقس و لوقا حواریوں کی طرف سے صرف انجیل کے سُنانے والے۔ ہم ان انجیلوں کو اسی ترتیب سے لیتے ہیں جس ترتیب سے کہ وہ عہد نامہ جدید میں درج کی گئی ہیں۔

انجیل متی متی کی انجیل کے متعلق یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچگیا ہے کہ یہ انجیل اصل میں عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لارڈ نر نے اور ہکن کے تین اقوال اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انجیل عبرانی میں

لکھی گئی - یوسی بیس اور اتھناسیس اور سرل اور جیروم سب اس بات پر متفق ہیں کہ متی نے یہ انجیل عبرانی زبان میں لکھی - ہارن صاحب نے اپنی تفسیر میں تیئیس (۲۳) ایسے علمار کے نام لکھے ہیں جو متی کی انجیل کا عبرانی میں ہونا بیان کرتے ہیں - ریو صاحب اپنی تاریخ انجیل میں لکھتے ہیں کہ :-

"یہ بات غلط ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ متی نے انجیل یونانی میں لکھی تھی کیونکہ یوسی بیس اور بہت سے عیسائی علمار نے لکھا ہے کہ متی نے انجیل عبرانی میں لکھی ہے نہ کہ یونانی میں -"

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد ۱۹ میں ہے کہ :-

عہد جدید کی سب کتابیں یونانی میں لکھی گئیں الا انجیل متی اور نامۂ عبرانیان جن کا عبرانی زبان میں لکھا جانا بہ دلائل متیقن ہے -"

انجیل متی کے عبرانی زبان میں ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی - اور یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی ہدایت کے لئے کوئی کتاب نہ چھوڑی ہو - ہم اوپر مرقس باب ۱ آیہ ۱۵ اور باب ۱۰ آیہ ۲۹ و ۳۰ اور متی باب ۲۶ آیہ ۱۳ کے حوالہ سے بیان کر چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک انجیل کا وجود تھا - ہارن صاحب بھی اپنی کتاب کی جلد ۴ میں لکھتے ہیں کہ :-

"بعض قدیم علمار کا قول ہے کہ متی اور مرقس اور لوقا کے پاس عبرانی میں ایک ایسا صحیفہ تھا جس میں حضرت عیسیٰ کے گذارشات لکھے تھے اور انہوں نے اس سے نقل کیا متی نے بہت اور لوقا اور مرقس نے تھوڑا -"

نورٹن صاحب اپنی کتاب علم اسناد مطبوعہ بوسٹن ۱۸۳۷ء کے دیباچہ جلد اول میں اکھارن کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :-

"ابتدائے ملت مسیحی میں احوال مسیح کے بیان میں ایک مختصر سا رسالہ تھا۔ جائز ہے کہ کہا جاوے کہ وہی اصلی انجیل تھی۔ اور غالب یہ ہے کہ یہ انجیل ان مریدوں کے واسطے بنائی گئی تھی جنہوں نے اقوال مسیح اپنے کان سے نہ سنے تھے اور نہ ان کے حالات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ چنانچہ یہ انجیل بمنزلہ قالب کے تھی اور اس میں حالات مسیح ترتیب سے نہ لکھے گئے تھے اور یہ انجیل جمیع اناجیل مروجہ صدی اول و دوم و نیز انجیل متی و لوقا و مرقس کا ماخذ تھی۔ پھر یہ تینوں انجیلیں یعنی متی و لوقا و مرقس دوسری اور انجیلوں پر فوقیت لے گئیں۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اگرچہ ان تینوں میں اصل سے کچھ کمی ہو گئی تھی مگر یہ اُن لوگوں کے ہاتھ پڑیں جو دوسری انجیلوں مثلاً انجیل فرقہ ماربیون یا انجیل ٹی ٹنس وغیرہ سے بیزار ہو چکے تھے۔ ان تین انجیلوں کی کمی کو دوسری انجیلوں سے واقعات مسیح کو لیکر پورا کیا گیا اور نسب نامہ مسیح اور ولادت و بلوغ وغیرہ کے حالات بھی شامل کر دئے گئے۔ چنانچہ یہ حال اس انجیل سے جو تذکرہ کے نام سے مشہور ہے اور جس سے جسٹن نے نقل کیا تھا اور انجیل سرنتھس سے بخوبی ظاہر ہے۔ اگر ہم اُن انجیلوں کے باقی ماندہ اجزا سے مقابلہ کریں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل انجیل میں زیادتی تدریج واقع ہوی ہے۔"

پھر آگے چلکر نورٹن صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر یہ کمی و زیادتی انجیل میں واقع نہ ہوی ہوتی تو معتبر و مشہور مورخ سلوس یہ کیوں اعتراض کرتا کہ عیسائیوں نے اپنی انجیلیں تین بار یا چار بار بلکہ اس سے بھی زیادہ بار بدلی ہیں۔"

پھر فاضل نورٹن بعد میں یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ صرف اکہارن کی رائے ہے اس واسطے کہ اکہارن کی کتاب سے بڑھ کر کوئی کتاب ملک جرمن میں اب تک مقبول نہیں ہوئی بلکہ جرمنی کے بکثرت علمائے متاخرین نے اناجیل ونیزان امور کے بارہ میں جن سے انجیل کی صحت پر الزام آتا ہے اکہارن کی رائے کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔"

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ موشیم صاحب نے اپنی تاریخ مطبوعہ ۱۸۳۲ء کی جلد اول میں ناصری اور ابیونی فرقوں کے بیان میں لکھا ہے کہ:۔

"ان دونوں کے پاس ایک انجیل تھی جو ہماری انجیل سے مختلف ہے اور اُس انجیل کی بابت ہمارے علماء میں اختلاف ہے۔"

میکلین نے اس عبارت پر بطور حاشیہ کے لکھا ہے کہ:۔

"انجیل ناصریوں والی یا عبرانی یقیناً وہی ہے جو فرقہ ابیونی کے پاس تھی اور بارہ حواریوں کی انجیل کرکے مشہور ہے۔"

ابیونی فرقہ کے متعلق اس قدر جان لینا ضروری ہے کہ یہ لوگ پولوس سے سخت نفرت کرتے تھے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پابند تھے عیسیٰ علیہ السلام کو انسان سمجھتے تھے اور انہیں یوسف و مریم کا بیٹا تسلیم کرتے تھے۔ یہ لوگ عیسویت کے ابتدائی زمانہ میں موجود تھے۔ یوحنا حواری کے زمانہ میں بھی تھے اور صرف متی کی اصلی انجیل کو جو کہ عبرانی زبان میں تھی مانتے تھے۔ اس عبرانی انجیل میں نسب نامۂ مسیح نہ تھا۔

ٹامس اسکاٹ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عبرانی انجیل صعود عیسیٰ سے قریب آٹھ سال بعد لکھی گئی۔ بعض کے نزدیک سنہ ۳۷ء یا سنہ ۳۸ء میں لکھی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلی اور قدیم ترین انجیل ہے جو سنہ ۶۳ء کے قریب لکھی گئی۔ مقام تصنیف یہودیہ اور مقصد تصنیف عبرانی عیسائیوں کی ہدایت بیان کیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ متی نے خود یا اُس کے کسی ہم عہد نے اُس کا ترجمہ عبرانی سے یونانی

زبان میں کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ :۔

"یعقوب نے جو خداوند کا بھائی تھا اس کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا" (تفسیر اسکات)۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ترجمہ "حواریوں کے کسی مرید نے کیا" (پادری فانڈر صاحب) مگر اس میں شبہ نہیں کہ انجیل متی کا اصل عبرانی نسخہ مفقود ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط، اسی کتاب کا ہے یا کسی اور کتاب کا، صرف کتاب ہی کا ترجمہ ہے یا کچھ کمی وبیشی بھی کردی گئی ہے۔ نہ ترجمہ کرنے والے کا صحیح نام معلوم ہوسکا نہ ترجمہ کی تاریخ کا صحیح حال کسی کو معلوم ہے، نہ اس دنیا میں کوئی عبرانی زبان کا نسخہ کہیں موجود ہے کہ اس سے ترجمہ کا مقابلہ کیا جاسکے بلکہ ترجمہ کی عبارت اور عیسائی علماء کے اقوال شہادت دیتے ہیں کہ اس ترجمہ کو متی کی عبرانی انجیل سے کوئی تعلق نہیں۔ متی باب ۹ کی آیہ ۹ کو ذرا ملاحظہ فرمائیے :۔

"پھر یسوع وہاں سے آگے بڑھا تو متی نامی ایک شخص کو محصول کی چوکی پر بیٹھے دیکھا اور اسے کہا میرے پیچھے آ وہ اٹھ کے اس کے پیچھے چلا"

بھلا جس کتاب میں متی کے متعلق اس قسم کے جملے درج ہوں اسے متی کی تصنیف کون کہہ سکتا ہے؟

علاوہ ازیں متعدد غلطیاں ترجمہ مروجہ میں پائی گئیں ہیں جن پر عیسائی علماء نے بھی قلم اٹھایا ہے ان کی تفصیل طوالت طلب ہے اس لئے یہاں انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بڑی بحث نسب نامۂ مسیح میں ہے جو متی باب اول میں درج ہے۔ لحاظ اس اہمیت کے جو کہ اس بحث کو حاصل ہے یہاں مختصراً اس کی بابت کچھ لکھا جاتا ہے۔

نسب نامہ مسیح

متی باب ۱ آیہ ۱۷ میں ہے کہ :۔ پس سب پشتیں ابرہام سے داؤد تک چودہ ہیں اور داؤد سے بابل کو جانے تک چودہ پشتیں اور بابل کو جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہیں۔

آیت مندرجۂ بالا میں نسب نامہ کو چودہ چودہ پشتوں کی تین تقسیموں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اور یہ صریحاً غلط ہے پہلے حصہ میں اگر ابرہام اور داؤد کو بھی شامل کرلیا جاوے تب کہیں جاکر چودہ پشتیں پوری ہوتی ہیں۔

دوسرے حصہ میں اگر یلونیاہ کو شامل کیا جائے تب چودہ کی تعداد تو پوری ہوجاتی ہے مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ اس حصہ کے متعلق سلیمان سے لیکر یلونیاہ تک متی میں صرف چودہ پشتیں تبلائی گئی ہیں حالانکہ اول تواریخ باب ۳ میں اٹھارہ (۱۸) پشتوں کے نام گنوائے گئے ہیں۔ اور عیسائی علماء کے نزدیک بھی معتبر یہی اٹھارہ (۱۸) پشتیں ہیں۔ اسی امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نیومین صاحب نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:۔

"دین عیسوی میں ایک اور تین کو ایک ماننا پڑا تھا۔ اب اٹھارہ (۱۸) اور چودہ کو بھی ایک کہنا پڑا۔ کیونکہ کتب مقدسہ میں تو غلطی کا احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔"

تیسرے حصہ میں سب نام حضرت عیسیٰ تک کے ملا کر خواہ کسی طرح سے اور کسی طرف سے گنیے تیرہ (۱۳) ہی ہوتے ہیں نہ کہ چودہ۔

علاوہ ازیں متی باب ۱ آیہ ۸ میں عزیاہ کو یورام کا بیٹا تبلایا گیا ہے حالانکہ بموجب اول تواریخ باب (۳) آیہ ۱۱ و ۱۲ کے وہ یورام کے پوتے کا پوتا ہے یعنی درمیان سے تین نام اڑا دیے گئے۔ پھر متی باب ۱ آیہ ۱۱ میں یلونیاہ کو یوسیاہ کا بیٹا قرار دیا گیا ہے حالانکہ وہ اس کا پوتا تھا۔ اور متی میں یلونیاہ کے بھائیوں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ متی نے زروبابل کو سلتائیل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ وہ اس کا بھتیجا یعنی اُس کے بھائی فدایاہ کا بیٹا تھا۔ اور ابیوہ کو زروبابل کا بیٹا لکھا ہے حالانکہ زروبابل کا کوئی بیٹا اس نام کا نہ تھا۔ طوالت کے خیال سے ہم اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ ایسی غلطیاں اس کتاب میں بہت ہیں جس کتاب کا ایک جزو بھی غلط ثابت ہوجائے وہ ساری کی ساری اعتبار سے گر جاتی ہے۔

نسب نامہ کے متعلق مندرجہ بالا اعتراضات تو وہ ہیں جو عیسائی علماء ہی کی جانب سے وقتاً فوقتاً پیش ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ایک اعتراض ہم بھی اپنی طرف سے پیش کر دیں۔

وہ اعتراض یہ ہے کہ ایک طرف الوہیت مسیح کا دعویٰ اور دوسری طرف نسب نامہ پیش کرکے مسیح کو اولاد ابراہیم و داؤد ثابت کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ نسب نامہ یوسف نجار پر منتہی ہوجانا چاہئے تھا۔ مسیح کو یوسف نجار سے کیا تعلق ؟۔ اگر مسیح کو الوہیت کا تاج پہنایا جاتا ہے، اگر مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہا جاتا ہے تو پھر اس خاکی نسب نامہ کو انجیل میں داخل کرنے اور مسیح سے متعلق کرنے کی ضرورت ہی کونسی تھی؟۔ اس پر زیادہ تفصیلی بحث انشاء اللہ کسی دوسرے موقعہ پر آئے گی۔

انجیل متی کے متعلق اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

۱۔ متی کی اصلی انجیل عبرانی میں لکھی گئی تھی جو موجودہ ساری انجیلوں پر مقدم تھی اور جواب ضایع ہوچکی ہے۔

۲۔ اس انجیل کے یونانی زبان میں ترجمہ کرنے والے کا نہ نام معلوم ہوتا ہے نہ حال نہ صحیح طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ ترجمہ کب ہوا۔

۳۔ اس یونانی انجیل کو عبرانی انجیل والے متی سے کوئی تعلق نہیں۔

۴۔ یونانی انجیل متی میں بھی غلطیاں ہیں۔

۵۔ جو نسب نامہ اس میں درج ہے اسے عیسائی تک غلطیوں سے پُر سمجھتے ہیں۔

۶۔ وہ عبرانی انجیل جو "بارہ حواریوں کی انجیل" کہلاتی ہے ابیونی فرقہ کے پاس تھی اور اس فرقہ کا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ صرف ایک برگزیدہ انسان تھے۔ (باقی)

تفسیر سورۂ انشراح

از

جناب مولوی اکرام علی صاحب محمدی

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۭ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۭ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۙ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۧ ۔

اس سورۂ شریف میں اللہ جل شانہ اپنے حبیب اکرم صلعم سے خصوصیت کے ساتھ فرماتا ہے "کیا ہم نے تیرے سینہ کو نہیں کھول دیا؟ اور ہم نے تجھ سے وہ بوجھ اتار دیا جس کی وجہ سے تیری پیٹھ بوجھل ہو رہی تھی۔ اور ہم نے تیرے آوازہ کو بلند کر دیا پس مشکلات کے ساتھ بیشک آسانی ہے یقیناً مشکلات کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تو فارغ ہو تو محنت کر۔ اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھ"

اَلَمْ نَشْرَحْ میں الف استفہامیہ ہے۔ استفہام کی دو قسمیں ہیں۔ اقراری و انکاری۔ مثلاً اَزَیْدٌ قَائِمٌ۔ کیا زید کھڑا ہے۔ جواب ہوگا نعم۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ط کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے؟ یعنی ہے۔ چنانچہ اردو میں بھی کہتے ہیں۔ کیا تم نے اس کام کو نہیں کیا یعنی کیا۔ کیا میں نے یہ کام کیا؟ یعنی نہیں کیا۔

لَمْ حرف جازم نافیہ ہے۔ شرح صدر سے مراد یہاں (اَیْ وَسَّعْنَا) ہے یعنی فراخ کر دیا ہم نے تمہارے سینے کو کشادگی بخشی ہم نے اور حوصلہ افزائی کی ہم نے وغیرہ وغیرہ۔ باقی آیت کا عطف پہلی آیت پر ہے یعنی کیا ہم نے ایسا ایسا نہیں کیا؟

بعض متصوفین شرح صدر سے علم غیب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی ثابت کرتے ہیں حالانکہ سورۂ انعام وغیرہ میں صاف طور سے اس کی تردید موجود ہے کہ اللہ برترحاکی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محکی عنہ۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ۔ (انعام)۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بذریعہ وحی بھیجا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شرح صدر وسیع المعنی لفظ ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شرح صدر کے معنی روشن و منور کر دیا۔ رحمت و کرم والا بنادیا۔ لقولہ تعالیٰ۔ (فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ الخ) یعنے جسے خدا ہدایت دینا چاہتا ہے۔ تو اس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ جس طرح آپکا سینۂ مبارک کشادہ کر دیا گیا۔ اسی طرح آپ کی شریعت مطہرہ بھی نرمی و کشادگی والی۔ نہایت آسان بنادی۔ کہ جس میں نہ حرج و تنگی ہے۔ اور نہ تکلیف و ترشی نہ سختی وغیرہ۔

تفسیر القرآن بالقرآن میں ہے کہ شرح صدر سے یہ مراد ہے کہ آپ کے سینۂ بے کینہ کو امور رسالت و نبوت کا متحمل بنادیا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں ہے۔ (رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ) یعنے اے رب میرا سینہ کشادہ کر۔ اور میرا کام مجھپر آسان کر۔ اور میری زبان سے گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

حضرت مالک بن صعصعہؓ سے مروی ہے، کہ اس سے معراج شریف کی شب کو حضور انور صلعم کا سینہ شق کیا جانا مراد ہے۔ جسے راز خداوندی کا گنجینہ بنا دیا گیا۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایکمرتبہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ۔ امر نبوت میں سب سے پہلے آپ نے کیا دیکھا
پس آنحضور صلعم سنبھل بیٹھے اور فرمانے لگے ابو ہریرہ۔ میں دس سال کچھ ماہ کی عمر میں جنگل میں کھڑا تھا۔
کہ آسمان کی طرف سے یہ آواز کان میں آئی ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا ہے کیا یہ وہی ہیں۔ پھر دو شخص
میرے سامنے آئے جن کے چہرے ایسے منور تھے کہ اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ اور ایسی خوشبو میں
مہکنے لگیں۔ جو میں نے کبھی نہیں سونگھی تھیں۔ اور وہ ایسے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے
انہوں نے میرے دونوں بازو تھام لئے مگر مجھ کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کہ کوئی میرے بازو تھامے ہوئے
ہے۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ انھیں لٹا دو۔ لہذا مجھے لٹا دیا۔ پھر میرا سینہ شق کرنے کو کہا۔
چنانچہ میرا سینہ چیر دیا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے نہ کچھ دکھ۔ درد محسوس ہوا اور نہ خون وغیرہ نظر آیا
پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس میں سے غل۔ غش۔ حسد و بغض۔ سب نکال دو پس ایک خون بستہ
سی چیز میرے سینہ میں سے نکالی اور پھینک دی۔ پھر کہا کہ اس میں رحمت و رافت بھر دو اور رحم و
کرم سے پر کر دو۔ پس ایک چاندی کی طرح چمکتی ہوئی چیز جتنی نکالی تھی پھر اتنی ہی میرے سینہ میں ڈال دی
اور میرے دائیں پاؤں کا انگوٹھا ہلا کر کہا کہ جائیے اور سلامتی سے زندگی گذاریئے اب جو میں چلا تو میں نے
دیکھا کہ ہر کم عمر کو دیکھکر میرے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ اور بڑی عمر والے کو دیکھ کر رحمت

پھر فرمان باری عز اسمہٗ ہے۔ (وَ وَضَعۡنَا الخ) وضع کے معنی لغت میں۔ الوضع
نہادن۔ رکھنا۔ ترتیب دینا۔ جننا۔ اور بمعنی مطلق کرنا کے بھی آتے ہیں۔ وُضِعَ مجہول بمعنی جُعِلَ۔
بَنَی۔ بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تبلیغ کا ثقل ہم نے تم سے رفع کر دیا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے
ہیں کہ یہ اس معنی کو بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے اور
وہی اللہ برتر آپ کی اور مومنین کی مدد کرتا ہے۔ لقولہ تعالیٰ (هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ
وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ط) (۱۰-۴) اور سورہ روم میں وارد ہے۔ (وَکَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ

اور ایمان داروں کی مدد ہم پر حق ہے۔ انتہی۔

اَلْوِزْرُ کے معنی لغت میں بوجھ اور بدلے کے ہیں چنانچہ صاحب مصباح المنیر نے آیہ کریمہ (لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزْرَ اُخْرٰی) کو تمثیلاً پیش کیا ہے (صہ ۱۴۹ جلد دوم)۔

وَرَفَعْنَا الخ۔ کا مطلب حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جہاں میرا ذکر ہوگا (وہاں پیارے رسول، تیرا ذکر بھی کیا جائے گا جیسے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس کا مطلب یوں فرماتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر جمیل بلند فرما دیا۔ کوئی نمازی اور کلمہ گو ایسا نہیں ہے جو اللہ برتر کی وحدانیت۔ اور نبی اللہ کی رسالت کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔

علامہ حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ میرا اور آپ کا رب فرماتا ہے کہ میں آپ کا ذکر کس طرح بلند کروں۔ حضور انور روحی فداہٗ نے فرمایا اس کا پورا علم تو خدا ہی کو ہے۔ تو حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ رب العزت فرماتا کہ جب میں ذکر کیا جاؤں تو آپ کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں نے اپنے رب سے ایک دفعہ سوال کیا۔ (لیکن اگر نہ کرتا تو اچھا تھا) کہ خدایا مجھ سے پہلے نبیوں میں سے تونے کسی کے لئے ہوا کو مسخر فرمایا کسی کے ہاتھوں مردے زندہ کرا دئے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تم کو یتیم پاکر جگہ نہیں دی۔ اور گم کردہ پاکر ہدایت نہیں کی۔ کیا فقیر پاکر غنی نہیں بنا دیا (حدیث قدسی)۔ میں نے عرض کیا بیشک اور کیا میں نے تیرا سینہ نہیں کھول دیا۔ اور میں نے تیرا ذکر بلند نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا لَا رَیْبَ۔ لَا رَیْبَ۔ یہ ہر سوال کے بعد بطور تسلیم مذکور رہے۔

تفسیر القرآن میں ہے کہ تیری اس آواز کو جو تو نے مکہ اور مدینہ میں بلند کی تھی۔ ہم نے اس کو

نہایت حسن وخوبی کے ساتھ چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔

بقولہٖ تعالیٰ۔ هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ سورۂ توبہ۔ یعنے اسی اللہ نے اپنے رسول کو سچے دین اور ہدایت کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ ہر مذہب وملت کے مقابلہ میں اس کو مُتین کرے اور اس کی برتری جتادے اگرچہ شرک بُرا مانیں۔

ابونعیم رحمۃ اللہ دلائل النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جب میں آسمان وزمین کے اس کام سے فارغ ہوا جو مجھکو میرے رب عز وجل نے عطا کیا تھا تو میں نے عرض کی خداوندا جتنے انبیا مجھ سے اول ہوئے تو نے سبکی تکریم فرمائی کہ ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا موسیٰ علیہ السلام کو کلیم۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے واسطے پہاڑ مسخر فرمادیے۔ اور حضرت سلیمان کے لئے شیاطین اور ہواؤں کو تابع فرمان کردیا۔ حضرت عیسیٰ سے مردوں کو زندہ کرایا۔ پس مجھے کیا عطا فرمایا۔ ارشاد ن۔ باری ہوا۔ کیا میں نے تجھے ان سب سے افضل چیز نہیں دی کہ میرے ذکر کے ساتھ ہی تیرا ذکر بھی ہوتا ہے اور تیری امت کے سینوں کو ہم نے ایسا کردیا کہ وہ میرے کلام قرآن کو ظاہراً پڑھتے ہیں۔ یہ میں نے کسی اگلی امت کو نہیں عطا کیا۔ اور میں نے تجھکو اپنے عرش کے خزانوں میں سے یہ خزانہ دیا (لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اذان ہے۔ کہ پانچ وقت اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے جس کے جواب میں ہم لاحول الخ اور مدنا او اللہ لا قوۃ الخ وغیرہ پڑھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ قصیدہ۔

اَغَرَّ عَلَیْهِ لِلنُّبُوَّةِ خَاتَمٌ ۔۔۔ مِنَ اللّٰهِ مِنْ نُوْرٍ یَلُوْحُ وَیَشْهَدُ

وَضَمَّ الْاِلٰهُ اسْمَ النَّبِیِّ اِلَی اسْمِهٖ ۔۔۔ اِذَا قَالَ فِی الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ اَشْهَدُ

وَشَقَّ لَهُ مِنْ اسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّھٰذَا مُحَمَّدٌ　　(لله دره)

اور بعض محققین کی رائے ہے اگلے پچھلوں سب میں اللہ برتر نے آپ کا نام نامی بلند کیا۔ اور تمام انبیا علیہم السلام سے روز میثاق میں عہد لیا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں اور اپنی اپنی امتوں پر بھی حکم کریں کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ پر ایمان لائیں۔ چنانچہ انجیل میں لفظ فارقلیط آیا ہے جس کا مترادف احمد ہے ایسے ہی تورات میں حضور کے آنے کی بشارت اور پیروی کی تاکید ہے پھر آپ کی امت میں آپ کے ذکر خیر کو شہرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر بھی کیا کریں۔

حضرت صرصری رحمۃ اللہ نے کیا اچھی بات بیان کی ہے کہ فرضوں کی اذان صحیح نہیں ہوتی جبتک کہ آپ کا پیارا نام منہ سے ادا نہ ہو جو ہر طرح پسندیدہ ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمارے فرض و اذان اُسوقت تک مقبول نہیں ہوتے جبتک کہ آپ کا نام خندکر کی طرح دو دو بار نہ لیا جائے۔

شکر حق را کہ پیشوا داریم　　ــــ
پیشوائے چو مصطفےٰ داریم

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے متعلق حافظ ابن جریرؒ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شادان و فرحان تشریف لائے اور تبسم کرتے ہوئے فرمایا ہرگز ایک دشواری دو نرمیوں پر غالب نہیں آسکتی اور پھر آیہ مذکور الصدر تلاوت کی (حدیث مرسل)

لہ یعنی اللہ برتر نے مہر نبوت کو اپنے پاس کا ایک نور بنا کر آپ پر چمکا دیا جو آپ کی رسالت کی گواہ ہے اور اپنے نام کے ساتھ اپنے نبی کا نام بھی ملا لیا۔ جو کہ پانچوں وقت کی نماز میں موذن اشھد ان محمد رسول اللہ کہتا ہے اور آپ کی عزت و جلال کے اظہار کے لئے اپنے نام میں سے آپکا نام نکالا پس دیکھو کہ وہ عرش والا تو محمود ہے یعنی اللہ۔ اور آپ محمد ہیں صلعم۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے اصحاب کو خوشخبری سنائی کہ دو آسانیوں پر ایک سختی غالب نہیں آسکتی۔ از روے علم معانی وغیرہ نکتہ اس میں یہ ہے کہ لفظ عُسر دونوں جگہ معرفہ مذکور ہے۔ لہٰذا وہ مفرد ہوا۔ اور لفظ یُسر نکرہ ہونے سے متعدد تصور کیا گیا۔ مطلب یہ کہ دو آسانیوں کے مقابلہ میں تنگی اپنی کیا ہستی رکھتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ مُعونۃ یعنی امداد خدا وندی بقدر مؤنت آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ مُؤنت کے معنی لغت میں بار بوجھ۔ گرانی محنت۔ رنج۔ توشۂ سفر۔ زاد راہ۔ معاش۔ ما یحتاج مثلاً روٹی کپڑا۔ ضروریات روزمرہ کے ہیں۔ اور صبر مصیبت کی مقدار پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

صَبْرًا جَمِیْلًا مَا اَقْرَبَ الْفَرَجَا مَنْ رَاقَبَ اللہَ فِی الْاُمُوْرِ نَجَا

مَنْ صَدَّقَ اللہَ لَمْ یَنَلْہُ اَذًی وَمَنْ رَجَاہُ یَکُوْنُ حَیْثُ رَجَا [1]

معالم التنزیل وغیرہ میں ہے۔ کہ سختی کے بعد آسانی بشرط صبر ہے۔ حدیث میں بھی ہے کہ صبر کشادگی کی کنجی ہے۔ بقولہ علیہ السلام (اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ) فارسی کا مقولہ ہے ؎

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ حضرت ابوحاتم سجستانی رحمۃ اللہ نے بھی اسی مضمون کو اپنے اشعار میں ادا کیا ہے۔ اور دوسرے ایک شاعر نے بھی کیا اچھا کہا ہے۔

وَلَرُبَّ نَازِلٍ یَضِیْقُ بِہِ الْفَتٰی ذَرْعًا وَعِنْدَ اللہِ مِنْھَا الْمَخْرَجُ

کَمُلَتْ فَلَمَّا اسْتَحْکَمَتْ حَلَقَاتُھَا فُرِجَتْ وَکَانَ یَظُنُّھَا لَا تُفْرَجُ [2]

---

[1] یعنی اچھا صبر کشادگی سے بہت قریب ہے۔ اپنے کاموں میں خدا کا ہی لحاظ رکھنے والا نجات یافتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی باتوں کی تصدیق کرنے والے کو۔ کوئی اذیت نہیں پہنچتی۔ اس سے بھلائی کی امید رکھنے والا اسے امید کے ساتھ ہی پاتا ہے۔

[2] اور بہت سی ایسی مصیبتیں انسان پر نازل ہوتی ہیں جن کے سبب سے وہ تنگ دل ہو جاتا ہے حالانکہ اللہ کے نزدیک ان سے چھٹکارا بھی ہے پس جب یہ مصیبتیں کامل ہو جاتی ہیں اور اس زنجیر کے حلقے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ تو انسان گمان کرنے لگتا ہے کہ بھلا اب کیا مٹے گی۔ کہ اچانک اُس رحیم وکریم کی رحمت جوش میں آکر شفقت آمیز نظریں پڑتی ہیں اور وہ اُس مصیبت کو ایسا دور کر دیتا ہے گویا کہ آئی ہی نہ تھی۔ —

اس کے بعد ارشاد باری عزّ اسمہ ہوتا ہے کہ پیارے رسول جب تو اُمور دنیوی وغیرہ سے فارغ ہو جائے تو دلی توجہ، خلوص نیت اور پوری رغبت کے ساتھ ہماری عبادت و یاد میں مشغول ہو جا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ (فَاِذَا فَرَغْتَ الخ) کی تفسیر فرماتے ہیں کہ جب امر دنیا سے فارغ ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہو تو نہایت محنت کے ساتھ عبادت کر اور مشغولیت کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نماز فرض سے فارغ ہو تو تہجد کی نماز کے لئے کھڑا ہو۔ اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے اپنے رب کی طرف توجہ کر۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نماز کے بعد کی دعا ہے۔

زید بن اسلم۔ وضحاک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ جہاد سے فارغ ہو کر خدا کی عبادت کر۔ اور یہی رائے صاحب تفسیر القرآن کی ہے۔ کہ جب تبلیغ اور جہاد سے فارغ ہو تو نہایت تضرع سے اپنے رب کی یاد کر جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا۔ لقولہ تعالی (وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا) یعنی تو لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق جوق آتا ہوا دیکھے گا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنی نیت و رغبت ہمیشہ خدا ہی کی طرف رکھ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی طاب ثراہ نے اپنی تصنیف لطیف المسمیٰ بہ فوزالکبیر فی اصول التفسیر میں۔ پوری سورہ شریف کا کیا خوب خلاصہ فرمایا ہے۔ "الم نشرح الخ انقض اثقل۔ فَانْصَبْ فی الدعا (صفحہ ۳۵) شان نزول اس سورہ شریف کی یہ ہے کہ بسا اوقات۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتقضاء بشریت بعض امور کی بنا پر۔ ملول و کبیدہ خاطر۔ اور دلگیر ہو جاتے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے لہذا رب العالمین نے رحمۃ للعالمین کی اس طرح تسلی خاطر عاطر فرمائی کہ یہ سورت نازل فرمائی۔

میکانکی اسلام

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے سامنے ہی سامنے وہ ایک دو اور دو سے تین تک پہنچ گئی۔ میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہن انسانی میں بھی کچھ ایسے تدریجاً اور غیر شعوری طور پر رونما ہوتے ہیں کہ جب تک ان کا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا یہ محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آ رہا ہے۔ ذہنی انقلاب کے یہ تخریبی اور تعمیری مراحل دریا کی پرسکون روانیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتداءً زیادہ سے زیادہ نقوش بر آب کی حیثیت رکھتے تھے وہی ایک عرصہ کے بعد ایک محکم حصار سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں۔ ریگستانوں میں آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ صبح ایک صاف و ہموار میدان سامنے تھا شام کو وہاں ریت کا بہت بڑا ٹیلہ کھڑا ہو گیا۔ اور خواہ آپ دن بھر وہاں بیٹھے دیکھتے رہیں کبھی معلوم نہ کر سکیں گے کہ یہ رد و بدل کس انداز سے عمل میں آ رہا ہے

مغرب کی مادیت کا ایک اثر تو وہ تھا جو آتش فشاں دھماکے کے ساتھ مشرق میں رونما ہوا جسے اندھوں نے دیکھا اور بہروں نے سنا یعنی مذہب سے تنفر و بیزاری کا اعلان بآہنگ دھل کیا گیا لیکن اس سے کہیں گہرا کہیں مہیب اور کہیں زہریلا وہ اثر تھا جو گھڑی کی سوئی کی طرح ظاہر ہوا اور جسے تیز سے تیز نگاہ بھی بمشکل بھانپ سکی۔ یہ اثر ان قلوب پر مسلط ہوا جو اگرچہ سعادت و نجات کی راہ مذہب ہی میں سمجھتے تھے لیکن مغربی معقولیت کی حدود بندی نہ کر سکے اور وہ آہستہ آہستہ ان کی سرحد ایمانیات میں بھی گھس گئی۔ اور اس کا زہر ان کے معتقدات کے رگ و پے میں اس خاموشی سے سرایت کرتا چلا گیا کہ آج اگر ان کے مذہبی اصولوں کا بغور مطالعہ کیا جائے

تو معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو وہ آج مذہب کہہ رہے ہیں اسے مذہب سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا زمین کو آسمان سے۔ یہ معقولیت پسندوں کی جماعت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اور ان کا مشن یہ ہے کہ مذہب کے اصول ان کی اپنی عقل کے مطابق یا زیادہ سے زیادہ حکما یورپ کی عقل کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہاں ان کے معتقدات کا استقصار مقصود نہیں لیکن مجملاً یوں سمجھئے کہ:۔

۱۔ خدا ان کے نزدیک ایک ایسی قوت کا نام ہے جو کائنات کے اولین سالمات کی تخلیق کی موجب ہوئی اس کے بعد مخلوقات عالم نے اپنے ارتقائی نشوونما کی منازل طے کر کے اتفاقیہ ایک مستقل نظام کی صورت اختیار کرلی جو ایک غیر متبدل اور اٹل قانون کی شکل میں خود بخود چل رہا ہے۔ اور خدا ایک عضو معطل کی طرح الگ بیٹھا اس کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس کارگہ حیات میں نہ اس کا کچھ فعل ہے نہ ارادہ۔ دنیا چونکہ عالم اسباب ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کامیابی کو اپنی قوت بازو اور حسن تدبیر کی رہین منت سمجھتے ہیں۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ (۳۹: ۵) اور اگر کہیں ناکامی ہوتی ہے تو علت و معلول کی کڑیوں کا معائنہ شروع ہو جاتا ہے، اور اگر کبھی وہ ڈور کچھ ایسی الجھی ہو کہ سرا نہ ملے تو بجائے علت العلل کی طرف نگاہ جانے کے اس ناشدنی واقعہ کو "اتفاق" کے مجہول الکیف نام سے معنون کر دیتے ہیں غرضیکہ زندگی کے کسی شعبہ میں، کاروبار حیات کے کسی گوشہ میں انہیں خدائی ہاتھ کارفرما نظر نہیں آتا۔ اور اگرچہ ہر روز ایاک نستعین سے اس کا زبانی اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً نہ وہ خدا کی مدد پر بھروسہ رکھتے ہیں نہ کسی کام میں اس کی طرف سے خیر و برکت پر ان کا ایمان ہوتا ہے۔

۲۔ رسول کا تصور ان کے نزدیک ایک سیاسی لیڈر۔ ایک مصلح قوم کا سا ہوتا ہے جو اپنی قوم کی نکبت و زبوں حالی سے متاثر ہو کر انہیں فلاح و بہبود کی طرف بلاتا ہے۔ اپنی تدبیر و مصلحت اندیشی سے وہ قوم کی بکھری ہوئی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے ان کی تلواروں کے رخ جو اس سے قبل ان کے اپنے قبائل کی سمت ہوتے تھے دشمنوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کے اندر انضباط و ایثار کی روح پھونک کر زمین کے

بہترین خطوط کا انہیں مالک بنا دیتا ہے۔ اس کی حقیقت قوم کے ایک امیر کی سی ہوتی ہے۔ جس کے ہر حکم کا اتباع اس لئے لازمی ہوتا ہے کہ انحراف سے قوم کی اجتماعی قوت میں انتشار پیدا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وہ دنیاوی نعمتیں جو اس کے حسن تدبیر سے حاصل ہوئی تھیں ان کے چھن جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اس کا حسن تدبیر عقل و حکمت ذہن انسانی کے ارتقار کی بہترین کڑی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول کا بہترین مفکر شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت ریاضت سے بُرائی کی قوتیں اس سے سلب ہوجاتی ہیں۔ اور نیکی کی قوتیں نمایاں طور پر ابھر آتی ہیں۔ انہی قوتوں کا نام ان کے نزدیک ابلیس اور ملائکہ ہے۔

۳۔ قرآن کو وہ ایک بہترین کتاب سمجھتے ہیں صرف اس حیثیت سے کہ اس میں دنیاوی معاشرت کے بہترین اصول مندرج ہیں جن پر کاربند ہوکر مسلمان غلبہ و استیلار کی زندگی بسر کرسکتے ہیں لیکن ایمان کے اس حصہ کے باوصف وہ دنیا کی ہر نئی تحریک کی طرف بڑی بے تابی سے لپکتے ہیں اور ہر نئی "ایتھ" اور ہر نئی "ازم" میں اپنی مصیبتوں کا علاج تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک قرآن کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہی ہوسکتی ہے کہ وہ مغربی حکمار کے نظریوں کی تائید کرتا چلا جائے اس لئے ان کی تمام تر کوشش اسی "جہاد" میں صرف ہوجاتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو ہر نئی تحریک کے مطابق ثابت کردیا جائے۔ اگر طبیعت میں کہیں ادبی ذوق ہوا تو وہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا موازنہ دنیا کے شاعری کی کتابوں سے کرنے لگ جاتے ہیں[1] غرض کہ قرآن کو وہ اسی ماحول کی پیداوار اور اسی زمین کی شاعری سمجھتے ہیں۔

۴۔ مکافات عمل پر ان کا ایمان ہے لیکن اس شکل میں کہ وہ اسی دنیا کو دارالعمل اور اسی کو دارالجزا سمجھتے ہیں۔ جنت و دوزخ کا وجود ان کے نزدیک خود قلب انسانی کے اندر ہی ہے۔ دل کے سکون و طمانیت کا نام جنت۔ اور اس کے اضطراب کی سوزش نہاں کا مفہوم جہنم۔ معاد بھی ان کے نزدیک اپنی قلبی کیفیات کا نام ہے اور حشر سے مقصد ان حیات کا تیز تر ہوجانا ہے۔

[1] معیار کی یہی غلطی تھی جس کی وجہ سے مصر کے مشہور آزاد خیال مسلم ادیب کی نظر میں ... کی کتاب ... بھی ... معلوم ہوئی۔ پرویز

۵۔ ایمانیات کے بعد اعمال و عبادات میں بھی ان کے نظریے کچھ ایسے ہی مصالح پر مبنی ہیں۔ نماز ایک اچھی عبادت ہے لیکن محض اس لئے کہ اس سے پابندی اوقات اور صفائی جسم کی عادت پڑ جاتی ہے۔ باقی رہا خدا کے ساتھ تعلق سو اس کے لئے ان کے نزدیک کسی مخصوص شکل کی ضرورت نہیں۔ دنیاوی مشاغل۔ دفتر کی فائلوں سے تھک کر کرسی سے جھک کے میز پر سر رکھ دیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور بس دل خدا تک پہنچ گیا۔ نماز باجماعت۔ جمعہ۔ عیدین۔ میں صرف ایک اجتماعی منظر دکھلانا مقصود ہے۔ اور حج ان کے نزدیک ایک "آل ورلڈ مسلم کانفرنس" (مؤتمر عالم اسلام) سے زیادہ نہیں۔ زکوٰۃ کی بجائے قومی چندے بہترین نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ روزے سے مقصود طبیعت کو "سپاہیانہ عادت کا خوگر بنانا (یا اکبر بدون کے اشہب عناں گسیختہ کی صیامت) تھا۔ قربانی کی بے فائدہ خونریزی ان کے نزدیک کسی اور شکل میں تبدیل ہو کر بہترین افادی نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اور تو اور۔ جہاد۔ جو درحقیقت اسلام کا دوسرا نام ہے ان کے نزدیک محض تگ و دو حیات میں سعی و کوشش کا نام ہے۔ اور آج کل کونسلوں میں چند نشستیں مخصوص کرا لینا اس فریضۂ عظیم کی سرانجام دہی کی بہترین صورت ہے۔

ایک جملہ میں یوں سمجھئے کہ مذہب ان کے نزدیک اسی زمین سے متعلق ہے اور "آسمان" سے کچھ علاقہ نہیں۔ یہ "میکانکی اسلام" روح اور روحانیت سے اتنا ہی ناآشنا ہے جتنی یورپ کی مشینیں جذبات سے عاری۔

———(٥)———

آئیے اب ان معتقدات کو قرآن کی روشنی میں دیکھیں۔

۱۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ "کارگہ عالم ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہا ہے جسے قانون فطرت کہتے ہیں اور جو بالعموم غیر متبدل اور اٹل ہوتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (۳۵ : ۵)

اور تو اللہ کے دستور کو بدلتا ہوا اور ٹلتا ہوا نہیں پائے گا۔

لیکن یہ قوانین و نظام خود بخود اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آگئے۔ بلکہ ایک حکیم ازلی کے ارادہ و مشیت کے ماتحت وضع ہوئے ہیں، جو ان قوانین کے نافذ کرنے کے بعد خود بے بس و مجبور ہو کر نہیں رہ گیا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۔ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے ثبت کرتا ہے۔ اس کے پاس ام الکتب ہے۔ (۱۳:۳۹)

کون و مکان کے ایک ایک ذرہ میں اس کی مشیت و قدرت کار فرما ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۱:۱۰۷) بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵:۱) حکم کرتا ہے۔

ہر چند کہ یہ مشیت بھی اس کی حکمت و قانون پر مبنی ہے جس کو قوانین قدرت کہتے ہیں لیکن ان قوانین کی کنہ و حقیقت ذہن انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ دنیا کا کوئی دماغ یہ نہیں بتا سکتا کہ شہد میٹھا اور حنظل تلخ کیوں ہے؟ دنیا کو یہ نظام اسی نے عطا کیا ہے اور اس نظام میں تمام امور اسی کے حکم و ارادہ سے سرانجام پاتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۵:۱۲) وہ اللہ ہی ہے جس نے سات بلندیاں اور ان کی مثل پستیاں پیدا کیں ان سب میں اس کا حکم اترتا رہتا ہے تاکہ تم یقین کر لو کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ حصول مقاصد کے لئے جد و جہد انسان کے لئے لازم ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳:۳۹) اور اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ بشرطیکہ نیت بخیر ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی مساعی و محنت کا نتیجہ بھی اسی شکل، اسی نوعیت، اسی عرصہ اور مقدار میں مرتب ہو جو خود انسان نے اپنے ذہن میں مقرر کر رکھا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص بالعموم یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں ایک فرد مکمل اور آزاد

(Independent Unit) ہے۔ لہٰذا امور عالم کا تعین اس کی آرزوؤں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کے اعمال و افعال کا اثر بھی اس کی ذات تک محدود رہنا چاہئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد واحد اس کارخانہ عالم میں عظیم الشان مشنری کا ایک ادنیٰ سا پرزہ ہے جس کی ایک ایک جنبش کا اثر تمام مشنری اور تمام مشنری کی حرکات کا اثر اس پرزہ پر پڑتا ہے اور یہ تمام سلسلہ ایک مشیت کے ماتحت کسی خاص مقصد کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اس لئے اگر ہر انسان کی دنیا اس کی آرزوؤں کے مطابق ڈھل جائے تو نظم و نسق عالم چند دنوں میں تہ و بالا ہو جائے۔ کبھی غور فرمایا کہ آج دنیا میں اس قدر اضطراب و بے تابی یہ عدم طمانیت و فقدان سکون کیوں ہے؟ کیا محض اس سے نہیں کہ ہر شخص اپنا مقصد حیات خود مقرر کئے بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ کھینچ تان کر دنیا اس کی اپنی تمناؤں کا گہوارہ بن جائے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸: ۵۰)　اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت کے بغیر محض اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

ثانیاً انسان کو چونکہ مستقبل کا علم نہیں دیا گیا اس لئے یہ ضرور نہیں کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے بہتر تصور کرتا ہے وہ فی الواقع اس کے لئے بہتر ہی ثابت ہو۔ اس کا صحیح صحیح علم علام الغیوب کے پاس ہے۔ کیونکہ۔

عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲: ۲۶)　یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو لیکن وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور تم ایک چیز پسند کرتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے بری ثابت ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

لہٰذا قوانین فطرت کے دائرے کے اندر کوشش اور جد و جہد یقیناً فرض ہے لیکن اس کوشش کے بعد ترتیب نتائج کے لئے مشیت ایزدی پر ایمان رکھنا بھی لازمی ہے۔ کامیابی و ناکامی میں سلسلہ علت و

معلول کا تجزیہ بھی ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آخری نگاہ۔ اس علت العلل۔ اس مسبب الاسباب ذات پر رکھنی بھی ضروری ہے جس نے علت کو علت اور معلول کو معلول بنایا۔ اس لیے کہ علت و معلول کی حقیقت بھی انسان کو اس سے زیادہ کیا معلوم ہے کہ۔ بقول امام غزالیؒ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ بہترین اسباب و وسائل بہترین قوتیں اور اپنی سمجھ کے مطابق بہترین ذرائع بہم پہونچانے ضروری ہیں۔ لیکن ان سب کے بعد یہ ایمان بھی ضروری ہے کہ۔

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ۔ (۴۰:۵) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگران ہے۔

۲۔ رسول بلاشبہ مصلح اور مدبر ملت ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت دنیاوی مصلحین و مدبرین سے بالکل جدا گانہ ہوتی ہے۔ دنیاوی مفکرین و مدبرین اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور ان کا فلسفۂ اصلاح و بہبود ان کی اپنی پرواز فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کبھی صحیح اور کبھی غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے انبیاء کرام مامور من اللہ ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ اس دنیا میں خاص مشیت باری تعالیٰ کے ماتحت چلتا ہے۔ وہ نہ اپنے ماحول سے متاثر اور نہ احوال و ظروف کے پیداوار ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کا انتخاب مملکت ایزدی سے ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (۶:۱۲۴) اللہ خوب جانتا ہے کہ کسے اپنی رسالت کے لئے منتخب کیا جائے

اور ان کا سرچشمۂ علوم و ہدایت علم باری تعالیٰ ہوتا ہے جس میں کسی سہو و خطا کی گنجائش نہیں ان کا سینہ علوم لدنی سے معمور اور ان کا قلب تجلیات نور ازلی سے منور ہوتا ہے۔ دنیاوی سیاست و تفکر ایک صنعت ہے جو اکتساباً حاصل ہوتی ہے، اور مشق و مہارت سے یہ ملکہ بڑھتا ہے لیکن نبوت ایک موہبت ربانی اور عطائے یزدانی ہے جس میں کسب و مشق کو کچھ دخل نہیں۔ قوم و امت کی ترقی ان کے بھی پیش نظر ہوتی ہے۔ لیکن سب سے مقدم اخلاق انسانی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے حقیقت یہ کہ

ان کی تعلیم و تعمیل کا انداز ہی کچھ ایسا نرالا ہوتا ہے کہ تزکیہ نفوس و قلوب کے ساتھ ساتھ ذہن میں جلا اور بازو میں قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور اس سے ایک ایسی قوم کی تشکیل عمل میں آتی ہے جس کے دائیں ہاتھ میں آسمان کی بادشاہت اور بائیں میں زمین کی مملکت ہوتی ہے۔ اس کا پیغام زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو راستہ دکھانے والا۔ اور قیامت تک کے لئے مطاع ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا.. وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک
وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ (۶۲:۱) رسول بھیجا جو ان کو آیتیں سناتا ہے ان کا تزکیہ نفوس کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اور ان لوگوں کی طرف بھی جو ابھی تک ان میں نہیں ملے۔

اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور اس کی معصیت خدا کی معصیت ہوتی ہے۔

وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (۴:۱۱) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی

اور جو لائحہ حیات اس کی وساطت سے دنیا کو ملتا ہے۔ اس میں کوئی دنیاوی طاقت رد و بدل نہیں کرسکتی بلکہ دنیا بھر کی عقول میں جہاں کہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ بھی اسی کی مشعل ہدایت سے ہوسکتا ہے۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ اگر کسی بات میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس میں اللہ
وَالرَّسُولِ (۴:۸) اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

ان کو خدائی پیغام ملائکہ کی وساطت سے ملتے ہیں۔ جو اگرچہ عالم امر سے متعلق ہونے کی وجہ سے سرحد ادراک انسانی سے بالاتر ہیں لیکن ان کا وجود محض انسان کی ملکوتی قوتیں نہیں ہیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ وہ فرشتوں کو اپنے حکم سے وحی دے کر اپنے بندوں
مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۱۶:۱) میں سے جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے۔

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَ اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے (جسے چاہتا ہے)

مِنَ النَّاسِ (۲۲: ۱۰) بطور قاصد چن لیا ہے۔

اسی طرح سے ابلیس بھی محض طاغوتی قوتوں کا نام نہیں۔ بلکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔

قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۳۸: ۵)۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس (آدم) سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے۔

۳۔ بلا شائبہ تشکیک قرآن ایک کتاب آئین ہے جس کے اصولوں پر کاربند ہو کر ایک قوم اعلیٰ ترین زندگی بسر کر سکتی ہے لیکن اس کی تعلیم کا مقصد وحید محض دنیوی غلبہ و استیلا ہی نہیں بلکہ یہ تو محض ذیلی اثمار (Bye-Products) ہیں۔ اس کی اصل تو انسان کو ان مقاصد عالیہ کے حصول کا راستہ دکھانا ہے جو تخلیق آدم کی اصلی غایت ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷: ۱) بیشک یہ قرآن وہی راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔

قرآنی تعلیم کی رو سے انسان محض اسی دنیا کا جانور نہیں ہے۔ کہ یہاں کی آرایش و زیبایش ہی اس کی اصل زندگی اور مقصد حیات قرار پا جائے بلکہ دنیا تو اس کی منازل حیات کا ایک دھندلا سا تصور اور اس کے شجر زندگی کی ایک تخمی سی شکل ہے۔ تخم میں شجر کا محض ایک تخیل سا نظر آتا ہے بار آوری کی صلاحیت اس میں نہیں ہوتی یہی تخم ایمان و عمل کی آبیاری سے آیندہ زندگی میں شجر کی صورت اختیار کرے گا۔ اسلام نے ایمان و عمل صالح کے نتائج میں سے دو چیزیں قرار دی ہیں۔ ایک تو یہ کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۴: ۷) اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے ہیں وہ زمین میں خلافت عطا فرمائیگا

دوسرے یہ کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ نے

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۵ : ۲) وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

باوصف اس امر کے کہ اس دنیا میں عزت و وقار غلبہ و استیلا کی زندگی کا وعدہ ایمان و عمل صالح سے مشروط کر رکھا ہے۔ قرآن بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ کہیں مقصود بالذات اس دنیا کی زندگی کو قرار نہ دے دینا۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ دنیا کی یہ زندگی تو ایک کھیل تماشے سے زیادہ نہیں
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹ : ۷) فی الحقیقت زندگی کی جگہ تو آخرت ہے۔ [۱]

ہاں تو قرآن۔ انسان کو اس زندگی کے لئے تیار کرتا ہے۔ جو زندگی کہلانے کی مستحق ہے۔

اس کے اصول ایسے اٹل اور اس کی بنیادیں ایسی محکم ہیں کہ دنیا کے نظریئے بنیں اور بگڑیں انجشافات پیدا ہوں اور مٹ جائیں لیکن اس کے حقائق روشنی کے مینار کی طرح مستحکم کھڑے ہیں کہ انقلابات ذہنی کی موجیں اٹھیں اور ٹکرا کر معدوم ہو جائیں

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (۱۱ : ۱) ایک کتاب۔ جس کی آیتیں پختہ بنائی گئی ہیں۔

قرآن کے لئے یہ بات ذرا بھی قابل فخر نہیں کہ دنیا کی کوئی "ازم" اور کوئی "ایت" اس کی تعلیم کے مطابق ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ۔

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۔ (۶۹ : ۲) وہ تو حق الیقین ہے۔

بلکہ یہ بات خود اس "ازم" اور "ایت" کے لئے طرۂ امتیاز ہو گی کہ بارگاہ قرآنی سے اس کے

---

[۱] اگرچہ قرآن حکیم میں حیات انسانی کے منتہی کی نسبت کھلے کھلے الفاظ میں صراحت نہیں کی گئی لیکن بعض اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ جنت بھی جو بالعموم منزل مقصود سمجھی جاتی ہے۔ درحقیقت اصل منزل مقصود نہیں بلکہ راستہ کا ایک خوشنما منظر ہے چنانچہ اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے۔ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۲ : ۳) اور جنتیوں کو پاکیزہ قول کی ہدایت کی جائیگی اور صراط حمید کی راہ دکھائی جائے گی۔ پھر ان کی یہ دعا قرآن میں موجود ہے:۔
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (۲۶ : ۲) کہیں گے اے اللہ ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔
پھر منتہی کیا ہے؟۔ یہ راز۔ راز ہی رہے تو اچھا ہے۔ غم دل بگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد۔ بہرکیف اسی دنیا کو منتہی قرار دے لینا تو بڑی تنگ ظرفی ہے۔ پرویز

حق ہی تائید ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ یہ

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (۲: ۲۳) — جملہ انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے کی دلیلیں ہیں۔

دنیاوی اصول خاص خاص قوموں کے لئے اور ان کے بھی خاص خاص حالات کو پیش نظر رکھکر وضع کئے جاتے ہیں لیکن قرآنی اصول قیامت تک کے لئے ماخذ العمل اور دنیا بھر کے انسانوں کے لئے شمع ہدایت ہیں۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (۸۱) — یقیناً یہ تمام اہل عالم کے لئے ہدایت ہے۔

۴۔ ہاں! یہ بھی درست ہے کہ بعض اعمال کی سزا یا جزا اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے۔

لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ۔ (۱۰: ۱۰) — جب یہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے دور کر دیا اور انھیں کچھ مدت کے لئے سامان حیات دیدیا۔

لیکن اصل دار المکافات اخروی زندگی ہی ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۹۷-۱۶) — صاحب ایمان مرد و عورت میں سے جو کوئی بھی عمل صالح کرے گا اسے ہم (اس دنیا میں) حیاتِ خوشگوار عطا فرمائیں گے۔ اور ان کے ان بہترین اعمال کا اجر (اخروی دنیا میں بھی) دیں گے۔

اس سے بھی واضح تر یہ ارشاد ہے:۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ (۱۳: ۵) — کفار کے لئے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا تمام تر عمل اور ابتلا کا مقام ہے تخم ریزی اور بار آوری میں جو لازمی وقفہ چاہیئے

وہ پورا کرنے کے لئے ایک وقت معین تک مہلت دی جاتی ہے۔ اور حقیقی بارآوری کا وقت حیات اخروی ہی ہے

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (۱۶: ۸)

اگر اللہ انسانوں کو ان کے ظلم کے بدلے میں (فوراً) گرفتار کرلیتا۔ تو زمین پر کوئی جاندار باقی نہ رہتا لیکن وہ ان کو مہلت دیتا ہے ایک وقت معین تک [۱]

یہ بھی صحیح ہے کہ اطمینان قلب بڑی چیز ہے اور نعماء جنت میں سب سے بڑی نعمت نفسِ مُطمئِنّہ ہے نیز اضطراب قلبی بھی ایک سخت عذاب ہے لیکن جنت وہ وزخ اور معاد کی تمام تفصیلات کو جو قرآن میں مذکور ہیں محض قلب انسانی کے اندر محیط کر دینا بھی درست نہیں۔ دوسری زندگی کے متعلق قرآن میں بڑی تکرار واعادہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ احیاء بعد الموت کے متعلق ارشاد ہے۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (۲: ۳) تم مردہ تھے پھر تمہیں اللہ نے زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مار دیگا پھر زندہ کریگا۔

یہ پیدائش کیسی ہوگی؟ ارشاد ہے:-

كَمَا خَلَقْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (۲۱: ۷) جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا کیا تھا اسیطرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نعمائے جنت اور عقوبات جہنم کی تفاصیل تمثیلی رنگ میں بیان ہوئی ہیں کیونکہ یہ بعد الطبیعات سے متعلق ہیں لیکن اس تمام تفصیل کے ایک ایک جزو پر ہمارا ایمان اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح قرآن میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اور جس حقیقت کا راز خود اللہ تعالیٰ نے نہیں کھولا اس پر تاویلات سے قطعیت کا حکم نہیں لگانا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے اور کس قدر زور دار الفاظ میں کہتا ہے کہ۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (۵۱: ۱)

آسمان وزمین کے پروردگار کی قسم قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایسا ہی حقیقی واقعہ ہے جیسا تمہارا باتیں کرنا واقعہ ہے

---

[۱] اور یہ وقت معین ہے روز محشر کا۔
اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (۲: ۱۷) آج کے دن (یوم محشر) ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائیگا آج کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

۵۔ یہ بھی درست ہے کہ عبادات میں بدنی اور معاشرتی مفاد بھی ساتھ ہی ساتھ آجاتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان عبادات سے مقصود بالذات یہی بدنی و معاشرتی مفاد ہیں۔ انسان کے ساتھ مختلف تعلقات وابستہ ہیں۔ ایک خالق کا، ایک اپنے نفس کا اور ایک مخلوق کا۔ اسلامی احکام میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ ان کی بجاآوری میں بیک وقت ہر سہ فرائض کی ادائگی ہو جاتی ہے۔ یعنی رضائے مولیٰ حفظ نفس اور ہمدردی خلائق کا حصول ایک ہی عبادت کی سرانجام دہی میں ہو جاتا ہے اور یہی ہم آہنگی ہے جو اسلامی احکام کے سوا اور کہیں نظر نہ آئے گی ان میں مقدم خوشنودی باری تعالیٰ ہے اور یہی چیز ہے جسے تقوی کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی بغیر کسی قسم کی ذاتی غرض و منفعت کو پیش نظر رکھنے کے محض اس خلوص نیت سے کہ جو کچھ کر رہا ہوں محض خدا کے کر رہا ہوں عمل کرنا روح اسلام اور تقوی کا مدعا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ کہدے کہ میری نماز، میری قربانیاں، میری زندگی میری موت سب اللہ کیلئے ہے۔

یہ ہے نقطۂ اسکہ تمام عبادات و اعمال اسلامی کا۔ اگر کوئی عمل اس معیار پر پورا اترتا ہو تو اس کے لازمی نتائج و اثمار خواہ اپنی ذات کے لئے ہوں خواہ مخلوق کیلئے سب حلال و طیب لیکن اگر اس کے خلاف ہو تو وہ عمل لاکھ منافع در آغوش کیوں نہ ہو سب حرام و خبیث۔ نماز کے متعلق یہ کہدیا کہ۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔ نماز فواحش اور برائیوں سے روکتی ہے۔

لیکن اس مرکز کو سامنے سے نہیں ہٹنے دیا کہ۔

اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ بیشک نماز گراں گزرتی ہے لیکن ان لوگوں پر نہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں

روزہ فرض کرتے وقت اول و آخر یہ ارشاد فرمایا کہ۔

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم میں تقوی پیدا ہو۔

زکوٰۃ کی دنیاوی منفعتوں سے کسے انکار ہے لیکن علت غائی وہی ہے کہ۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔
ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو اور اس طرح ان کے اموال وقلوب کو مطہر و پاکیزہ بنادو۔

اور ساتھ ہی یہ تھدید بھی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (۶:۴)
اور اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے مال کو محض دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے

گویا ریاء اور کفر مترادف ہیں ۔

حج اور قربانی میں بھی یہی علت کارفرما ہے کہ یہ دونوں شعائر اللہ کو قائم رکھنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال کہ چونکہ مقصود ان عبادات سے دُنیوی منافع ہیں اس لئے یہ مقاصد کسی اور شکل میں حاصل کرلئے جائیں یکسر غلط اور گمراہ کن ہے مقصد اولی ان سے تقوی اور رضات اللہ ہے اور یہ محض اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے متعین فرمادی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا ردو بدل قطعًا ناقص ہے۔

قوم کی اقتصادی و معاشرتی اصلاح اور سیاسی و تمدنی زندگی کے بقا کے لئے جو قدم بھی اٹھایا جائے لائق صد تحسین ہے۔ اس لئے کہ ذلت اور رسوائی کی زندگی قرآن کی رو سے غضب الٰہی کی نشانی ہے

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔
ان پر ذلت و مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب میں آگئے

اور عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا عین امتیاز ایمان ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰۶۳)
عزت تو بس اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے

یہی نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح کا لازمی نتیجہ خلافت فی الارض ہے لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے محض دنیا کے کسی مقصد کا حصول۔ خواہ وہ کتنا ہی جلیل المنزلت کیوں نہ ہو۔ مسلمان کی ساعی و توجہ کا

آخری نقطہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مقصد تو دنیاوی عروج کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا حصول بھی ہے۔ لہٰذا جس پروگرام میں
محض دنیا ہی دنیا ہو اور تقویٰ اور تزکیۂ قلوب کا خیال نہ رکھا گیا ہو وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ ایسی تقویٰ سے رہے
بے غرض قربانی۔ ایثار لمرضات اللہ کا نام جہاد ہے۔ خواہ اس کے لئے ایک قدم اٹھانا پڑے یا جان تک بھی دینی پڑے
حکایات دراز تر ہوگئی اس لئے ان اسباب و ذرائع کی تفصیل کو نظر انداز کرتا ہوں جو اس تجدد و مذہب کے موجب ہوئے ہیں
لیکن ان میں سے ایک اہم ترین سبب کا ذکر نہایت ضروری ہے اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دور جدید کی اسلامی
معلومات کا ماخذ قرآن و سنت نہیں بلکہ مستشرقین مغرب کی تصانیف ہیں اور یہی سب سے بڑی وجہ اس ذہنی انقلاب کی ہے
ان مستشرقین کے علمی احسانات اسلام پر خواہ کسی قدر کیوں نہ ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یا تو شاید اس لئے
کہ وہ خود اس لم تک نہیں پہنچ سکے، یا دانستہ، بہرکیف وہ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس زاویہ نگاہ سے لکھتے ہیں
کہ اسلام کو ایک کامیاب "ارضی تحریک" ثابت کر دیا جائے۔ وہ یوروپین مصنف جنہوں نے حضور نبی اکرم صلعم کی ذات گرامی
کے متعلق حسن عقیدت کا اظہار کیا ہے ان کے خیالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کھل جائے گی کہ انہوں نے بھی
حضور صلعم کو زیادہ سے زیادہ ایک دنیاوی مصلح۔ کامیاب لیڈر۔ اور اولوالعزم فاتح کی حیثیت سے سمجھا ہے یا پیش کیا ہے
یہی حال قرآن کے متعلق ان کے خیالات کا ہے۔ ایک تو ہم ویسے ہی ان مستشرقین کی تحقیقات علمی سے مرعوب ہو چکے ہیں۔
پھر ان کا انداز بیان کچھ ایسا ساحرانہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کی تعلیم ہم پر پورا پورا اثر کر دیتی ہے اور ہم اسلام کو انہیں کی
عینک سے دیکھنے لگ جاتے ہیں[1]۔ ایمانیات کا صحیح ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر ایک مسلم کی
دینی و دنیوی عمارتیں استوار ہوں گی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر مذہب کا مطالعہ کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ
کی روشنی میں کریں اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ اسلام کے پیش نظر جہاں "کلیسا کے راہب" پیدا کرنا نہیں وہاں
محض سکندر اعظم بھی اس کا مطمح نگاہ نہیں۔ وہ ان دونوں کے امتزاج سے "عمر فاروق" کا ہیولیٰ تیار کرتا ہے۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ

---

[1] ان محققین کی یہ سعی محض قیاسیات پر مبنی ہوتی ہے جس کے اتباع کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ۔
وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ - (۴:۶)
اگر تو دنیا کے اکثر لوگوں کی اطاعت کرے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور محض تخمینے دوڑاتے ہیں
اور قرآن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ۔
اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ - (۶۹ : ۲)، یقیناً وہ حق الیقین ہے۔ (ظن و قیاس نہیں) پرویز۔

قرآن اور حدیث

منکرین حدیث کے مسلمات پر ایک ناقدانہ نظر

(۳)

منکرین حدیث کے مقالات پر نظر کرتے ہوئے انکار حدیث کی دو وجوہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کے نظام دینی میں سرے سے حدیث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف قرآن کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ احادیث ناقابل اعتبار ہیں۔

ان میں سے پہلی وجہ کا جواب پچھلے نمبر میں دیا جا چکا ہے۔ رہی دوسری وجہ، تو اس کی غلطی بھی اشارۃً گذشتہ صحبت میں ظاہر کی جا چکی ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس شبہ کو بھی تفصیل کے ساتھ رفع کردیا جائے۔

احادیث کو ناقابل اعتبار سمجھنے کی اصل وجہ وہم اور شک کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے۔ انسان کی فطرت میں شک کا مادّہ اسلئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ بحث و تحقیق اور تلاش و تجسس کے لئے متحرک ہو، اور حقیقت کی جستجو پر انسان کو ابھارے لیکن ہر چیز کے لئے ایک حد ہوتی ہے جس سے گھٹنے یا بڑھ جانے پر وہ مستحسن نہیں رہتی۔ شک کا مادّہ اگر اتنا کم ہوجائے کہ آدمی ہر چیز کو بلا تحقیق تسلیم کرے، تو یہ ضعیف الاعتقادی ہے جو ایک مذموم صفت ہے۔ اسی طرح شک اگر اتنا بڑھ جائے کہ تحقیق کے ان طریقوں سے جو انسان کے امکان میں ہیں، اس کو مطمئن نہ ہونے دے اور ان تمام باتوں سے انکار پر آمادہ کردے جو تحقیق کے ایک غیر ممکن الحصول معیار پر پوری نہ اترتی ہوں، تو یہ بھی ایک مذموم صفت ہے جس کو اردو زبان میں "وہمی پن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہے جس سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے، اور علم یقین کے بغیر بات کو

ماننے سے انکار کر دے، تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہیگا بلکہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ مثال کے طور پر میں نے آج تک کبھی کسی شخص کو سانپ کے کاٹے سے مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ خود مجھے سانپ نے کاٹا کہ اس کے مہلک ہونے کا مجھ کو علم یقین حاصل ہوتا۔ میں نے صرف لوگوں سے یہ سنا ہے کہ جب سانپ کاٹتا ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ میں اس روایت پر یقین رکھتا ہوں، اور سانپ کو دیکھ کر اس سے بچ جاتا ہوں۔ لیکن اگر میں اس روایت میں شک کروں، اور کہوں کہ جب تک سانپ میرے سامنے کسی کو نہ کاٹے اور اسی کی تاثیر سے وہ میرے سامنے مر نہ جائے، یا جب تک سانپ خود مجھ کو نہ کاٹے اور میں اس کے زہر سے نہ مرجاؤں، اس وقت تک میں یقین نہ کروں گا کہ سانپ مہلک ہوتا ہے، تو میرے اس شک کا جو کچھ انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔

یہ تو خیر روایت متواترہ کی مثال ہے جس کے مفید یقین ہونے کو عموماً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ہماری زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اخبار آحاد (یعنی ایک دو راویوں کی دی ہوئی خبروں) کو تسلیم کرتے ہیں، اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا مدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی حیثیت سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لئے محض خبر کے خبر ہونے ہی پر نظر نہیں رکھتے، بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں، اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی تسلیم کرنے کے لئے ہم طیار نہیں ہوتے۔ مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے، صرف اپنی ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبر واحد میں جس کے لئے کوئی دوسرا شاہد سرے سے مل ہی نہیں سکتا، نفس خبر ہونے کی حیثیت سے صدق و کذب کا یکساں احتمال ہے، لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے طیار نہ ہوگا، خواہ واقعہ کے اعتبار سے اسکا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی ہم اسی طرح اخبار آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں، اور اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے، لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے۔ قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گذرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے اور بہت کم واقعات بلکہ شاذ و نادر ایسے ہوتے ہیں جن میں شہادتیں تواتر کی حد کو پہنچی ہوں۔ بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف "اخبار آحاد" پیش ہوتے ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے، اور جب کوئی پہلو راجح ہوجاتا ہے، تو اس پر وہ اس طرح فیصلہ کرتا ہے، جیسے اس کے نزدیک واقعہ یقین کی حد تک ثابت ہوگیا ہے۔ اگر کوئی جج ہر شاہد کو جھوٹا اور ہر شہادت کو غلط فرض کر کے اپنا کام شروع کرے، اور ہر واقعہ کو تسلیم کرنے کے لئے اصرار کرے کہ یا تو واقعہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے یا متواتر روایات اس تک پہنچیں، تو یقیناً چند ہی ساعتوں میں اس کو عدالت کی کرسی چھوڑ دینی پڑیگی۔

اسی طرح تجارت، تدبیر سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبار آحاد پر سارے معاملات چلتے ہیں۔ بلکہ بہت سی خبریں تو ہم کو تار اور اخبارات کے ذریعہ سے ملتی ہیں جن کی صحت میں عقلاً بہت سے شکوک و شبہات کی گنجایش ہوتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس شخص نے ہم کو تار دیا ہے وہ درحقیقت وہی شخص ہے جس کا نام تار پر لکھا ہوا ہے۔ اور اگر تار فی الواقع اسی کا دیا ہوا ہے تب بھی ہم کو نہیں معلوم کہ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ اسے کس ذریعے سے معلوم ہوئی؟ اور اس کا ذریعہ معتبر ہے یا نہیں؟ اس قسم کے بہت سے احتمالات ہر تار کی خبر میں ہوتے ہیں لیکن جن لوگوں کا سارا کاروبار انہی خبروں پر چلتا ہے،

وہ ان احتمالات کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں محض ظاہری قرائن سے یہ جانچ لیتے ہیں کہ تار انہی کے ایجنٹ کا دیا ہوا ہے، یا نہیں؛ اور جب ایک ظن غالب ان کو حاصل ہو جاتا ہے، تو اس پر اپنے لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔

یہی صورت مذہبی معاملات میں بھی ہے۔ سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے قرآن مجید ہے۔ اس کتاب کا کلام الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے، اور وہ گواہ ذات رسالت پناہ ہے نفس خبر ہونے کے لحاظ سے اس میں بھی صدق و کذب کا احتمال ہے لیکن خبر جس گواہ نے دی ہے اس کی راست بازی، دیانت، پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر، اور جو خبر اس نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم کذب کے پہلو پر صدق کے پہلو کو راجح قرار دیتے ہیں، اور پھر یہی ترجیح ایمان بن کر ہمارے قلب میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ کذب کا تصور بھی آنے نہیں پاتا لیکن دوسری طرف بہت سے لوگ ہیں جنہیں اس شاہد امین کی شہادت میں شک ہے، اور اسی شک کی بنا پر وہ اس کی تصدیق سے انکار کر دیتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ایک راست باز گواہ کی گواہی کو تسلیم کیا اور مسلمان ہو گئے، انہوں نے اس کی گواہی میں شک کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ وحی اترتے ہوئے نہ ہم نے دیکھی اور نہ انہوں نے۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بالعموم اوسط درجہ کے انسان اپنی زندگی کے معاملات میں نہ اتنے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں کہ ہر خبر کو بلا تحقیق و تفتیش قبول کر لیں اور نہ اتنے شکی اور وہمی ہوتے ہیں کہ ہر خبر کی صحت اور ہر راوی کی صداقت میں شبہ کریں، اور ہر معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لئے اس علم یقین کا مطالبہ کریں جو صرف تجربہ و مشاہدہ یا روایت متواترہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان عقل سلیم اور معتدل فطرت رکھنے والے انسانوں کا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ خبروں اور روایتوں کو امکانی ذرائع تحقیق سے کام لے کر جانچتے ہیں، اور اس جانچ پڑتال میں اگر ان کے غلط

ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) ہوتا ہے تو انہیں رد کر دیتے ہیں، اور اگر ان کے صحیح ہونے کا گمان غالب (نہ کہ یقین) حاصل ہو جاتا ہے تو ان کو قبول کر کے انہی کے مطابق عمل کرتے ہیں تحقیق اور جانچ پڑتال کا معیار بھی تمام خبروں کے لئے یکساں نہیں ہوتا بلکہ اس کے سخت اور نرم ہونے کا انحصار خبر کی نوعیت اور اس معاملہ کی اہمیت پر ہوتا ہے جس سے اس خبر کا تعلق ہے۔

یہ تو اس مسئلہ کی علمی حیثیت تھی اب اگر آپ عقلی حیثیت سے بھی غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی اعتدال کا طریقہ عین مطابق عقل ہے، اور اس کے خلاف ضعیف الاعتقادی اور وہمی پن دونوں خلاف عقل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عقل کے نزدیک ہر واقعہ میں شک کرنا ممکن ہے، حتی کہ محسوسات اور بدیہیات تک میں بھی شک کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ لازم نہیں کہ ہر وہ فعل جو کیا جا سکتا ہو، اس کا کرنا عقل کے نزدیک درست اور احسن بھی ہو۔ مزید برآں عقل ہر خبر کے متعلق صرف یہ حکم لگاتی ہے کہ اس میں صدق اور کذب کا یکساں احتمال ہے یعنی محض خبر ہونے کی حیثیت سے وہ سچ اور جھوٹ ہونے کا مساوی امکان رکھتی ہے اور جب تک کوئی معقول وجہ کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے کے لئے موجود نہ ہو، کسی خبر کو نہ سچ کہا جا سکتا ہے اور نہ جھوٹ۔ لیکن کوئی خبر ہم کو محض خبر ہونے کی حیثیت سے نہیں پہنچتی بلکہ اس کے ساتھ لازماً بہت سے ایسے قرائن بھی ہوتے ہیں جن سے تصدیق یا تکذیب کی جانب پلڑا ضرور جھکتا ہے۔ خالص شک کا مقام یعنی جہاں نہ تصدیق ہو اور نہ تکذیب، ایک ایسا باریک مقام ہے کہ انسان کا ذہن چند لمحے بھی اس پر نہیں ٹھیر سکتا، اس لئے ہر خبر کو سنتے ہی ذہن فوراً ایسے وجوہ تلاش کرنے لگتا ہے جن سے مدد لے کر وہ شک کے مقام سے تصدیق یا تکذیب کی طرف جائے، اور یہ بات بالکل ذہن کے سلیم یا مریض ہونے پر موقوف ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو معقول وجوہ کے ساتھ ترجیح دیتا ہے یا غیر معقول وجوہ کے ساتھ۔ کسی خبر کا متواتر نہ ہونا، یا خبر واحد ہونا عقلاً اس کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ اس کے غلط ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔ نہ یہ بات کسی خبر کو جھوٹ قرار دینے کے لئے کافی اور معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہے اور

ہم تک بہت سے واسطوں سے پہنچی ہے۔ نہ کوئی صاحب عقل آدمی یہ فرض کرسکتا ہے کہ ہر مخبر جھوٹا ہوتا ہے اور نہ یہ کہ تمام مخبر آپس میں متفق ہوکر جھوٹی خبریں دینے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اس قسم کے تمام مفروضات جو منفی ذہنیت رکھنے والوں کے دل و دماغ پر مسلط ہوجاتے ہیں، اور جن کی بنا پر وہ ہر خبر کی تکذیب کی طرف مائل ہوجایا کرتے ہیں، قطعاً خلاف عقل ہیں، اور اسی طرح اس کے برعکس جن مفروضات کی بنا پر بغیر اور ہر مخبر کی تصدیق کی جاتی ہے، وہ بھی عقل کے مطابق نہیں ہیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان صحیح راستہ جو ایک سلیم الفطرت ذہن اختیار کرے گا وہ یہی ہے کہ وہ مجموعاً تمام خبروں کی نہ تصدیق کرے گا اور نہ تکذیب۔ بلکہ ہر خبر کو فرداً فرداً لے کر اس کے مخصوص حالات کے لحاظ سے تحقیق و تفتیش کے ایک خاص معیار پر جانچے گا اور جب اس تحقیق کے ذریعہ سے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف گمان غالب حاصل ہوجائے گا تو وہ اسی پہلو کا حکم لگادیگا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کسی خبر کی تحقیق کا سخت سے سخت قابل عمل معیار کیا ہوسکتا ہے؟ فرض کیجیئے کہ ایک شخص زید اب سے سو برس پہلے گذرا ہے، جس کے متعلق عمرو ایک روایت آپ تک پہنچاتا ہے۔ آپ کو تحقیق کرنا ہے کہ زید کے متعلق یہ روایت درست ہے یا نہیں؟ اس غرض کے لئے آپ حسب ذیل تنقیحات قائم کرسکتے ہیں:-

۱- یہ روایت عمرو تک کس طریقے سے پہنچی؟ درمیان میں جو واسطے ہیں ان کا سلسلہ زید تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ درمیانی راویوں میں سے ہر راوی نے جس شخص سے روایت کی ہے اس سے وہ ملا بھی تھا یا نہیں؟ ہر راوی نے روایت کس عمر اور کس حالت میں سنی؟ روایت کو اس نے لفظ بلفظ نقل کیا یا اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کیا؟

۲- کیا یہی روایت دوسرے طریقوں سے بھی منقول ہے؟ اگر منقول ہے تو سب بیانات متفق ہیں یا مختلف؟ اور اختلاف ہے تو کس حد تک؟ اگر کھلا ہوا اختلاف ہے تو مختلف طریقوں میں سے کونسا

طریق روایت زیادہ معتبر ہے؟

۳۔ جن لوگوں کے واسطے سے یہ خبر پہنچی ہے وہ خود کیسے ہیں؟ جھوٹے یا بددیانت تو نہیں؟ اس روایت میں ان کی کوئی غرض تو مخفی نہیں؟ ان میں صحیح یاد رکھنے اور صحیح نقل کرنے کی قابلیت تھی یا نہیں؟

۴۔ زید کی افتادِ طبع اس کی سیرت اس کے خیالات اور اُس کے احوال کے متعلق جو مشہور و متواتر روایات یا ثابت شدہ معلومات ہمارے پاس موجود ہیں، یہ روایت ان کے خلاف تو نہیں ہے۔

۵۔ روایت کسی غیر معمولی اور بعید از قیاس امر کے متعلق ہے یا معمولی اور قرین قیاس امر کے متعلق؟ اگر پہلی صورت ہے تو کیا طُرقِ روایت اتنے کثیر مسلسل اور معتبر ہیں کہ ایسے امر کو تسلیم کیا جاسکے اور اگر دوسری صورت ہے تو کیا روایت اپنی موجودہ شکل میں اس امر کی صحت کا اطمینان کرنے کے لئے کافی ہے؟

یہی پانچ پہلو ہیں جن سے کسی خبر کی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ ان سوالات کے متعلق اگر ذرائع تحقیق ہمارے پاس موجود ہوں اور ان ذرائع سے کوئی خبر تحقیق کے معیار پر پوری اتر جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی تکذیب کریں۔ اور اگر کوئی خبر اس معیار پر پوری نہ اترے تو ہم کو حق ہے کہ خواہ اس کی تکذیب کریں، یا اس کو رد کردیں۔ لیکن اگر ذرائع تحقیق موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص فرداً فرداً ہر خبر کو جانچنے اور اس کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے تمام خبروں کو مجموعاً محض اس بنا پر رد کردے یا جھوٹ قرار دے کہ ان میں بعض جعلی خبریں ملی ہوئی ہیں، یا بعض راویوں کی کمزوریاں ثابت ہیں، یا بعض خبریں اس شخص کی عقل میں نہیں سماتیں، تو اس سے بڑھ کر غیر معقول طرز عمل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اس تمہیدی بیان نے معاملہ کو بالکل صاف کردیا ہے۔ اگر کوئی شخص ذات رسالت پناہ کے اسوۂ حسنہ اور سنت مطہرہ سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہ چاہتا ہو، تو یہ ایک دوسری بات ہے لیکن اگر وہ آنحضرؐ کی تقلید فرض سمجھتا ہے، اور اسے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ نے اپنی ۲۳ سال کی حیات نبوی میں

کس طرح زندگی بسر کی؟ کونسے افعال کئے؟ کن افعال سے اجتناب کیا؟ کن باتوں کو جائز رکھا؟ کن باتوں سے منع فرمایا؟ تو لامحالہ اس کو حدیث کے ذخیرہ کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔ یہاں وہ دیکھے گا کہ اس وقت بھی دنیا میں کم و بیش چار پانچ لاکھ آدمی ایسے موجود ہیں جن کے پاس حدیث کی کتابیں امام مالک، امام محمد، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل، امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث سے سلسلہ بسلسلہ پہنچی ہیں، اس لئے اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتابیں انہی بزرگوں کی لکھی ہوئی ہیں، پھر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں پایا جاسکتا کہ ان بزرگوں نے حدیث کی جو سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام تک پہنچائی ہے وہ کم از کم ان کی تحقیق کے لحاظ سے درست تھی۔ لہٰذا ان کتابوں کے ذریعہ سے حدیث کا وہ علم قریب قریب یقینی طور پر ہم تک پہنچ گیا ہے جو پہلی دوسری تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے ائمہ حدیث کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے متعلق وہ تمام معلومات بھی معتبر کتابوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ گئی ہیں جن سے کام لے کر محدثین نے حدیثوں اور ان کے راویوں کے حالات کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اور پھر ہم نے ایک خبر کی تحقیق کے لئے جو تنقیحی سوالات قائم کئے ہیں ان میں سے ہر سوال کا مفصل جواب قریب قریب ہر حدیث کے متعلق ہم کو ان کتابوں میں مل جاتا ہے، اور محدثین کے درمیان احادیث اور ان کی تحقیق کے بارے میں جو اختلافات آرا رہے ہیں وہ بھی تمام دلائل اور وجوہ کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اس وسیع، مفصل، اور زیادہ سے زیادہ امکانی وثوق رکھنے والے ذخیرہ کے موجود ہوتے ہوئے کوئی صاحب عقل انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی واقعہ اور آنحضرت کا کوئی ارشاد آج دنیا میں صحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کو سب سے پہلے ثابت کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت سے لیکر ہمارے زمانہ تک جو لاکھوں سے متجاوز اور کروڑوں تک پہنچے ہوئے مسلمان احادیث نبوی کے نقل کرنے اور سننے سنانے میں مشغول رہے ہیں، وہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر جھوٹے تھے اور انہوں نے بالاتفاق یہ طے کرلیا تھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت گھڑنے اور اس طریقے سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کو تباہ و برباد کرنے ہی میں اپنی ساری عمر بسر کرینگے۔ اگر کوئی منکر حدیث اس امر کا ثبوت رکھتا ہے تو وہ اس کو پیش کرے ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ ساری دنیا کے محققین اور مکتشفین کے کارنامے اسکی اس نادر تحقیق کے سامنے دب جائینگے لیکن اگر اس کے پاس بدگمانی اور جھوٹے الزامات، اور کل پر بعض کا حکم لگانے کے مغالطہ انگیز اور خلاف عقل و دیانت طریقوں کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتا ہو تو اسے کم از کم یہ امید نہ رکھنی چاہیئے کہ جن لوگوں کی عقل درست ہے اور جو فطرت سلیم سے بہرہ ور ہیں، وہ بھی اس کے دعوے کو تسلیم کر کے حدیث کی ساری خبروں کو مجموعی حیثیت سے غلط اور قابل رد قرار دیدیں گے۔

ہم نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی کہ ہر شخص کو ائمہ حدیث کی اندھی تقلید کرنی چاہیئے یا ان کو غلطی سے مبرا سمجھنا چاہیئے۔ نہ کبھی ہم نے یہ دعویٰ کیا کہ ہر کتاب میں جو روایت قال رسول اللہ سے شروع ہو اس کو آنکھیں بند کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مان لیا جائے۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی حدیث کو حدیث رسول قرار دینے کی ذمہ داری ایک گران بار ذمہ داری ہے جس کو اٹھانے کی جرات کافی تحقیق کے بغیر ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔ اور تحقیق و اجتہاد کے متعلق بھی ہمارا مذہب یہ ہے کہ اس کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہوا ہے، اور کسی خاص عہد کے لئے مخصوص نہیں ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جن لوگوں نے فن حدیث کی تحصیل اور اس کے باقاعدہ مطالعہ اور تحقیقات میں پورا ایک مہینہ بھی صرف نہیں کیا ہے وہ ان بزرگوں کے کارناموں پر تنقید کریں جنہوں نے پوری پوری عمریں اس فن کی خدمت میں بسر کی ہیں۔ صرف ایک فن حدیث ہی پر موقوف نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی علم و فن بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس میں مبتدیوں اور اناڑیوں کو ریسرچ اور ماہرانہ اظہار رائے، اور مجتہدانہ کلام کا حق دیا جاتا ہو۔ یہ حق انسان کو صرف اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ فن کے مبادی اور اصول پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہو، اور جتنا ذخیرہ معلومات اس فن کے متعلق موجود ہو، وہ سب اس کی نظر میں ہو۔ باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ تک نہیں پہونچا ہے

تو اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ائمۂ فن کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے ہیں۔ وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہونے کے بعد جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ "بلاغ" نے میرے پاس مولانا احمد الدین صاحب امرتسری کی کتاب "برہان القرآن" بھیجی اور اس کے ساتھ اپنے عنایت نامے میں مجھ سے خواہش فرمائی کہ اس مضمون کو لکھتے وقت کتاب مذکور کو بھی پیش نظر رکھوں نیز انہوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ اگر محققانہ طرز میں حقیقت حدیث کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا گیا تو ان کی جماعت قبول حق میں تامل نہ کرے گی۔ میں اس عنایت نامے کیلئے موصوف کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور ان کی حق پسندی پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ "برہان القرآن" کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ ایک علٰحدہ تنقید کی محتاج ہے، اور اس مضمون میں اس پر بحث کرنا خلط مبحث کا موجب ہوگا۔ اس لئے انشاء اللہ عنقریب اس پر مفصل تبصرہ کروں گا۔ خدا مجھ کو احقاق حق کی توفیق عطا فرمائے اور کجروی و گمراہی سے محفوظ رکھے۔

تقریظ و انتقاد

فتنۂ ارتداد اور مرآۃ المثنوی

از مولانا مناظر احسن گیلانی استاذ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

عقلی طغیانی اور ذہنی شوریدگی کے ان خطرناک گھنگھور بادلوں کو جس کا نام کفر ہے شاید وہی شعاعیں پھاڑ سکتی ہیں جو نبوت کے آفتاب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نکل رہی ہوں لیکن کسی امت مسلمہ مطیعہ میں جب ارتداد و ارتیاب کی ہل چل پیدا ہوتی ہے تو کسی اور دین و ملت کو تجربہ ہوا نہ ہو لیکن مسلمانوں کا مشاہدہ ہے کہ قدرت نے اس طوفان کو تھامنے کے لئے ہمیشہ صدیقوں کو اٹھایا۔ اسلام کا پہلا ارتداد جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی شروع ہوا اور جس کا دوسرا نام تاریخ اسلام میں "فتنہ ردہ" ہے سب جانتے ہیں کہ اس اٹھنے والے فساد کو اسی نے بٹھا دیا جو اسلام کا پہلا اور سب سے بڑا صدیق تھا رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اسلام کے وسطانی دور میں یونان و رمان مصر و ایران چین و ہند کے وساوس و اوہام کے ترجمہ میں اللہ کی کتاب گھر گئی اور وہی امت جو قرآن کے نیچے رہنے کے لئے بنائی گئی تھی اس نے قرآن ہی کو اپنی خواہشوں کے نیچے دبا دیا گو الفاظ سے علانیہ بغاوت کا ظہور کم ہوا تھا لیکن قرآن کے معانی سے پھرنے والے دماغوں اور مرتد ہونے والی روحوں کی ایک بڑی تعداد ان ہی گھروں میں پیدا ہو گئی تھی جنہیں مسلمانوں کا گھر سمجھا جاتا تھا اور ان ہی لوگوں میں پیدا ہو گئی تھی جن کے ناموں کو مسلمانوں کا نام خیال کیا جاتا تھا۔

پھر جس طرح ارتداد اول میں تم نے دیکھا تھا کہ کپڑے کا ایک سوداگر فوجوں کی کمانداری کا کام دل کی ہمت اور دماغ کی بیداری سے انجام دے رہا ہے اور عرب کے جنگ آزما قبیلوں میں سے ایک ایک کو چن چن کر ارتداد سے اسلام پر بغاوت سے اطاعت پر واپس لے آیا کچھ اسی قسم کا واقعہ وسطانی

رتداد میں بھی پیش آیا کہ صدیقؓ اول ہی گھرانے کا ایک صدیق جو صرف نسلاً ہی صدیقی نہ تھا بلکہ ربانی مدارج میں اہل نظر نے اس کو بھی ملیک مقتدر کے آگے مقعد صدق میں پایا ہے، قدم صدق پر کھڑا ہوا۔ اٹھا اور دیکھنے والے اچنبھے سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ وہی جو ابھی چند سال پہلے نحو و صرف، اصول فقہ، فقہ منطق، کلام کے خشک اور جدلی مباحث میں مشغول تھا وہ سربازار کچھ گا رہا ہے، سنا رہا ہے، خود سر دھنتا ہے، دوسروں سے دھنواتا ہے، بازار میں مست ہونے والے اس ملّا کا نام اب تو خدا جانے کیا کیا ہے لیکن اُس وقت اس کو لوگ "ملّا جلال الدین" کے نام سے موسوم کرتے تھے رحمۃ اللہ علیہ[۱]

زمخشری، بیضاوی کے رٹانے والے بزدوی اور ابن حاجب کو گھول کر پلانے والے خیالی اور عضدی کے بالوں کی کھال نکالنے والوں میں سے کون ہے جو رہ گیا یا اس کے رہنے کی کوئی امید ہے لیکن وہی جسے لوگوں نے طوطے و خرگوش کا قصہ سنانے والا خیال کیا تھا اب اسلام کا سب سے بڑا فلسفی، قرآن کا بڑا مفسر، اسرار شریعت کا سب سے بڑا شارح سمجھا جاتا ہے، صوفی اس کے گیتوں پر محو رقص ہیں، واعظ اس کے اشعار پڑھ کر جھوم رہے ہیں، حکیم اس کے الجھے ہوئے بیان سے اپنا فلسفہ سلجھا رہے ہیں، شاعر اس کے بے اصول و قواعد کلام سے اپنے کلام میں زور پیدا کر رہے ہیں، وہ مدرسہ سے بازار میں آیا لیکن لوگوں نے اس کو، اس کی کتاب کو بازار سے اٹھا کر کہاں پہونچا یا آج وہ مکتبوں ہی میں نہیں، مدرسوں ہی میں نہیں کالجوں میں ہے، یونیورسٹیوں میں ہے، مشرق ہی میں نہیں کیمبرج[۱] میں ہے آکسفورڈ میں ہے، مندروں میں ہے، شوالوں[۲] میں ہے اور آخر میں وہی جس نے اپنے کو رسوا سربازار کیا تھا اور کسی پاک نیت صادق جذبہ سے بکل ہو کر کیا تھا وہ مسجدوں میں ہے، ممبروں پہ ہے، خانقاہوں میں ہے، اور کون جا سکتا ہے کہ زمین کی یہ پیداوار آسمان کی کن بلندیوں تک پہونچ کر رہی ہے۔

---

[۱] حال میں مثنوی شریف بڑے آب و تاب سے ڈاکٹر نکلسن کی تصحیح سے کیمبرج سے شائع ہوئی ہے۔

[۲] آگرہ کے مشہور ہند و انسٹی ٹیوشن رام دیال باغ میں مثنوی کا درس روزانہ دیا جاتا ہے۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ" کا مکاشفہ جن کو ہوا ہے کیا بتاؤں کہ وہ اس کلام کے متعلق کیا کیا کہتے ہیں۔ "زبان پہلوی کا قرآن" کہنے سے تو میں نے متقشف سے متقشف محتاط سے محتاط مولویوں کو بھی جھجکتے ہوئے نہیں دیکھا۔

"مثنوی شریف" نے اسلام کے وسطانی دور کے "ارتداد" کا ردعمل جس زور و قوت کیساتھ کیا ہے اس کے لئے ایک مبسوط مطالعہ اور طویل تفصیل کی ضرورت ہے خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے اس صدیقی کو اپنی نیت میں کامیاب کیا وَاللّٰهُ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

آج اسلام پھر ارض مغرب کے وساوس و شکوک کے اندھیرے میں گھرا جا رہا ہے۔ اسلامی اقوام کے جن خاندانوں کا تعلق مغربی تہذیب سے ہو رہا ہے بتدریج ان میں اللہ کی کتاب اور اپنے رسول کے "پیغام" سے ارتداد پیدا ہو رہا ہے۔ وسطانی دور کے ارتداد میں چونکہ اسلام سیاسی طور پر قوموں کے مقابلہ میں برتری حاصل کئے ہوئے تھا اس لئے جیسا کہ میں نے کہا ہے اس ذہنی ارتداد اور باطنی بغاوت نے مسلمانوں کے "ظاہر" کو کم متاثر کیا تھا لیکن بدقسمتی سے "ارتداد" کا جو دور مغرب کے اثر سے اب شروع ہوا ہے اس وقت بدبخت مسلمان اپنے سیاسی تفوق کو بھی کھو بیٹھے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت جو "ارتداد" باطن میں پیدا ہوتا ہے کچھ دن تو سوسائٹی کے دباؤ سے اندر ہی دبا رہتا ہے لیکن جیسے جیسے خاندانوں کا تعلق اپنے قبیلہ سے کمزور ہوتا جاتا ہے سوسائٹی کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے اور مغربی قوت سے ان کو نزدیکی حاصل ہوتی جاتی ہے اسی نسبت سے یہ "ارتداد" اندر سے نکل نکل کر باہر آ رہا ہے۔ مغربی طرز کے اسکول و مدارس "ارتداد" کی اس آگ کو ہوا دینے میں سب سے زیادہ اس وقت معاون و مددگار ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا آخری انجام کیا ہے۔ صرف ختم نبوت کی واقعیت اور اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ کا وعدہ یاس کی گھڑیوں میں "امید" کی جھلکی دکھا رہا ہے، ورنہ واقعات کی جو رفتار ہے اس سے درد والوں کے دل پگھل رہے ہیں، جگر کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں۔

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

اس سلسلہ میں مخلصین اسلام کے مختلف افراد اپنی اپنی جگہوں پر جو بن آتا ہے کر رہے ہیں اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر شخص کی خدمت کچھ نہ کچھ اپنے نتائج خود پیدا کر رہی ہے جزاھم عن نبی الاسلام خیر الجزا صلی اللہ علیہ وسلم

اس سلسلہ میں ہمارے محترم و مکرم جناب قاضی تلمذ حسین صاحب (جنہیں میں نہیں جانتا کہ صدیقیت سے ان کو کس قسم کا تعلق ہے) ارتداد کے اس فتنہ کے مقابلہ پر اسی صدیقی حربہ کو لے کر اٹھے ہیں جس نے وسطانی دور کے ارتداد کو بغیر کسی شور و غوغا کے قصہ و کہانی کے پیرایہ میں فاش شکست دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اسلامی دنیا کے سرحد پار بھگا دیا تھا قاضی صاحب کو خود تجربہ ہوا یا ان کا حسن ظن ہے لیکن انہوں نے اگر یہ سمجھا ہے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں موجودہ ذہنیت کے مطابق کسی آسان شکل میں "مثنوی مولانا روم" کو پھر پھیلا دیا جائے تو کیا بعید ہے کہ ارتداد کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب کسی حد پر آکر تھم جائے۔ قاضی صاحب کی اگر یہی نیت ہے تو پاک نیت ہے اور صحیح ارادہ ہے۔

لیکن مثنوی شریف کو موجودہ سہولت پسند مذاق کے مطابق کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ آج جبکہ وبسٹر ڈکشنری سے الفاظ نکالنے کے لئے علاوہ عام فہرست' انڈکس' اور خدا جانے کن کن تسہیلی مقدمات کے' یہ تک کر دیا جاتا ہے کہ ہر ہر حرف کے اوراق دوسرے حروف سے کاٹ کر جدا کر دیے جاتے ہیں اور اس قطع شدہ حصہ پر اسی حرف کو لکھ دیا جاتا ہے "مثنوی شریف" کے بحر بے پایاں کی ان گنت موجوں کا تھامنا ان میں ترتیب پیدا کرنا ان کے لئے فہرست بنانا' الفاظی اشارے تیار کرنا' واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہے لیکن صد تحسین و ہزار تبریک کی مستحق ہے قاضی صاحب کی ذات کہ اس کام کا بار تن تنہا اپنے سر پر انہوں نے اٹھا لیا اور خاموش طریقے سے جس سال کی طویل مدت میں آخر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ارادے میں کامیاب کیا۔ ان کی یہی بیست سالہ محنت و کاوش ہے جو اب ملک و قوم کے سامنے ہے۔

۱۔ انہوں نے مثنوی شریف کے تمام قصوں کو جو اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ ان کا مسلسل پڑھنا دشوار تھا پہلا ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ جن لوگوں کو حقائق و معانی سے زیادہ مناسبت نہ ہو وہ پہلے ان قصوں سے مثنوی کا آغاز کریں چونکہ مثنوی کا ہر قصہ

اپنے اندر نتائج وبصائر کا ایک ذخیرہ رکھتا ہے اس لئے یہ امید بیجا نہیں ہے کہ قصوں کے بہانے سے عام لوگوں کو ابتدا ہی سے مولنا کے منشا اور مقصد سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

۲۔ انہوں نے پھر ایک مجموعہ ان اشعار کا تیار کیا ہے جن میں مولنا کے سارے خیالات جو اسلام کے فروع و اصول عملیات ونظریات کے متعلق ہیں اور یہی بحر بے پایاں ہے۔ قاضی صاحب نے ان کو عنوانوں کے قید وبند میں لانا چاہا ہے اور حتی الوسع اس میں وہ کامیاب رہے ہیں لیکن ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجا است۔ بہرحال مطالعہ کرنے والے مثنوی شریف کے اس حصہ کے بعد خود اپنے اندر اتنی لطافت اور دقت نظر پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کو عنوانی راہنمائی کی چنداں ضرورت نہیں رہتی ہے۔

۳۔ انہوں نے ان قرآنی آیات کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا ہے جن کا ذکر مثنوی شریف کے مختلف حصوں میں متفرق طور پر تھا۔ ان کے پڑھنے سے مسلمانوں کو قرآن کے سمجھنے کی ایک نئی راہ معلوم ہو گئی جو خاص مولنا روم کا حصہ ہے اور قرآن کو اس طرز پر سمجھنے کی عہد حاضر کے مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے گویا وہ مولنا روم کی تفسیر کا ایک حصہ ہے۔

۴۔ انہوں نے ان احادیث کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا ہے جن کا ذکر مثنوی شریف میں آ گیا ہے، نبوی اقوال کے فہم میں کس ذوق اور کتنی عمیق نظر کی ضرورت ہے اس کا اندازہ اس حصہ سے ہوتا ہے بلکہ دیکھنے والوں میں حدیثوں کے سمجھنے کا بھی ایک سلیقۂ خاص پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ دوسری حدیثوں کی شرح وفہم میں کام لے سکتے ہیں۔

۵۔ آخر میں قاضی صاحب نے "مدحیہ اشعار" کو بھی ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس میں ان مورخین کے لئے ایک بڑی اعانت ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مولنا روم کے ذاتی تعلقات کن کن لوگوں سے کیا تھے۔ اور حضرت اپنے دوست واحباب تلامذہ اور مریدوں سے کس قسم کا سلوک فرماتے تھے۔

۶۔ سب سے زیادہ سخت لیکن زمانہ کے مطابق کام قاضی صاحب کا وہ "کشافیہ" ہے جو مثنوی کے ہر شعر کے متعلق انہوں نے لگایا ہے میں نے اس کا ذکر صرف ایک سطر میں کیا اور قاضی صاحب کی عمر کا ایک گراں مایہ حصہ اس کی نذر ہوا۔ خدا کرے قاضی صاحب کو یہ محنت بار آور ہو۔ اور موجودہ "فتنہ روم" کے مقابلہ میں قاضی صاحب کا یہ صدیقی ہتھیار کارگر ثابت ہو۔ طباعت کتابت کاغذ جلد سب کچھ مذاق حاضرہ کے مطابق ہے قیمت میں بھی انتہائی مراعات مد نظر رکھی گئی ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

مسئلہ جہاد اسلام کے ان مسائل میں سے ہے جن پر مخالفین نے سب سے زیادہ طعن کیا ہے، اور بدقسمتی سے اسلام کے وکیلوں نے بھی دشمنوں کے حملوں سے مرعوب ہو کر سب سے زیادہ اسی مسئلہ میں قطع و برید کی ہے۔ اب تک کسی زبان میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس میں جہاد کے متعلق اسلام کی صحیح تعلیم کو قرآن پاک اور سنت رسول کے مطابق تشریح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہو اور دوسرے مذاہب و اقوام کے قوانین جنگ سے اسلام کے قوانین جنگ کا مقابلہ کر کے اسلامی قوانین کی فضیلت ثابت کی گئی ہو۔ "الجہاد فی الاسلام" اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں جہاد فی سبیل اللہ کی کیا اہمیت ہے۔

مدافعانہ جنگ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن نے کن کن اغراض کے لئے دفاعی جنگ کے احکام دیے ہیں اور وہ کس قدر حق بجانب ہیں۔

مصلحانہ جنگ اس میں اصلاحی جنگ کے متعلق اسلام کے اصول کی پوری تشریح کی گئی ہے اور ان تمام مسائل کو صاف کر دیا گیا ہے جن میں بکثرت لوگوں کو غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار دعوت و تبلیغ کے متعلق اسلام کے اصول کی تشریح کر کے بتایا گیا ہے کہ اشاعت اسلام میں تلوار کی کیا حیثیت ہے۔

قوانین جنگ اسلام سے پہلے دنیا میں جنگ کے جو وحشیانہ طریقے رائج تھے، ان کو بیان کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اسلام نے کس طرح ان کی اصلاح کی اور جنگ کے لئے مہذب قوانین بنائے۔

جنگ دوسرے مذاہب میں جنگ کے متعلق ہندو مذہب، یہودی مذہب، بودھ مت اور مسیحیت کے اصول و تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید مغربی تہذیب کے بین الاقوامی قوانین کا مفصل بیان اور اسلامی قوانین سے ان کا مقابلہ۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت للعہ انگریزی۔ للعہ سکۂ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ جلد ۴ عدد ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اصلاح اور انقلاب دونوں کا مقصد کسی بگڑی ہوئی حالت کا بدلنا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کے محرکات، اور طریق کار میں اساسی فرق ہوا کرتا ہے۔ اصلاح کی ابتدا غور و فکر سے ہوتی ہے، ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ بچار کر کے انسان حالات کا جائزہ لیتا ہے، خرابی کے اسباب پر غور کرتا ہے، خرابی کے حدود کی پیمائش کرتا ہے، اس کے ازالہ کی تدبیریں دریافت کرتا ہے، اور اس کو دور کرنے کے لئے صرف اسی حد تک تخریبی قوت استعمال کرتا ہے جس حد تک اس کا استعمال ناگزیر ہو۔ بخلاف اس کے انقلاب کی ابتدا غیظ و غضب اور جوش انتقام کی گرمی سے ہوتی ہے۔ خرابی کے جواب میں ایک دوسری خرابی مہیا کی جاتی ہے۔ جس بے اعتدالی سے بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کا مقابلہ ایک دوسری بے اعتدالی سے کیا جاتا ہے جو خود بھی ایک دوسری قسم کا بگاڑ ہوتی ہے، اور تخریب کا عمل ایک ایسے جوش جنون کے ساتھ کیا جاتا ہے جو برائیوں کے ساتھ اچھائیوں کو بھی غارت کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایک اصلاح پسند کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو ایک انقلاب پسند کرتا ہے۔ دونوں نشتر لیکر جسم کے ماؤف حصہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اصلاح پسند پہلے اندازہ کر لیتا ہے کہ خرابی کہاں ہے اور کتنی ہے۔ پھر نشتر کو اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک خرابی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے اور نشتر کے ساتھ ساتھ مرہم بھی مہیا رکھتا ہے لیکن انقلاب پسند اپنے جوش غضب میں آنکھیں بند کر کے نشتر چلاتا ہے، اچھے برے کا امتیاز کئے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے، اور مرہم کا خیال اس کے ذہن میں اگر آتا بھی ہے تو اس وقت جب خوب

قطع و برید کر لینے اور جسم کے ایک اچھے خاصے حصے کو غارت کر چکنے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

عموماً جہاں خرابیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں، وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں، اور بگڑے ہوئے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے وہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرکے اصلاح کی کوشش کریں۔ اس لئے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کے بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے۔ قدامت پسند اور انقلاب پسند جماعتوں میں سخت کشمکش برپا ہوتی ہے جس سے غضب و انتقام کی آگ کو اور زیادہ ایندھن مل جاتا ہے۔ دونوں فریق ضد اور ہٹ دھرمی کے انتہائی سرے پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں حق اور صداقت کا گلا کاٹتے ہیں۔ ایک طرف سے حق کے بجائے باطل کی مدافعت میں انتہائی قوت صرف کی جاتی ہے، دوسری طرف سے حق اور باطل کا امتیاز کئے بغیر سب پر اندھا دھند حملے کئے جاتے ہیں۔ آخر میں جب انقلاب پسندوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ہر اُس چیز کو تباہ کرتے ہیں جو قدامت پسندوں کے پاس تھی، خواہ وہ حق ہو یا باطل، صحیح ہو یا غلط۔ انقلاب ایک سیلاب کی طرح بڑھتا ہے، اور بلا امتیاز اچھے اور بُرے سب کو غارت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر کافی تخریب کر چکنے کے بعد جب عقل اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے تو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر انقلابی ذہنیت تعمیر میں بھی نرالے انداز ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہے۔ ہر اس چیز کو چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قدامت پسندوں کے پاس تھی خواہ کوئی چیز بجائے خود صحیح ہو لیکن انقلاب کی نگاہ میں کسی چیز کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ قدامت پسند کی طرف منسوب ہو۔ اس طرح ایک کافی مدت تک نئے انقلابی اصولوں پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جب نئے نئے تجربوں اور ناکامیوں سے انقلابی دماغ تھک جاتا ہے، تب کہیں جاکر وہ اس اعتدال کے نقطے پر آتا ہے جو ابتدا ہی سے اصلاح پسند کے پیش نظر تھا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابی بسیار

موجودہ زمانہ میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال بولشویک انقلاب ہے۔ نظام تمدن کی جو انتہائی بگڑی ہوئی حالت شہنشاہی روس میں قائم تھی وہ جب اہل ملک کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تو اس کے جواب میں ایک انقلابی تحریک رونما ہوئی۔ یورپ کے اشتراکی اور جمہوری نظریات نے روس میں فروغ پانا شروع کیا۔ سلطنت اور اس کے پروردہ طبقوں نے اپنے ناجائز فوائد کی حفاظت کے لئے جابرانہ قوتیں استعمال کیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسندوں میں صرف شاہی مطلق العنانی اور طبقات کی ناروا تقسیم ہی کے خلاف نہیں بلکہ اس پورے نظام تمدن کے خلاف جو صدیوں سے متوارث چلا آرہا تھا، غضب کے جذبات بھڑکنے لگے۔ آخر کارل مارکس کے ہیولیٰ نے لینن کی صورت اختیار کی۔ زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا، اور اس کے ساتھ ان تمام سیاسی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، مذہبی، اصولوں کو بھی یک قلم مٹا دیا گیا جن پر انقلاب سے پہلے کی سوسائٹی قائم تھی۔ اس کامل تخریب کے بعد بالکل نئے اشتراکی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر شروع کی گئی، اور ان نئے معماروں نے اپنی تمام دماغی قوتیں اس کوشش میں صرف کر دیں کہ قدامت پسندوں کے ترکے میں سے ایک چیز بھی ان کی نئی عمارت میں شامل نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ خدا کو بھی سوویٹ روس سے باہر نکل جانے کا نوٹس دے دیا گیا۔ لیکن اب جتنا جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے، تعمیری عقل، انقلابی جنون کی جگہ لیتی جاتی ہے، اور وہ انتہائی بولشویت جو انقلاب کی ابتدا میں کارفرما تھی، اعتدال کے نقطہ کی طرف واپس ہوتی رہتی ہے۔

ایسی ہی انتہاپسندی انقلاب فرانس کے زمانہ میں بھی رونما ہوئی تھی اس وقت بھی جوش انقلاب میں اچھے اور برے سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور نئے نئے انقلابی اصول وضع کرکے ان کو رواج دیا گیا۔ لیکن اس شدید انقلابی بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک فرانس کا سیاسی، تمدنی، اور اخلاقی مزاج اعتدال

نہیں آسکا ہے اور آج اس کی قومی زندگی کو کسی شعبہ میں بھی وہ استحکام نصیب نہیں ہے جو انگلستان کو حاصل ہے۔

ایک اور مثال ترکی انقلاب کی ہے جہاں اسی انقلابی ذہنیت نے کوشش کی کہ ایک قوم کو جادو کے زور سے آن کی آن میں ایک دوسری قوم بنا دیا جائے۔ اس کوشش میں پھوڑوں اور پھنسیوں پر نشتر چلانے کے ساتھ جسم کے اچھے خاصے تندرست حصوں کو بھی کاٹ پھینکا گیا۔ اور ان کی جگہ یورپ سے کچھ نئے اعضا منگوا کر لگائے گئے، حتیٰ کہ پرانے دماغ کی جگہ بھی ایک نیا دماغ نئی ٹوپی کے ساتھ یورپ سے حاصل کیا گیا۔ لیکن اب مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند ترکوں کو آہستہ آہستہ یہ سبق مل رہا ہے کہ ہر پرانی چیز کو برا اور ہر نئی چیز کو اچھا سمجھنے کا جو قاعدہ کلیہ انہوں نے بنا لیا تھا، وہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر نئے تجربات کافی نقصان اٹھانے کے بعد ان کو افراط سے اعتدال کی طرف پسپا ہونا پڑا ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ایک انقلابی بحران رونما ہے اور اس بحران کے برے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قدامت پسند اور انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جو ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً چھٹی ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہو گئی ہے۔ گو اب تک وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی نیرنگی اور وقت کے سیلان و تجدد سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ دنیا بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے، تمدن کے معاملات

اور مسائل نے کتنے ہی پلٹے کھائے، مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے کا ماحول تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی نئے تغیرات سے بے اثر رہے زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی۔ اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں۔ بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب ہوسکتی تھی اور ہوئی۔ مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور معاملات رکھتی ہو، وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متاثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنما اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی علمی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے، تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے، حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔

ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد۔ لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا، اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل علم و بصیرت کا اجتہاد، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور سب سے آخر میں قرآن۔ یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔

فقہاء، متکلمین، مفسرین، اور محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان کی جلالت شان سے کون

انکار کر سکتا ہے مگر وہ انسان تھے، اکتساب علم کے وہی ذرائع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی۔ بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ، کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک متحقق ہو جاتے تھے۔ انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط کرلیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لئے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں۔ مگر بجائے خود اصل اور منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب علم کرکے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا، کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان، قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی درحقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن سکتا ہے جس سے ہمیشہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم افکار اور قوانین اخذ کرتے رہیں۔ جب تک علماء اسلام اس اصل ماخذ و منبع سے اکتساب علم کرتے رہے اور صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی و عملی مسائل حل کرتے رہے، اس وقت تک اسلام زمانے کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہوگئی، جب آنکھیں بند کرکے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہاء اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا، جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم ترک کر دیا گیا، اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لئے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رک گئی، اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہوگئے، جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے

اور دور از کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے، اور اس بد بیادلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر و فسق تقسیم کیا گیا کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کی جگہ یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا تماشا دنیا نے دیکھا، اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی جگہ رُحَمَآءُ عَلَی الْکُفَّارِ اَشِدَّآءُ بَیْنَھُمْ کے مناظر ہر طرف نمایاں ہوئے اور تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی کی جو کیفیت منافقین اور کفار کے حق میں بیان ہوئی تھی، وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔

یہ اسی فعل کا ردِ فعل ہے جو آج ہم ایک خوفناک انقلابی بحران کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے مذہبی رہنما ان کی قیادت کا فرض انجام نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھانے کے بجائے انہیں الٹا پیچھے کھینچے لئے جاتے ہیں تو وہ ان کے قابو سے نکلنے لگے، اور جیسا کہ ایک بن سری فوج کا حال ہوتا ہے، انہوں نے ہر وادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ نے مذہب کے علمبرداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام خود مذہب پر تھوپا، اپنی ترقی کی راہ میں اسی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا، اور علانیہ کہنا شروع کیا کہ مذہب کو چھوڑو اور ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرو۔ ایک دوسرے گروہ نے علما اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینا اپنا شعار بنا لیا۔ گویا اب اسی سب و شتم اور زبان درازی میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ ایک اور گروہ اٹھا اور اس نے مذہب کی قطع و برید شروع کر دی۔ کسی نے فقہاء اور ائمہ پر زبان طعن دراز کی، کسی نے فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی لپیٹ میں لے لیا، کسی نے قرآن کے احکام اور تعلیمات میں بھی ترمیم کی ضرورت سمجھی، کسی نے کہا کہ دین اور دنیا کو الگ الگ کر دو۔ دین کا تعلق صرف عقائد اور عبادات سے رہنا چاہئے، باقی رہے دنیوی معاملات تو ان میں مذہب اور اس کے قوانین کا کچھ دخل نہیں۔

اس طرح مختلف جماعتیں ان بگڑے ہوئے حالات کو بدلنے کے لئے کھڑی ہو گئی ہیں۔ مگر ان کا رجحان

اصلاح کی جانب نہیں بلکہ انقلاب کی جانب ہے۔ انہوں نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ اصل خرابی کیا ہے؟ کہاں سے پیدا ہوئی؟ کس حدتک خرابی ہے؟ اور اس کی اصلاح کی صحیح صورت کیا ہے؟ محض تخمیناً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خرابی ہے، اور اس کو دور کرنے کے لئے دیوانہ وار نشتر چلائے جارہے ہیں خواہ اُس سے مرض کے ساتھ مریض کا بھی کیوں نہ خاتمہ ہو جائے۔

آزاد ممالک میں تو کہا جا سکتا ہے، اور یہ کہنا ایک حدتک درست بھی ہے کہ کسی انقلابی حرکت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لئے کہ وہاں ایک گروہ کے ہاتھ میں حکومت کا عملی اقتدار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس اقتدار کو مٹانے میں ایک شدید انقلابی حرکت کے بغیر مشکل سے کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد جب معاملات کی ذمہ داری انقلاب کے رہنماؤں پر آن پڑتی ہے تو زمانے کے تجربات بہت جلدی ان کی عقل درست کردیتے ہیں، اور انہیں مجبوراً افراط کی روش چھوڑ کر اعتدال کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہم اس وقت غلامی کی حالت میں ہیں، اور ہمارے حالات آزاد ممالک سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں اول تو کسی انقلابی حرکت کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ ایسی کسی شدید اور طاقتور مزاحمت کا خوف نہیں ہے جس کے مقابلہ میں ایک معتدل اصلاحی تحریک کامیاب نہ ہوسکتی ہو۔ دوسرے اگر کوئی انقلابی حرکت جاری ہو اور وہ کامیاب ہوجائے تو مدتہائے دراز تک اس کے اعتدال پر آنے کی امید نہیں کی جاسکتی کیونکہ انقلاب کے علمبرداروں پر سرے سے کسی ذمہ داری کا بوجھ ہی نہ ہوگا۔ جو ان کی افراط پسندی کو اعتدال کی طرف مائل کرسکتا ہو۔ لہٰذا یہاں کسی انقلابی حرکت، بلکہ صحیح الفاظ میں بہت سی انقلابی حرکات کے دیر تک جاری رہنے کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ سب کی سب متزلزل ہوجائیں گی اور ان کی جگہ کوئی ایسی مستحکم بنیاد قائم نہ ہوسکے گی جس پر از سر نو ایک

نظام اجتماعی تعمیر کیا جا سکے۔ پھر غور کرنا چاہئے کہ جو قوم پہلے ہی غلامی اور کمزوری کی حالت میں ہے، اس کے نظام اجتماعی کو اگر اس طرح منہدم کرکے پارہ پارہ کر دیا گیا تو وہ ذلت کے کن گڑھوں میں جا کر گرے گی؟

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہم قدامت پسندوں سے زیادہ انقلاب پسندوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ جہاں تک بگڑے ہوئے حالات کا تعلق ہے، ان کو بدلنے کی ضرورت میں ہم بھی ان سے متفق ہیں ہم بھی چاہتے ہیں کہ جو جمود اسلام میں پیدا کر دیا گیا ہے اس کو حرکت سے بدل دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک اس حرکت کے پیدا کرنے کی یہ کوئی صحیح تدبیر نہیں ہے کہ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر فرنگیت اختیار کی جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ علم دقیق اور غور و فکر کے بغیر مذہب کی قطع و برید شروع کر دی جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ گذشتہ زمانے کے مجتہدین نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے جو عمارتیں قائم کی تھیں ان کو خواہ مخواہ ڈھا دیا جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ حدیث کے سارے ذخیرہ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ کلام الٰہی میں انسان اپنی عقل سے ترمیم و تنسیخ کریں۔ یہ سب تدبیریں تو اصلاح کی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سخت فساد برپا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کر دیا جائے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجئے جو دراصل اس کا مقام تھا۔ حدیث کو وہی مرتبہ دیجئے جو عہد رسالت میں خود رسول اکرمؐ اور آپ کے اصحاب و اہل بیت آپ کے اقوال و اعمال کو دیتے تھے۔ فقہاء، متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجئے جو خود ان بزرگوں نے دیا تھا۔ ان سے فائدہ اٹھائیے، جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انہیں بدستور رہنے دیجئے مگر کبھی یہ نہ سمجھئے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں وہ اٹل قانون ہے، یا ان کی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غور و فکر اور احادیث نبوی کی تحقیق سے بے نیاز کر دیا ہے، یا ان کے بعد کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

یہ ترتیب اگر پھر سے قائم ہو جائے تو اسلام کی رکی ہوئی گاڑی پھر حرکت کرنے لگے گی۔ کیونکہ جمود کی اصلی وجہ تو یہی ہے کہ انجن ریل سے کاٹ کر پیچھے کھڑا کر دیا گیا ہے، ڈرائیور کو بھی انجن سے الگ کر کے کہیں پیچھے

کی گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا ہے، اور سب سے آگے والی گاڑی پر بھروسہ کر لیا گیا ہے کہ وہ خود بھی چلے گی۔ اور ساری ریل کو بھی چلائے گی۔

مگر اس کام میں غصّے اور جوش کی ضرورت نہیں۔ غصّہ تو وہاں ہوں جہاں عمداً کوئی ظلم کیا گیا ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے عمداً نہیں ہوا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علماء نے کہیں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ ہم اسلام پر جمود طاری کریں گے اور اس کی بڑھتی ہوئی گاڑی کو روکیں گے۔ یہ تو محض نتیجہ ہے اس انحطاط کا جو چھٹی ساتویں صدی سے مسلمان قوموں کی سیاسی، فوجی، معاشی، اور تمدنی قوتوں کے ساتھ ان کی علمی، عقلی، اور فکری قوتوں میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انحطاط نے جس طرح مسلمانوں کی روح جہاد کو پژمردہ کیا اسی طرح ان کی روح اجتہاد کو بھی افسردہ کر دیا۔ جس طرح زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق مسلمانوں کے نظریے بدلے اسی طرح امور دینی و علمی کے متعلق بھی ان کے نظریے بدل گئے اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ان کی تمام ذہنی قوتوں پر مردنی چھاتی چلی گئی۔ اس کا الزام نہ علماء کو دیا جا سکتا ہے نہ ان کے متبعین کو۔ اگر آپ چاہیں تو فطرت پر اس کا الزام رکھ دیجئے۔ مگر نہ الزام رکھنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ غضب اور اس کے تخریبی جوش سے۔ اصلاح کی صحیح صورت بس یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے خرابیوں کے اسباب اور ان کے حدود کو تلاش کیجئے اور حکمت کے ساتھ ان کو خوبیوں سے بدل دیجئے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۴)

ایمان

۵ ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیات آخرت، اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت جتائی گئی ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۷:۱۷) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ (۶:۴)۔

حیات اخروی کا اعتقاد، جس کو اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

چند فطری سوالات انسان خوشی سے زیادہ غم، اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اور کب تک رہیگی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے توسن فکر پر ایک تازیانہ لگا دیتا ہے، اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟

اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ ہمیں کبھی پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیا ہنگامہ ہے؟ کیسے شروع ہوگیا؟ کس نے برپا کردیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں، اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں بخلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے بیکس اور کمزور بھی مرتے ہیں، طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں حسرتناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں، عبرتناک موتیں بھی پیش آتی ہیں، اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر اپنے گذرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گذرے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاذ ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن پیدا نہ کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گذر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عالم سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لیکر ایک بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہیں لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے، ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی، اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان میں سے ہر فعل کا ردِ فعل، ہر حرکت کی بازگشت ہر کوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہیے۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہے۔ اچھی کوشش کا

اچھا نتیجہ اور بری کوشش کا برا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گذاری۔ بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا، کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کونسی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریر کے یہ ظلم، اور مظلوموں کے صبر سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے، بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے، اور ان کا پورا پورا ثمرہ انھیں دنیا میں نہ ملا۔ بعض نیکیوں پر ان کی الٹی بدنامی اور رسوائی ہوئی۔ بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے۔ بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں۔ بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا صرف اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہوگیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہوجاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہوجاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہیگا؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے تعلق سے یہ کارخانۂ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیات اخروی کا اعتقاد دراصل ان ہی سوالات کا جواب ہے لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں؟

حیات اخروی کا انکار ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، احساس، عمل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۴۴: ۲) وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيٰوتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵: ۳) بخلاف اس کے یہ کارخانۂ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعۂ علم سے تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے، اور فی الواقع یہ کارخانۂ عالم لازوال ہے بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی، اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیا کا وجود اور ہمارا عدم احساس ہی اشیار کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے، وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے، اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے بہتے دیکھا، اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل آدمی اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت چونکہ ہم کو معلوم نہیں اس لئے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر کارخانۂ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا، تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آتی ہے جو اس کے کبھی آئندہ گرنے کی پیش گوئی کرتی ہو کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکار آخرت کا اثر فلاسفہ اور حکماء اب قریب قریب اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظام عالم ضرور درہم برہم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور ابدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریہ کو دہرانے والا شاید آج اہل علم کی جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم ابھی تک موت کو فنائے محض کہنے والے بہت باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن اس کی غیر معقولیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے معاملات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس قول میں تشنۂ جواب ہی رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ ناموافق حالات میں اس پر ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہو گی کیونکہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا۔ تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائیگی جب وہ اپنی مظلومی کی دادرسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائیگا تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا اور جب وہ شریروں بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھیگا تو خیال کریگا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائیگا۔ وہ خیال کریگا کہ زندگی کے جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔

اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اسکی کسر پوری ہو وہ ظلم و ستم کریگا لوگوں کے حقوق غصب کریگا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جن کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو، رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہونگی۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو، تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائیگی۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو عین صواب بن جائے گا۔ صداقت اگر دنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بصورت نقصان اس سے بڑھ کر کوئی بدی نہ ہوگی۔ زنا لذت او عیش کے لئے مستحسن ہوگی، اور اس میں برائی کا پہلو اگر کبھی پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جبکہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بُرے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انھی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائیگا۔ جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گروہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر درجے تک گرے بغیر

نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اور جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں ہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام "ضمیر" ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے لیکن اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائیگا اور وہ نہ ان افعال پر سرزنش کریگا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، اور نہ ان افعال میں اطمینان محسوس کریگا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

نظریۂ تناسخ دوسری جماعت وہ ہے جس نے تناسخ کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی، اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں

اس نے بہم پہونچائی ہیں تو روح اعلیٰ طبقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور انہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اسی دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے یونان میں مسیح سے کئی صدی قبل فیثاغورس اور انبذقلس ([illegible]) وغیرہ اس کے قائل تھے، روم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا چرچا تھا، مصر کی قدیم تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی بیرونی اثرات سے تناسخ کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا، لیکن اب یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذاہب (برہمنیت، بودھ مت، جین مت وغیرہ) میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مدغاسکر، وسطی اسٹریلیا، انڈونیشیا، اوشیانیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت بہم پہونچائی ہے وہ ان تمام نظریات کی تردید کرتی ہے جن پر نظریہ تناسخ کی بنا قائم ہے۔ خود ہندی الاصل مذاہب میں بھی جب ہم اس نظریہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک ہندوستان میں یہ تخیل سرے سے موجود ہی نہ تھا اس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکوکاروں کے لئے سراسر راحت اور بدکاروں کے لئے سراسر مصیبت ہے۔ اس کے بعد دفعۃً اس نظریہ میں تغیر واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندوستانی لٹریچر میں ہم کو وہ کتابیں ملتی ہیں جن میں تناسخ کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے اس تغیر کا سبب ابھی تک محقق نہیں ہو سکا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تخیل آریوں میں قدیم دراوِڈ قوموں سے آیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خود آریوں کے ادنیٰ طبقوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے برہمن فلسفیوں نے اس کو لیکر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتداءً تناسخ کی اس مفصل اسکیم سے خالی تھا جو بعد کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی

ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے پتہ چلتا ہے، ابتدا میں بودھ دھرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک دریا ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ تمام عالم کی ایک ہی روح اور تمام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر صورتیں اور قالب پر قالب بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں وحی و الہام کے سرچشمے سے ہندی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا اس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اپج کا نتیجہ تھا۔

عقلی تنقید | یہاں تناسخ کے مسئلہ پر کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدۂ تناسخ کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو صریح عقل کے خلاف ہیں اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو اب تک انسان کی دنیا اور اس کی زندگی پر غور و خوض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تناسخ کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور برے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں برے عمل کئے تو وہ حیوانی اور نباتی طبقات کی طرف نزول کریگا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کئے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نباتی زندگی نتیجہ ہے انسانی زندگی کے برے اعمال کا اور انسانی زندگی نتیجہ ہے نباتی اور حیوانی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ یا بالفاظ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نباتی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کئے تھے۔ اور اس وقت جو نباتات اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ایسے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں برے اعمال کئے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے چند امور کا ماننا ضروری ہے۔ اور وہ سب علم و عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا دور ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑیگا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں بلکہ وہ مادّے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں ازلی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی ازلی اور ابدی ہوں لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہے کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصّے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا، وہ حیوان کے قالب میں پہنچکر لا عقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں پہنچکر اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھکر بالارادہ کئے جائیں اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مترتب ہو سکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے، اور نہ ان پر جزا و سزا مترتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بُرے کرموں کا پھل بُرا ہی ہونا چاہئے۔ اور جب وہ دوسرے جنم میں وہ بُرا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس بُرے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لامحالہ اس سے بُرے ہی اعمال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل

تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے چکر میں نیچے اور نیچے طبقوں ہی کی طرف گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھر ابھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

تمدن پر عقیدۂ تناسخ کا اثر ان کے علاوہ اور بہت سے وجوہ ہیں جن کی بنا پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد ہمتوں کو پست کرنے والا، اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے "اہنسا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں وہ قوائے جسمانی کو نشو و نما دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے، اس کے افراد نہ صرف جسمانی اعتبار سے کمزور بلکہ دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں، اور اس دوہرے ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے، اور آخر کار یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

عقیدہ تناسخ کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا دشمن ہے۔ اور انسان کو رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لیجاتا ہے۔ اہل تناسخ کا اعتقاد یہ ہے کہ روح کو جو چیز گناہوں سے آلودہ کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت روح کو بار بار جسمانی قالبوں میں آکر اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان خواہشات کو پامال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے دھندوں میں نہ پھنسائے تو اس کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی بس یہی ایک صورت ہے کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پھنسنے کے بعد انسان کا خواہشات اور ان کے مقتضیات سے بچ جانا محال ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیاسی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں

میں جا بیٹھیں۔ اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض حیثیات سے تناسخ کا اعتقاد کم از کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو فنائے محض اور عدم مطلق سمجھا جائے۔ کیونکہ انسان میں بقائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تناسخ میں ایک حد تک تسکین پا سکتی ہے، اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جزا و سزا، اور اعمال کے اچھے اور بُرے انجام کا جو تخیل موجود ہے، اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لئے پشت پناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اول تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، جس کی طرف ہم بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو اس کی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ علمی و عقلی ارتقاء کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اس کی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقاء و استحکام کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو اسی صورت میں نافع ہوگا جبکہ وہ کتابوں کے بجائے دلوں میں متمکن ہو، اور لوگ پوری طرح اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ تناسخ کا چکر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا، اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فعل کی تاثیر اور اس کے نتیجہ کو نہیں بدلا جا سکتا تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لئے گناہ کے پھیر میں آ جائیگا، اور سمجھ لیگا کہ جب مجھے جانور یا درخت بننا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی جون کی تمام لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھالوں۔ (باقی)

کلمۂ جامعہ

یہ ایک مختصر تقریر ہے جو انجمن مجددیہ حیدر آباد کے گذشتہ سالانہ جلسہ میں کی گئی تھی۔ اس وقت جو کچھ ذہن میں تھا عرض کر دیا گیا۔ مگر بعد میں احباب نے خواہش کی کہ اسے قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے لہذا حافظہ سے مدد لے کر اس کو پھر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ محمد سید المرسلین وخاتم النبیین

برادران ملت!

کیا میں آپ کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر روح کو بالیدگی اور دل کو فرحت بخشنے والا نظارہ کونسا ہے؟ اس نظارہ کو بیان کرنے کے لئے الفاظ سے تصویر کھینچنے کی ضرورت نہیں۔ جس چیز کا آنکھیں یہیں اسی وقت مشاہدہ کر سکتی ہیں اسے بیان کرنے کے لئے زبان کو تکلیف دینے کی کیا حاجت ہے؟ وہ نظارہ یہی ہے جو میں اس وقت دیکھ رہا ہوں اور آپ میں سے ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا اجتماع، مسلمان ہونے کی حیثیت سے، خدا پرست ہونے کی حیثیت سے، امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے۔ یہ اجتماع صرف میرے اور آپ کے لئے ہی دل خوش کن نہیں ہے۔ اس کو خدا نے بھی پسند کیا ہے اور وہ بھی اس کا عاشق ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ — اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (۶۱:۴)

یہ محبت صرف اُسی صف بندی کے لئے نہیں ہے جو جنگ میں کی جاتی ہے بلکہ اس صف بندی کے لئے بھی ہے جو آپ نمازیں خدا کی عبادت کے لئے کرتے ہیں چنانچہ اسی لئے آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور کیسی تاکید کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ۔

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ	جب جمعہ کے روز نماز کے لئے ندا کی جائے تو خدا کی
فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲:۲)	یاد کے لئے دوڑو اور سب کاروبار چھوڑ دو۔

یہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اس پورے اسلامی اجتماع کے ساتھ ہے جو مشرق کے انتہائی کناروں سے لیکر مغرب کے انتہائی کناروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو اپنی نعمت قرار دیتا ہے اور احسان جتاتا ہے کہ۔

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ	یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کہ تم آپس میں دشمن تھے
اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ	اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی
بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا	اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ سے بھرے
حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا (۳:۱۱)	گڑھے کے کنارے پر تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔

حضرات:۔

غور کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کو ایک بنیان مرصوص بناتی ہے۔ آپ میں سے ہر شخص اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ ہر شخص کا جسم الگ ہے، جان الگ ہے، طبیعتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مزاج مختلف ہیں، خیالات مختلف ہیں۔ مگر اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو آپ کے درمیان مشترک ہے، اور وہی ایک ایسا رشتہ بن گئی ہے جس نے مختلف دانوں کو جوڑ کر ایک تسبیح بنا دیا ہے، وہی ایک چیز آپ کو مسجد میں کھینچ لاتی ہے، اور ایک صف میں محمود و ایاز سب کو کھڑا کر دیتی ہے۔ وہی چیز کبھی آپ کو میدان جنگ میں کھینچ لے جاتی ہے اور ایک مشترک مقصد کے لئے آپ سے سرفروشی کراتی ہے۔ وہی چیز آپ کے درمیان

مناکحت اور مصاہرت کے تعلقات قائم کراتی ہے۔ وہی آپ کو ایک دوسرے کا ہمدرد، رفیق اور غمگسار بنا دیتی ہے۔ اور وہی آپ میں اور دوسری قوموں میں امتیاز کا خط کھینچتی ہے۔ مگر وہ کوئی رسی نہیں ہے جو لکڑیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر جکڑ دیتی ہو، وہ کوئی چونا نہیں ہے جو اینٹوں کو جوڑ کر پیوستہ کر دیتا ہو وہ محض ایک کلمہ ہے جس کو میں کلمۂ جامعہ کے لفظ سے اسی لئے تعبیر کرتا ہوں کہ اس میں انسانوں کو جمع کرنے کی خاصیت ہے۔

کلمہ سے مراد الفاظ نہیں ہیں، بلکہ معانی ہیں۔ اعتقاد اور تخیل کو بھی اس لحاظ سے کلمہ کہتے ہیں کہ وہ الفاظ ہی کا جامہ پہن کر ذہن سے باہر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ تخیل کلمۂ جامعہ کہا جا سکتا ہے جو انسانوں کی کسی بڑی تعداد کو جمع کر کے ایک قوم بنا دیتا ہو۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جس کی بنا پر تمام ترکی النسل قوموں کو ایک قوم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جو جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد کی کوششوں میں کام کر رہا ہے۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جو سامی نسل کی قوموں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے سرگرم کار ہے۔ اور وہ سب تخیلات بھی جامع کلمات ہیں جو ایک زبان بولنے والوں یا ایک نسل کے فرزندوں، یا ایک ملک کے باشندوں کو ایک قوم بناتے ہیں۔ مگر یہ جتنے کلمات ہیں ان سب کی جامعیت محدود ہے۔ کسی کلمہ کی وسعت کو کوئی دریا روک دیتا ہے۔ کسی کی حد بندیاں پہاڑ اور سمندر کر دیتے ہیں۔ کسی کی وسعت ایک خاص زبان کی وسعت کے ساتھ مقید ہے۔ کسی کا پھیلاؤ بس اسی حد تک ہے جس حد تک کوئی خاص نسل پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے کلمات کو ایک ملک کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے، ایک نسل کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے۔ ایک زبان بولنے والوں کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے مگر تمام دنیا کے لئے جامع نہیں کہا جا سکتا۔

اب دیکھئے کہ کیا وہ کلمہ بھی (انہی) معنوں میں جامع ہے جس نے آپ کو جمع کیا ہے۔ کیا آپ سب اس لئے جمع ہیں کہ آپ ایک ملک کے رہنے والے ہیں؟ کیا آپ اس لئے بھائی بھائی ہیں کہ آپ سب

ایک ہی زبان بولتے ہیں ؟ کیا آپ کو خون کی وحدت نے بنیان مرصوص بنایا ہے ؟ کیا آپ اس لئے ایک قوم ہیں کہ آپ کی سیاسی یا معاشی اغراض ایک ہیں ؟ آپ یقیناً جواب دیں گے کہ نہیں۔ اگر کوئی عربی بولنے والا عرب اور پشتو بولنے والا افغانی یہاں موجود ہو تو کیا آپ اس کو اپنی جماعت سے نکال دیں گے ؟ اگر کوئی حبش کا زنگی یا پولینڈ کا فرنگی یہاں آئے تو کیا اسے آپ اپنی جماعت میں شریک نہ کریں گے ؟ آپ اس کا جواب بھی نفی میں دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو جمع کرنے والا کلمہ وہ نہیں ہے جس کو پہاڑ اور دریا محدود کر سکتے ہوں، نہ وہ ہے جس کو کوئی نسل محدود کر سکتی ہو۔ نہ وہ ہے جس کو کوئی رنگ محدود کر سکتا ہو۔ نہ وہ ہے جس کو کوئی زبان یا معاشی غرض محدود کر سکتی ہو۔ بلکہ یہ وہ کلمہ ہے جو تمام روئے زمین پر محیط ہے۔ جو ساری نوع انسانی کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔ جس کو پھیلنے اور پھیل جانے سے دنیا کی کوئی مادی چیز روک نہیں سکتی۔ جس کی بندش میں کالے اور گورے، زرد اور سفید، مغربی اور مشرقی سب یکساں بندھ سکتے ہیں اس کلمہ کو ہم اسی غیر محدود وسعت کے لحاظ سے جامع کہتے ہیں۔ یہ اسی لئے جامع ہے کہ تمام عالم کے انسانوں کو جمع کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہے۔

حضرات میں آپ سے پھر ایک گہری نظر کا مطالبہ کروں گا۔ آپ ایک مسلم کی سی بصیرت سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اس صفت اور اس خاصیت کا ایک ہی کلمہ ہو سکتا ہے۔ اس کو آپ ایک مثال سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیواریں جو آپ کے سامنے کھڑی ہیں اور یہ ستون جو آپ کے سامنے استادہ ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنا ایک الگ اور مستقل وجود رکھتا ہے یہ چھت اور یہ فرش بھی بجائے خود الگ الگ ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے اندر بہت سے پتھروں اور اینٹوں کو لئے ہوئے ہے ان کے درمیان اختلاف کے سینکڑوں مادے ہیں۔ ان کی وضع مختلف ہے، ان کے مقام مختلف ہیں، ان کی سمتیں مختلف ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں، ان کے وزن اور حجم مختلف ہیں۔ غرض بہت سی چیزیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ مگر ایک چیز ان میں مشترک ہے، اور وہ

یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی عمارت کے اجزا ہیں ایک ہی مقصد کی خدمت کے لئے ان کو بنایا گیا ہے۔ اور ایک ہی انجنیر ان کا بنانے والا ہے۔ یہ ایک مادۂ اشتراک تو ان سب کو متحد و متفق کر سکتا ہے۔ باقی جتنے مادے ہیں سب اختلاف کے مادے ہیں نہ کہ اشتراک کے۔ بس اسی طرح دنیا کی مختلف رنگ مختلف زبانیں مختلف نسلیں اور مختلف وطن رکھنے والی قومیں اگر مل کر ایک قوم بن سکتی ہیں تو صرف اسی صورت سے کہ وہ سب خداوند تعالیٰ اور اسکے ملائکہ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور اس کے پاس حاضری کے دن پر ایمان لائیں اس کے سوا اور کوئی چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں ہے۔

پھر اسی دیوار کی مثال کو لے کر دیکھئے کہ اس کا رنگ سفید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی یرقان کا مریض اس کو زرد کہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کی آنکھ پر رنگین عینک چڑھی ہوئی ہو اور وہ اسے سرخ یا سبز کہدے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ضد کی وجہ سے اس کو سیاہ یا نیلا کہدے۔ بہرحال اس کے اصلی رنگ کے سوا جتنے رنگ بھی دنیا میں موجود ہیں ان سب کا اطلاق اس پر کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ جتنے اطلاقات ہوں گے سب کے سب جھوٹے ہوں گے، اور کبھی دیکھنے والی دنیا ان مختلف رنگوں کے اطلاق پر جمع نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ دنیا کبھی جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اتفاق اگر ممکن ہے تو صداقت ہی پر ممکن ہے۔ اس لئے اگر دیکھنے والے کسی قول پر متفق ہو سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ اس دیوار کو سفید کہا جائے۔ اسی طرح کائنات کے خالق اور پروردگار کے متعلق بھی بے شمار اقوال ممکن ہیں اور کہے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دو خدا ہیں کوئی تین کہتا ہے، کوئی لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں میں خدائی کو تقسیم کر دیتا ہے۔ لیکن سچی بات جس پر آسمان اور زمین کا ہر ذرہ گواہ ہے، وہ یہی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور جیسا کہ ابھی اوپر کی مثال میں آپ نے دیکھا، اگر دنیا کسی کلمہ پر متفق ہو سکتی ہے تو وہ یہی کلمہ ہے۔ اس کے سوا جتنے کلمے ہیں سب جدا کرنے والے اور اختلاف برپا کرنے والے ہیں۔

آگے بڑھئے۔ ملائکہ کے متعلق بہت سے اقوال ممکن ہیں اور کہے گئے ہیں۔ کسی نے ان کو دیوتا بنایا

کسی نے انھیں شفیع ٹھیرایا کسی نے ان کو خدائی میں شریک کیا لیکن سچی بات ایک ہی ہے کہ ملائکہ خدا کے خادم ہیں اور امر الٰہی کے خلاف حرکت کرنے کی قدرت ان میں ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔ اگر دنیا میں اتفاق ممکن ہے تو اسی سچی بات پر ممکن ہے باقی سب اختلاف کی بنیادیں ہیں۔

یہی معاملہ انبیاء اور کتابوں کا ہے۔ ہر قوم اپنے اپنے پیشوا اور اپنی اپنی کتاب کو لیکر الگ ہوگئی ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ ہر قوم کہہ سکتی ہے کہ میرا پیشوا سچا اور باقی سب جھوٹے۔ ہر قوم کہہ سکتی ہے کہ میری کتاب سچی اور باقی سب کتابیں جھوٹی۔ مختلف اقوال قوموں کو ملانے والے نہیں بلکہ جدا کرنے والے ہیں۔ سب کو ملا کر ایک قوم بنانے والا اگر کوئی قول ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ خدا کے جتنے رسول مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں آئے ہیں سب سچے تھے، جتنی کتابیں خدا کی طرف سے مختلف قوموں کے رسول لے کر آئے سب حق اور نیکی کی تعلیم دینے والی تھیں۔

اسی طرح دنیا کے انجام اور نوع انسانی کے خاتمہ کے متعلق بھی مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں اور کہی گئی ہیں لیکن دل جس صداقت پر ٹھکتا ہے وہ ایک ہی ہے کہ ہم سب کو ایک دن اپنے خالق کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔ اگر دنیا متفق ہو سکتی ہے تو اسی صداقت پر ہو سکتی ہے باقی جتنی باتیں اس کے خلاف ہیں ان میں اختلاف کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہی پانچ چیزیں ہیں جن کے اعتقاد کا نام ہم نے کلمۂ جامعہ رکھا ہے۔

"اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۲ : ۴۰ ا)	رسول ایمان لایا اس کتاب پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے آتاری گئی ہے، اور مومن بھی اس پر ایمان لائے یہ سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، اور کہا کہ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے

اور ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ پروردگار ہم تیری ہی مغفرت کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف واپس جانا ہے۔

ان پانچوں صداقتوں کا ظاہر کرنے والا خدا ہے اور دنیا میں پیش کرنے والا .... خدا کا رسول ہے اس لئے ان سب کے تفصیلی بیان کو مختصر کر کے ایک چھوٹا سا کلمہ بنا دیا گیا ہے اور وہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ خدا کی یکتائی کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اقرار یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ ان سب صداقتوں پر ایمان لے آئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے پیش فرمائی ہیں۔

حضرات:—

یہی وہ قول ہے جس کو بھاری اور ثقیل بات کہا گیا ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳:۵) یہ کسی پتّے یا کاغذ کے پرزے کی طرح نہیں ہے کہ معمولی ہوا کے جھونکے اس کو اڑا لے جائیں جس کو ایک جگہ قرار نصیب نہ ہو۔ جو ہر نئے اکتشاف، ہر نئے نظریے، ہر نئے تخیل کے ساتھ پلٹیاں کھاتا چلا جائے۔ یہ تو پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم قول ہے کہ ہواؤں کے طوفان آئیں اور گذر جائیں، پانی کے سیلاب اُمڈیں اور بیٹھ جائیں مگر یہ اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں۔ یہی بات ہے کہ جس کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:—

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ	یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے کہ اللہ نے پاکیزہ کلمہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ وہ ایک اچھی ذات کے درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین میں خوب جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے اذن سے پھل لاتا ہے۔ اللہ لوگوں کے سامنے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ (۱۴: ۴)	یہ مثالیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ سبق حاصل کریں اور بُرے کلمہ کی مثال ایک بُرے بداصل درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح ہی پر سے اکھاڑ کر پھینکا جاتا ہے۔ اس کو کوئی قرار اور جماؤ نصیب ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو ایک مضبوط قول کے ساتھ دنیا میں بھی ثبات بخشتا ہے اور آخرت میں بھی

اور جو ظالم اس قول سے انکار کرتے ہیں ان کو وہ بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس تمثیل نے بات کو بالکل واضح کر دیا۔ زمین میں ثبات اور قرار اور پھیلاؤ اسی کلمہ کو نصیب ہو سکتا ہے جو پاک اور سچا اور جامع کلمہ ہے اس کے سوا جتنے کلمے ہیں سب کے سب بداصل کلمے ہیں کسی کو ثبات و قرار نصیب ہونے والا نہیں ہے۔ وہ خودرو درخت ہیں۔ آج اُگے اور کل اکھڑ گئے۔ زمانہ کا ہر نیا حادثہ، وقت کا ہر نیا تغیر ایک نیا پودا اگاتا ہے اور پچھلے پودوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ان پودوں میں برگ و بار لانے کی صلاحیت نہیں۔ اور اگر یہ بار لاتے بھی ہیں تو کڑوے کسیلے۔ بلکہ زہریلے دنیا آج انہی پودوں کے خطرناک پھلوں سے مصیبتوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان پودوں سے کہیں ترزو بیکنڈا پیدا ہوتا ہے کہیں ان سے زہریلی گیسیں نکلتی ہیں کہیں ان سے پھٹنے اور آگ لگانے والے بم جھڑتے ہیں کہیں ان سے نفاق اور عداوت اور حسد و بغض کے بیج نکلتے ہیں جن کی قسمت میں خدا کا غذا لکھا ہے انہیں چھوڑیے کہ وہ ان پودوں سے دل بہلائیں۔ آپ کے پاس تو وہ پاک اور صحیح الاصل درخت موجود ہے جو ہبوط آدم کے وقت سے آج تک کبھی نہ اکھڑا نہ بے برگ و بار رہا۔ اس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور اس عالم میں جہاں تک بلندی ہے اس کی شاخیں وہاں تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اس درخت سے ہمیشہ امن اور سلامتی کا پھل پیدا ہوا ہے۔ یہ آدم کے کسی بیٹے اور مٹی کو

اپنے سایہ میں پناہ لینے اور اپنے پھلوں کا فائدہ اٹھانے سے نہیں روکتا۔ یہ کسی سے نہیں پوچھتا کہ تو کس نسل سے ہے؟ کیا زبان بولتا ہے؟ کہاں کا باشندہ ہے؟ اس کے سایہ کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کے نیچے آ گیا وہ انساب کا تفاخر بھول گیا، زبانوں کا فرق، رنگوں کا امتیاز، ملکوں کا اختلاف اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گیا۔ اور اس کی روح میں یہ تعلیم سما گئی کہ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۴۸: ۲۹)۔

برادران ملت۔

یہ کلمہ اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ تمام نوع انسانی ایک بڑی اور عالمگیر صداقت پر متفق ہو سکے اور بے شمار مادی اور عقلی اختلافات کے باوجود ایک امر مشترک ایسا ہو جس میں سب بنی آدم ایک دوسرے کے بھائی بن جائیں۔ اسی لئے ایمان کی بنا ایسے امور پر رکھی گئی تھی جن میں بڑی وسعت تھی اور جو ساری نوع انسانی کو اپنے دامن میں لے سکتے تھے۔ اسی لئے اس کلمہ کو پیش کرنے والے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ اسی لئے کہا گیا تھا کہ جو اس کلمہ کا قائل ہو جائے اس کا خون حرام ہے، اس کا مال حرام ہے، اس کی عزت حرام ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کو قتل کرنے والا دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہے اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والا فاسق ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے اس سب سے بڑے جامع کلمے کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ خدا کا فرمان تھا کہ جو خدا، ملائکہ، کتابوں، رسولوں اور یوم آخر کو مانے وہ مسلم ہے۔ مگر ہم نے کچھ دوسری چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار رکھا اور ان پانچوں امور پر ایمان لانے والوں میں بھی بے تکلف کفر کی لعنت تقسیم کی۔ اس کلمۂ جامعہ کے ہوتے ہوئے بھی ہم اس طرح بچھڑ گئے کہ گویا ہم الگ الگ ہیں۔ ہم نے عملاً اپنی قومیں الگ بنا لیں، اپنی مسجدیں الگ کر لیں، اپنی نمازیں الگ

کریں اپنے درمیان سے مناکحت اور مصاہرت کے رشتے توڑ دیے اور اس برادری کے تعلق کو قطع کر دیا
جو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہکر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور مصیبت آئی دوسری
قوموں سے ہم نے قومیت کا نیا سبق حاصل کیا جو اسلام کی روح اور اس کی تعلیم کے سراسر منافی تھا۔
جن جاہلی عصبیتوں کا مٹانا اسلامی تعلیم کے اولین مقاصد میں سے تھا وہ سب ہم میں پیدا ہوگئیں۔ کسی نے
پین تورانی تحریک کا علم بلند کیا۔ کسی نے پین عرب تحریک اٹھائی۔ کسی نے آریائی نسلیت کا چرچا کیا۔ کسی نے
وطنی قومیتوں میں جذب ہوجانے کا اعلان کیا۔ غرض مختلف مذہبی اور سیاسی تحریکوں نے اپنی پوری
قوت اسلام کے اس کلمۂ جامعہ کو پارہ پارہ کرنے میں صرف کر دی جو انہی تمام تفریقوں کو مٹا کر
نوع انسانی کی ایک عالمگیر برادری قائم کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

میرا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے کہ اس کلمۂ جامعہ کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا تھا۔ اختلاف
تو ایک فطری امر ہے جس کا مٹنا ممکن نہیں ہے۔ نہ رنگوں اور نسلوں کا اختلاف مٹ سکتا ہے نہ زبانوں و ملکوں کا اختلاف
نہ خیالات اور طبائع کا اختلاف مٹ سکتا ہے۔ اور جب یہ نہیں مٹ سکتا تو ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی طور سے نوع
انسانی کے گروہوں میں اعتقاد و عمل اور اغراض کے لحاظ سے اختلاف ضرور باقی رہے گا۔ لیکن
کلمۂ جامعہ کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ ان سارے فطری اختلافات کے باقی رہتے ہوئے ایک ایسا عقلی مادہ
مہیا کر دیا جائے جس میں تمام ایمان لانے والے مشترک ہو کر آپس میں متحد و متفق ہوجائیں اور اس عقلی اتفاق
و اتحاد کے اثر سے ان کے وہ اختلافات اس حد تک دب جائیں کہ دلوں کا اختلاف اور اغراض کا تصادم
باقی نہ رہے جو فتنہ و فساد کا اصل موجب ہے۔ اسی مقصد کے لئے ایک جامع کلمہ کے ساتھ نماز میں جماعت
کی تاکید کی گئی، تمام دنیا کے لئے ایک قبلہ مقرر کیا گیا، روزے اور حج کو اجتماعی صورت دی گئی اور
مسلمانوں کے درمیان کھانے پینے میں مناکحت میں اور زندگی کے دوسرے مسائل میں کسی قسم کا
امتیاز باقی نہ رکھا گیا۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ دین کا اتحاد تمام چھوٹے اختلافات پر غالب رہے

اور ساری دنیا کے مسلمان مل کر ایک قوم بنے ہیں لیکن آج ہماری مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیاں اس قومیت کے رشتہ کو توڑ رہی ہیں، اور اس تعلق کو کاٹ رہی ہیں جو کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ کہنے والوں کے درمیان خود اللہ تعالیٰ نے قائم کیا تھا۔

بھائیو! اگر تمہارے شہر سے متصل کوئی بڑا زبردست بند کسی دریا کے سیلاب کو روکے کھڑا ہو، اور تمہارے شہر کی سلامتی اسی بند کی مضبوطی پر منحصر ہو، اور تم دیکھو کہ اس بند میں شگاف پڑ رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ساری قوتیں ان شگافوں کو بھرنے اور اس بند کی حفاظت کرنے میں صرف کر دوگے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ فتنہ و فساد اور حسد و نفاق اور عداوت و دشمنی کے عظیم الشان اور ہولناک سیلاب کو جو زبردست بند روکے کھڑا ہے، اور جس کی مضبوطی پر سارے دار الاسلام کا بقا و تحفظ منحصر ہے اس میں ہر طرف سے شگاف پر شگاف پڑ رہے ہیں۔ مگر تم کو اس کی کچھ فکر نہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اس بند عظیم کی حفاظت اتنا مقدس کام ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے شگافوں کو بھرنے کے لئے اپنا سر بھی دیدے، تو اس کام کی نسبت سے یہ کوئی بڑی قربانی نہ ہوگی۔ اس سے بھی بڑی قربانی اگر کوئی ممکن ہوتی تو اس کے لئے وہ بھی کرنی چاہئے تھی۔

کتب سماوی پر ایک نظر

(۵)

عہد جدید۔ (اناجیل وغیرہ)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

انجیل مرقس اسکاٹ صاحب اپنی روشن تفسیر صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"مرقس کا حال جس نے یہ کتاب لکھی بہت معلوم نہیں ہے۔ اکثر سمجھتے ہیں کہ وہ مسیح کے شتر شاگردوں میں سے تھا لیکن اس میں ایک شبہ یہ ہے کہ پطرس اُسے اپنا بیٹا کہتا ہے۔ (اول پطرس باب ۵ آیہ ۱۳) جس سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ پطرس کے وسیلہ سے ایماندار ہوا (یعنی عیسائی ہوا)۔ یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا مگر گمان غالب ہے کہ اُس کی تصنیف ۵۶ء اور ۶۳ء کے درمیان میں ہوئی سب متفق طور پر کہتے ہیں کہ شہر روم میں اس کی تصنیف ہوئی۔"

دیگر عیسائی مصنفین کی تحریروں سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ مرقس کو عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت نصیب نہ ہوئی تھی بلکہ پطرس کے ہاتھ پر اس نے عیسائیت قبول کی اور جو تعلیم اُس نے پطرس سے حاصل کی اُسے رومی یعنی لاطینی زبان میں لکھکر شہر روم میں اُس نے اپنی انجیل کو تصنیف کیا۔ یہ لاطینی زبان والی اصلی انجیل مرقس گم ہے اور اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس لاطینی انجیل کے چند اجزاء ونیس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اور وہاں کے لوگ اُن اجزاء کو اصلی خیال کرتے ہیں۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مرقس نے اپنی انجیل لکھکر اپنے اُستاد پطرس کو دکھلائی ہو اور لیڈر ملے اور ......

نظر ثانی کی ہو کیونکہ سینٹ ارینوس ۱۷۸ء میں لکھتے ہیں کہ "پطرس کے مرید اور مترجم مرقس نے بعد موت پطرس اور پلوس کے وہ چیزیں جو پطرس نے وعظ کی تھیں لکھ کر دیں۔" پھر یونانی ترجمہ میں غلطیوں کے ہونے کا بھی عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے چنانچہ وارڈ صاحب اپنے اغلاط نامہ میں لکھتے ہیں کہ بقول جیروم کے علمائے متقدمین کو اس انجیل کے آخری باب کی صحت میں شبہ تھا مرقس باب ۲ آیہ ۲۶ میں جو لفظ ابیاتھر آیا ہے اس کی بابت بھی وارڈ صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ :- "مسٹر جبل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مرقس نے غلطی سے اخیملک کی جگہ ابیاتھر لکھا ہے اور متی نے غلطی سے ذکریاہ کی جگہ یرمیاہ لکھا ہے"۔

اس تصنیف کی تاریخ بھی مشکوک ہے۔ ہارن صاحب اپنی تفسیر کی جلد ۴ حصہ ۲ باب ۲ میں لکھتے ہیں کہ

"انجیلوں کی تالیف کے متعلق جو احوال ہمکو قدیم مورخین کلیسا سے ملے ہیں وہ ایسے غیر معین اور ابتر ہیں کہ کسی ایک امر معین کی جانب نہیں پہنچاتے اور پرانے پرانے قدمائے اپنے وقت کی گپوں کو سچ سمجھکر لکھدیا اور ان لوگوں نے جو بعد ان کے ہوئے ادب کرکے ان کے لکھے ہوئے کو قبول کرلیا اور یہ روایتیں جھوٹی سچی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے تک پہنچیں اور بعد گذرنے مدت دراز کے تنقید ان کی متعذر ہوگئی"

چنانچہ اسی جلد میں ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ پہلی انجیل ۳۷ء یا ۳۸ء یا ۴۱ء یا ۴۳ء یا ۴۸ء یا ۶۱ء یا ۶۲ء یا ۶۳ء یا ۶۴ء عیسوی میں تالیف ہوئی اور دوسری انجیل ۵۶ء سے ۶۵ء تک غالباً ۶۰ء یا ۶۳ء میں اور تیسری انجیل ۵۳ء یا ۶۳ء یا ۶۴ء میں اور چوتھی انجیل ۶۸ء یا ۶۹ء یا ۷۰ء یا ۸۹ء یا ۹۸ء عیسوی میں۔

مسٹر فلپ ویبن اپنی کتاب "دی چرچز اینڈ ماڈرن تھاٹ" (یعنی کلیسا اور خیالات جدید) کے صفحہ ۹۸ و ۹۹ پر لکھتے ہیں کہ :-

ڈاکٹر رابن سن کو تو اس بات کا اقرار بالیقین شکوک ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ دوسری صدی کی یہ روایت کہ انجیل دوم کا مصنف سینٹ مارک (مرقس) ہے معتبر ہے

اور یہ کہ مارک پطرس حواری کا ترجمان تھا اور اپنی انجیل کو حواری مذکور کی روایت سے اس نے روما میں تحریر کیا۔ بہت خوب۔ ہم اس نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں یعنی یوں سمجھو کہ ایک انجیل کی روایت ایسے راوی سے ہے جو چشم دید روایت بیان کرتا ہے لیکن اس راوی کو صرف ایک سال (اور بقول رجعت پسند نا قدین تین سال) صحبت مسیح حاصل ہوئی۔ یہ حواری ناخواندہ تھا تیس یا چالیس سال کے بعد وہ روایت کرتا ہے جس کو دوسرا شخص (مرقس) غیر زبان میں تحریر کرتا ہے، اور پھر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ترجمہ کہاں تک اصل کے مطابق ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر ابن سن اپنے ابواب "وعظ کبیر اور غیر مرقسی دستاویز" میں مرقس کے انجیل کی اہم فروگذاشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ × × × × × × × یہ اہم فروگذاشتیں کیا ہیں؟ کیا ہم ان کو معمولی سمجھیں؟ ہم کو خود ان کا تھوڑا سا انتخاب کرکے فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس انجیل میں حضرت عیسیٰ کی بطور اعجاز پیدائش کا نہ کچھ ذکر ہے اور نہ آپ کے عہد طفولیت کے حالات جو کہ سابقہ پیشنگوئی کی تصدیق میں ہوں۔ اسیطرح پہاڑی والے مشہور وعظ کا بھی کچھ ذکر نہیں۔ دوبارہ زندہ ہوجانے کا قصہ صرف چند سطروں میں مذکور ہے اور آسمان پر تشریف لے جانا صرف ایک سطر میں۔ بدقسمتی سے یہی وہ سطریں ہیں جو بالاتفاق الحاقی مانی جاتی ہیں کیونکہ انجیل مرقس کا حقیقت میں باب ۱۶ آیۃ ۸ پر خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے نہ حلول نہ بہشت ثانی نہ صعود کسی مسئلہ کا بھی وہاں ذکر نہیں۔ زبانی روایات، گم شدہ دستاویزیں اور نامعلوم کاتب بس یہی وہ ذریعے رہگئے جن سے ہمکو ان تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح رواں ہیں کیا اس سے بڑھکر اور بھی کوئی ناقابل اطمینان امر ہے جس سے سچی صداقت

اور انجیل کی حقانیت پر شبہ عائد ہوتا ہو؟

انجیل لوقا لوقا انطاکیہ کا رہنے والا ایک طبیب تھا اور عیسائی مصنفین کا اتفاق ہے کہ وہ غیر اقوام میں سے تھا۔ اس سے دو کتابیں منسوب ہیں۔ ایک انجیل لوقا دوسری رسولوں کے اعمال۔ بقول مصنف مفتاح الکتاب لوقا نے انجیل ۶۳ء کے قریب اور اعمال ۶۴ء کے قریب لکھی۔

بعض مسیحی علماء کا گمان ہے کہ لوقا عیسیٰ علیہ السلام کے ستر (۷۰) شاگردوں میں سے تھا مگر خود لوقا ہی کی انجیل سے اس گمان کی تردید ہوتی ہے۔ اول تو ان ستر (۷۰) شاگردوں کا ذکر ہی سوا انجیل لوقا کے کسی اور انجیل میں مذکور نہیں۔ نہ ان کے نام کسی کو معلوم ہیں حالانکہ اتنی بڑی بات کا ذکر اور انجیلوں میں بھی ہونا چاہیئے تھا جیسا کہ (۱۲) بارہ حواریوں کے احوال سے تمام انجیلیں بھری پڑی ہیں۔ دوسرے یہ کہ لوقا نے خود ہی اپنی انجیل کی تمہید میں لکھا ہے کہ جنہوں نے مسیح کو دیکھا تھا اور مسیح کی خدمت کی تھی اُن سے پوچھکر میں لکھتا ہوں اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ لوقا نے مسیح کو نہیں دیکھا۔ دوسرے یہ کہ اس نے جو کچھ لکھا وہ الہام سے نہیں لکھا بلکہ لوگوں سے پوچھکر لکھا۔

اکثر عیسائی علماء بھی لوقا کو پولوس کا شاگرد اور ترجمان قرار دیتے ہیں اور پولوس کی نسبت یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے مسیح کی صورت بھی دور سے دیکھی ہو چہ جائے کہ مسیح کی خدمت اور شاگردی کی ہو۔ اردو تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۷۱ء کے صفحہ ۴۴ پر ہے کہ:۔

"جب پلوس شہر تر واس میں گیا جو بحر روم کے ساحل پر واقع ہے تو یہاں اس سے اور لوقا سے ملاقات ہوئی اور اس وقت سے برابر لوقا پلوس کے ساتھ رہا۔"

پھر اسی صفحہ کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت بھی درج ہے کہ:۔

"یہ اس کی عبارت سے ظاہر ہے کیونکہ وہ اس کے بعد اعمال الرسل کے آخر تک صیغہ جمع استعمال میں لاتا ہے۔ لوقا کی انجیل اور اعمال الرسل دونوں اسی کی تصنیف ہیں۔"

اس سلسلہ میں مغالطہ میں ڈالنے والی ایک اور بات بھی پیدا ہوئی ہے۔ پادری وائٹ صاحب کے زیر اہتمام ۱۸۶۶ء میں مشن پریس الہ آباد سے ایک کتاب "قربت الٰہی" کے نام سے شایع ہوئی تھی اس کے صفحہ ۵۹ پر واقعات درج ہیں کہ آتش پرستوں کے مذہب کی تائید میں ایک کتاب قسطا کے نام سے موسوم ہے جس کا مصنف بھی ایک ایسا شخص ہے جس کا نام لوقا ہے۔ یہ لوقا بھی غیر یہودی تھا اور طبیب تھا حسنِ تصنیف بھی تھا اور شہرہ آفاق بھی اور اسکا بھی زمانہ عروج مسیح کے بعد تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جسمیں لوگ اپنی طرف سے کتابیں لکھکر مشہور و معروف لوگوں کے نام سے موسوم کر دیا کرتے تھے۔

انجیل لوقا کے باب ۳ میں مسیح کا جو نسب نامہ درج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو انجیل متی میں دیا گیا ہے اور اس میں چند صریح غلطیاں بھی ہیں جن کی تفصیل کو طوالت کے خیال سے سردست نظر انداز کیا جاتا ہے بعض عیسائی علمار نے ان دونوں نسب ناموں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور بڑی کھینچ تان سے کام لیا ہے مگر جان کالون اپنی تفسیر میں ان تمام بناوٹ کی باتوں کی تردید کرتا ہے۔

انجیل یوحنا بقول بعض عیسائی مصنفین کے یوحنا کی انجیل سب سے زیادہ معتبر ہے اگرچہ زمانہ تصنیف کے لحاظ سے سب سے زیادہ موخر ہے مکاشفات یوحنا اور انجیل یوحنا دونوں ایک ہی مصنف کی تصنیف بیان کی جاتی ہیں۔ مکاشفات کی تاریخ تصنیف مختلف طور پر ۶۸ء سے ۹۵ء ۹۶ء اور ۹۷ء اور انجیل یوحنا کی تاریخ ۹۸ء سے ۱۶۰ء تک بیان کی گئی ہے مگر بعض عیسائی مصنفین ہی نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپنے انداز بیان سے ایک مصنف کی لکھی ہوئی نہیں معلوم ہوتیں۔ مکاشفات میں یوحنا نے جا بجا اپنی جانب کہیں "میں" کہیں "مجھ یوحنا نے" سے اشارہ کیا ہے لیکن یوحنا کی انجیل میں عبارت کا ڈھنگ ایسا ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ انجیل یوحنا کی لکھی ہوئی ہے۔ یوحنا باب ۱۹ آیہ ۲۶ میں ہے کہ: "یسوع نے اپنی ماں کو اور اس شاگرد کو جسے وہ پیار کرتا تھا۔۔۔" اور باب ۲۰ آیہ ۲ میں ہے کہ: "تب وہ شمعون پطرس اور اس دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع پیار کرتا تھا۔۔۔" پھر اسی باب کی آیہ ۳ میں

ہے کہ: "پھر پطرس اور وہ دوسرا شاگرد نکلے اور قبر کی طرف گئے"۔ باب ۲۱ کی آیات ۲۰ و ۲۳ میں بھی اسی طرح "اُس شاگرد" اور "وہ شاگرد" کے الفاظ آئے ہیں بعض عیسائی گمان کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں "اُس شاگرد" سے یوحنا اپنی جانب اشارہ کرتا ہے مگر تامس اسکاٹ اپنی تفسیر کے صفحہ ۲۱۱ پر اس گمان کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اسی شاگرد بصیغۂ غائب کے سلسلہ میں ایک اور اقتباس بھی ہے جو اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ انجیل یوحنا کے اختتام پر باب ۲۱ آیہ ۲۴ میں ہے کہ: "یہ وہ شاگرد ہے جس نے ان کاموں کی گواہی دی اور ان باتوں کو لکھا اور ہم کو یقین ہے کہ اُس کی گواہی سچ ہے"۔ ظاہر ہے کہ کوئی مصنف اپنی شان میں اس قسم کا فقرہ نہیں لکھ سکتا۔ پھر یہ بات کہ جس نے اِن کاموں کی گواہی دی اور ان باتوں کو لکھا اُس کی اور اُس کی شہادت کی صداقت کا ہمکو یقین ہے صاف دلالت کرتی ہے کہ کتاب کا لکھنے والا کوئی اور شخص ہے اور اُس کی صداقت پر یقین کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہے۔ کاتب بصیغۂ غائب بھی لامعلوم اور کاتب کی صداقت پر گواہی دینے والا بصیغۂ حاضر بھی لامعلوم۔ نہ کاتب سے کوئی واقف نہ یقین کرنے والے گواہ سے کوئی باخبر۔ صرف ظنیات ہیں اور انجیل موجودہ، اور وہ مشکوک بلکہ بے اعتقادی جن سے بعض تعلیمیافتہ اور سمجھدار عیسائی تک محفوظ نہیں۔

برٹشنیڈر عیسائیوں میں ایک بڑا محقق گذرا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ یہ انجیل اور دیگر نامے یوحنا کی تصنیف نہیں بلکہ انہیں کسی عیسائی نے دوسری صدی کے شروع میں یوحنا کے نام سے لکھدیا۔ دوسری صدی عیسوی میں عیسائیوں کا ایک فرقہ آلوجین کے نام سے مشہور تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں کا بھی اس انجیل کے متعلق یہی عقیدہ تھا۔ اسٹاڈلن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ بلاشک مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے اس انجیل کو تصنیف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب دوسری صدی میں لوگوں نے اس انجیل سے انکار کیا تو اس کے جواب میں ارنیوس نے کہیں نہیں کہا کہ پولی کارپ سے مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ انجیل یوحنا حواری کی تصنیف ہے حالانکہ ارنیوس شاگرد تھا پولی کارپ کا اور پولی کارپ مرید تھا یوحنا حواری کا

اور ارنیوس نے ذرا اور اسی بات پولی کارپ سے بار بار سنی۔ اگر یہ انجیل یوحنا کی ہوتی تو منکرین کے مقابلہ میں ارنیوس ضرور پولی کارپ کی سند پیش کرتا اور اس انجیل کی حقانیت کو آشکارا کرتا۔ گروٹیس بھی عیسائیوں میں ایک زبردست عالم و محقق گذرا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس انجیل کا اکیسواں باب الحاقی ہے جسے یوحنا کی موت کے بعد افسس کے کلیسا نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

مندرجۂ بالا خیالات وہ ہیں جو عیسائی مصنفین ہی کے قلم سے ظاہر ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے انجیل کا احترام ہمیشہ اہل کتاب سے زاید کیا۔ وہ اس ساری انجیل کو از اول تا بہ آخر جعلی اور الحاقی قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اس کے بعض مضامین کو قرآن کے مطابق پاتے ہیں اور اس میں کی بعض پیشینگوئیوں کو سچا سمجھتے ہیں گو ان کے مفہوم میں انھیں عیسائیوں سے اختلاف ہو۔

اعمال مثل انجیل لوقا کے "رسولوں کے اعمال" کو بھی لوقا سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کتاب میں صرف پطرس اور پولوس کے تاریخی حالات درج ہیں اور ظاہر ہے کہ تاریخی واقعات کی قلمبندی کو الہام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جو واقعات کہ قلمبند کئے گئے ہیں وہ صرف ذاتی معلومات کی بنا پر ہیں نہ کہ الہام کے تحت ہیں اور ایسی کتاب کا بائیبل میں شامل کیا جانا تعجب انگیز ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں ہی میں سے فرقہ والن ٹی نینس اور مارسیونی اور سویرینس و نیز چند دیگر فرقوں نے بھی اس کتاب کے معتبر ہونے سے انکار کیا ہے۔

پولوس کے خطوط کتاب اعمال کے بعد مجموعہ کتب عہد جدید میں پولوس کے (۱۴) خطوط درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط جو عبرانیوں کے نام ہے عام طور پر مشکوک ٹھیر گیا ہے۔ کتاب "سوال و جواب" مترجمہ پادری یونس سنگھ اور پادری والش صاحب میں سوال ۱۵۲ کے جواب میں عبرانیوں کے خط کے متعلق یوں لکھا ہے کہ اس کی بابت لوگوں میں بڑا اختلاف ہے "بہتیرے اسے پولوس سے نسبت دیتے ہیں اور بہت سے عالی سند نکتہ دان اس بات کو اعتماد کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ پر اس کے راقم کا تصفیہ نہیں کر سکتے"۔ پھر

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ "وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا طرز پلوس کے طرز کے مانند نہیں اکثر مقامات میں اس کے طرز سے اختلاف پڑتا ہے۔ جو لوگ کہ یونانی کا بخوبی علم رکھتے ہیں وے کہتے ہیں کہ اس خط کی یونانی پلوس کی یونانی سے مشابہ نہیں ہے" یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس خط میں راقم کے نام کا کہیں ذکر نہیں۔ تاریخ یوسی بیس کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اُرجن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "جو احوال قبل ہمارے زبان زد رہا ہے یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ کلیمنٹ نے جو روم کا بشپ تھا نامہ عبرانیوں کو تصنیف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ لوقا کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ اریمیں بشپ لینس (تخمیناً ۱۷۸ء) اور ہپ پولٹس (۲۲۰ء) اور نوئی لس پریسبیٹر روم (تخمیناً ۲۵۱ء) نے اس نامہ سے بالکل انکار کیا ہے۔ ٹرٹیلین جو ۲۰۰ء کے قریب کارتھیج کا پریسبیٹر تھا عبرانیوں کے نامہ کو نامہ برنباہ بتلاتا ہے کیس جو ۲۱۲ء کے قریب روم کا پریسبیٹر تھا پولوس کے صرف تیرہ (۱۳) نامے گنتا ہے اور نامہ عبرانیوں کو شمار میں نہیں لاتا سائی پرن جو ۲۴۸ء میں کارتھیج کا بشپ گذرا ہے اپنی تحریروں میں اس نامہ کا سرے سے حوالہ ہی نہیں دیتا۔

مندرجہ بالا بحث پولوس کے صرف ایک خط کے متعلق تھی مگر ان کے تمام خطوط عیسائی مصنفین کے ہی ہاتھ سے مجروح ہو چکے ہیں۔ پادری فاکس صاحب اپنی تفسیر اعمال مطبوعہ الہ آباد ۱۸۶۷ء کے مقدمہ کتاب کے صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں کہ کتاب اعمال میں باب ۱۳ سے لیکر باب ۲۸ تک پولوس کے تمام واقعات و حالات و اعمال کا ذکر ہے مگر پولوس کے ان خطوط کا کہیں ذکر نہیں۔ یوسی بیس اپنی تاریخ کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اُرجن کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "پولوس نے تمام گرجوں کو کچھ لکھکر نہیں بھیجا مگر بعض کو جو لکھا تو بھی دو چار سطر عبارت"۔ لارڈنر صاحب اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۷ء جلد ۲ صفحہ ۳۸۳ پر ارجن کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ فرقہ ابیونی کے دونوں گروہوں نے پولوس کے نامجات کو رد کیا تھا اور پولوس کو دانا اور نیک آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ یوسی بیس بھی اس قول کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابیونیوں کے نزدیک پولوس

توریت سے منحرف تھا۔

افسیون کے نام پہلا خط جس کا حوالہ افسیون کے باب ۳ آیہ ۳ و ۴ میں موجود ہے مجموعہ کتب عہد جدید میں شامل نہیں تعجب ہے کہ پولوس کے جو خطوط انجیل میں شامل ہیں اُن کا تو کہیں سے کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچا لیکن جن خطوط کا ثبوت انجیل مروجہ میں ملتا بھی ہے اُن کا کہیں پتا نہیں۔

اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خطوط پولوس ہی کے لکھے ہوئے ہیں تو ان خطوط کے الہامی ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اول قرنتیوں کے باب ۷ آیہ ۱۲ میں پولوس لکھتا ہے کہ:۔

"پر باقیوں کو خداوند نہیں میں کہتا ہوں....."

جس سے صاف ظاہر ہے کہ پولوس اپنی طرف سے لکھ رہا ہے اور جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اپنی رائے سے لکھ رہا ہے نہ کہ الہام سے کیونکہ اگر الہام سے لکھتا تو وہ لکھا ہوا خداوند کی طرف سے ہوتا۔ اسی طرح اسی باب کی آیہ ۲۵ میں وہ لکھتا ہے کہ:۔

"پر کنواریوں کے حق میں خداوند کا کوئی حکم مجھ پاس نہیں لیکن جیسا دیانتدار ہونے کے لئے مجھ پر خداوند کی طرف سے رحم ہوا ویسا ہی میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں۔"

دوم قرنتیون کے باب ۸ آیہ ۸ میں پولوس لکھتا ہے کہ:۔

"میں کچھ حکم کے طور پر نہیں بلکہ اوروں کی سرگرمی کے سبب اور تمہاری محبت کی حقیقت آزمانے کے لئے یہ کہتا ہوں۔"

اس نوع کی عبارت کو الہام ربانی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگر انجیل مروجہ کو خدا کی کتاب یا عیسیٰ مسیح کی کتاب قرار دیا جاتا ہے تو پولوس کی ذاتی تحریروں کی اُس میں شمولیت کیونکر جائز ہو سکتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ یہ تحریریں بھی ہر اعتبار سے مشکوک ہوں اور پولوس ان بارہ تخت نشینوں میں سے بھی نہ ہو جن کی نشاندہی مسیح نے کی اور جنہیں تخت نشینی کی بشارت دی گئی جیسا کہ متی باب ۱۹ آیہ ۲۸ میں ذکر آیا ہے

یعقوب کا خط فرقہ پراٹسٹنٹ کے پیشوا مارٹن لوتھر نامہ یعقوب کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے کہ " یہ کھوکھلا پھوس ہے" یعنی نہایت بے قدر اور ناقابل اعتبار۔ وارڈ صاحب اپنی کتاب " اغلاط نامہ " کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں کہ :۔

"بومرن جو کہ شاگرد رشید لوتھر اور علمائے کبار فرقہ پراٹسٹنٹ سے ہے لکھتا ہے کہ یعقوب اپنے نامہ کو واہیات میں تمام کرتا ہے اور حوالہ کتابوں کا ایسا مختلف دیتا ہے کہ جس میں روح القدس نہیں رہ سکتا اس لئے وہ نامہ الہامی کتابوں میں نہ گنا جائے"۔

یعقوب باب ۵ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :۔

"اگر کوئی تم میں بیمار پڑے تو کلیسے کے بزرگوں کو پاس بلائے اور وے خداوند کے نام سے اس پر تیل ڈھال کے اس کے لئے دعا مانگیں"

مندرجہ بالا حکم کے متعلق مارٹن لوتھر لکھتے ہیں کہ :۔

"گو یہ نامہ یعقوب کا ہو مگر میں جواب دیتا ہوں کہ حواری کو نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے سکرمنٹ (یعنی حکم شرعی) بنا دے۔ یہ منصب صرف عیسیٰ (علیہ السلام) کا تھا"۔

یہ وہی یعقوب ہیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پولوس کو خادم دین بنایا اور یہی وہ ترکیبیں ہیں جن سے پولوسیوں کو جرأت ہوئی کہ وہ اپنی رائے سے ترمیم و تنسیخ عمل میں لاکر شریعت کی اصلی صورت کو تبدیل کر ڈالیں۔ اس اجمال کی تفصیل دوسرے موقعہ پر انشاء اللہ آئے گی۔

پطرس کے دو خطوط اس کے بعد پطرس کے دو خطوط مجموعہ میں شامل ہیں۔ پطرس کا شمار عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں ہے مگر تعجب ہے کہ بعض عیسائی مصنفین نے ان پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ عیسائی تحریریں ان کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ یہ وہی پطرس ہیں جنھیں مخاطب کر کے مسیح نے

ایک مرتبہ کہا تھا کہ :- "اے کم اعتقاد تو کیوں شک لایا" (متی۔ باب ۱۴۔ آیہ ۳۱) دوسرے موقعہ پر مسیح نے انہیں شیطان کہا متی باب ۱۶ آیہ ۲۳ میں ہے کہ :- "پر اس نے (یعنی مسیح نے) پھر کے پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدائی باتوں کا نہیں بلکہ انسان کی باتوں کا خیال رکھتا ہے"۔ بالآخر جب کہ مسیح کے مصلوب ہونیکا وقت قریب آیا تو مسیح نے پیشین گوئی کی کہ اسی رات مرغ کے بانگ دینے سے پہلے پطرس تین مرتبہ مسیح کا انکار کریگا چنانچہ یہ پیشینگوئی پوری ہوئی (دیکھو متی باب ۲۶۔ آیہ ۳۴ اور آیہ ۶۹ تا ۷۵)۔ بشر پولک پطرس پر غلطی اور انجیل سے متعلق جہالت کا الزام لگاتے ہیں۔ برنسس جو کہ بقول جویل صاحب کے ایک فاضل اہل عیسائی تھا کہتا ہے کہ حواریوں کے سردار پطرس نے اور برنباس نے بھی بعد نزول روح القدس کے غلطیاں کیں۔ جان کالون کا قول ہے کہ پطرس نے کلیسا میں بدعات پھیلائیں اور عیسائیوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈالا اور توفیق طاعت کو ان سے چھین لیا۔ اس بارہ میں وہ پطرس اور برنباس کو بہت ملامت کرتا ہے۔ دائی ٹیکر جو فرقہ پراٹسٹنٹ میں ایک زبردست عالم گذرا ہے کہتا ہے کہ :- بعد عروج مسیح اور نزول روح القدس کے سارے کلیسہ نے غلطی کی ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ خواص نے بھی۔ بلکہ حواریوں نے بھی جو غیر اسرائیلیوں کو ملت مسیحی کی جانب دعوت دی اور پطرس نے اور بھی غلطی رسوم میں کی اور یہ بڑی غلطیاں حواریوں سے بعد نزول روح القدس کے ہوئیں"۔ گلتیوں کے باب ۲ آیہ ۱۱ تا ۱۴ میں پولوس کا قول درج ہے کہ :- "پر جب پطرس انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو اس سے مقابلہ کیا اس لئے کہ وہ ملامت کے لائق تھا کیونکہ وہ پیشتر اس سے کہ کئی شخص یعقوب کی طرف سے آئے غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا پر جب وے آئے تو مختونوں سے ڈر کر پیچھے ہٹا اور الگ ہوگیا۔ اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ دورنگی کی یہاں تک کہ برنباس بھی دب کر ان کی ریا میں شریک ہوا"۔ تعجب ہے کہ جس پطرس پر ان غلطیوں اور ریاکاریوں کا الزام لگایا گیا ہے اسی پطرس کے دو خطوط کو الہامی نوشتوں میں شامل کر کے کتب مقدسہ عہد جدید میں جگہ دیجاتی ہے اور ایسی تحریروں کو انجیل مروجہ کے اجزا ترکیبی کا

مرتبہ دیا جاتا ہے۔

یوحنا کے خطوط و مکاشفات اس کے بعد یوحنا کے تین خطوط مجموعہ میں درج ہیں اور سب سے آخر میں مکاشفات پہلے خط کی بابت مفتاح الکتاب کے صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے کہ :۔ " اگرچہ اس خط کے شروع یا آخر میں یوحنا کا نام نہیں ہے مگر ہر زمانے کے لوگ اُسی رسول کو اس خط کا راقم کہتے آئے ہیں"۔ مگر یہ کچھ نہیں لکھا کہ یہ خیال کن واقعات پر مبنی ہے۔ صرف انداز عبارت اور مضامین خط سے اِن امور میں خاطر خواہ رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے خط کی بابت مفتاح الکتاب میں لکھا ہے کہ :۔ " جس برگزیدہ بی بی کو یہ لکھا گیا وہ بظاہر ایک عزت دار عالی بیوہ تھی کلیسوں میں مشہور تھی لیکن اس کی تحقیق خبر نہیں کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی۔ شاید اس کا ٹھکانا شہر افسس کے قرب و جوار میں تھا۔ اگرچہ اس خط میں راقم کا نام نہیں پایا جاتا تو بھی صحیح ہے کہ یوحنا ہی نے یہ ۶۹ئہ کے قریب لکھا"۔ تعجب ہے کہ جس خط میں نہ کاتب کا نام درج ہے، نہ مکتوب الیہا کا، نہ تاریخ تصنیف، اُس خط کی مکتوب الیہا کی سکونت کا مقام اور اس خط کی تصنیف کا سنہ مصنف مفتاح الکتاب کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا بالخصوص جبکہ عیسائی مصنفین میں اس بارہ میں اختلاف ہو۔ پادری یونس سنگھ اور پادری واٹس نے اپنی کتاب سوال و جواب میں سوال ۱۹۱ کے جواب میں یوحنا کے اس دوسرے خط کی بابت لکھا ہے کہ :۔ " بعضے گمان کرتے ہیں کہ یہ برگزیدہ بی بی یروشلم کی کلیسہ کا لقب تھا پر لوگ بالاتفاق اس بات پر قوی نہیں ہیں اور اس کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ وہ ایک عورت تھی جو اپنی دینداری کے باعث مشہور تھی"۔

ڈاکٹر ملن کا قول ہے کہ سُریا کا کلیسہ پطرس کے دوسرے خط اور یوحنا کے دوسرے اور تیسرے خطوط اور یہوداہ کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفات کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ کونسل لوڈیسا (۳۶۴ئہ) نے بھی کتاب مکاشفات کو معتبر نہیں قرار دیا۔ جروم کے عہد میں بھی بعض کلیساؤں نے اس کتاب کو نہیں مانا۔ یوسی بیس اپنی تاریخ کی کتاب ۷، باب ۲۵ میں لکھتا ہے کہ بعض نے کتاب شاہدات کو علیحدہ کر دیا ہے اور اس کے رد میں کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے اور جہالت کا بہت بڑا حجاب ہے اور یوحنا کی طرف

اس کی نسبت بالکل غلط ہے کیونکہ اس کا مصنف نہ کوئی حواری ہے نہ کوئی پاک شخص ہے۔ نہ کوئی عیسائی ہے بلکہ ایک ملحد سرنتھس ہے جس نے اپنی تصنیف یوحنا کے نام سے غلط موسوم کردی۔ لارڈ نر اپنی کتاب کی جلد ۴ کے صفحہ ۳۲۳ پر لکھتے ہیں کہ مکاشفات یوحنا پرانے سُریانی ترجمہ میں شامل نہیں۔

یہوداہ کا خط مجموعہ کتب عہد جدید میں خطوط یوحنا اور مکاشفات یوحنا کے درمیان یہوداہ کا جو ایک خط درج کردیا گیا ہے اس سے بکثرت مسیحی علمائے متقدمین کو انکار رہا ہے۔ گروٹیس کا قول اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ اُس یہوداہ کا خط ہے جو اورین کے عہد میں یروشلم کا پندرھواں اسقف تھا۔ بائبل کے حصہ عہدجدید کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نوع کی کتابیں زمانہ دراز تک مجموعہ میں شامل نہیں کی گئیں یعنی جب تک کہ ان کتابوں کے معتبر یا نامعتبر ہونے کے متعلق تحقیقات بہ آسانی کی جاسکتی تھی اُس وقت تک تو یہ بائبل میں شامل نہ کی گئیں اور کئی سو برس بعد جب اس قسم کی تحقیقات کا زمانہ گذر گیا اور ان کی صحت یا عدم صحت کی کیفیت کا دریافت کرنا ناممکن ہوگیا اس وقت یہ کتابیں یک بیک بائبل میں شامل کرلی گئیں۔

کیا یہ کتابیں الہامی ہیں؟ ریس کی سائیکلوپیڈیا کی جلد ۱۹ میں عیسائی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور صاف طور پر لکھدیا گیا ہے کہ لوگوں نے کتب مقدسہ کے تماماً الہامی ہونے کی نسبت بہت کچھ گفتگو کی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اِن کتابوں کے مؤلفین کے افعال اور ان کی تحریروں میں غلطیاں بھی ہیں اور اختلافات بھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حواری بھی آپس میں ایک دوسرے کو صاحب وحی نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یروشلم کی کونسل میں آپس کی چھیڑ چھاڑ اور پولوس کے پطرس پر الزامات لگانے سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے کے عیسائیوں کا خیال ان لوگوں کے متعلق یہ تھا کہ یہ لوگ خطا سے خالی نہیں اور بعض صورتوں میں ان کے حرکات و سکنات پر روک ٹوک بھی ہوئی ہے۔ بحث مذکورہ میں ایک فقرہ یہ بھی درج ہے کہ: "ہم نہیں پاتے کہ حواری لوگ ایسے طور پر

گفتگو شروع کرتے ہوں جیسے پیغمبر شروع کرتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے بولتے تھے۔" اس کے بعد سائیکلوپیڈیا مذکور میں لکھا ہے کہ:۔ "میکانس نے اس ہوشیاری اور بیدار مغزی سے جو کہ اس عظیم مقصد کے لئے ضروری تھی طرفین کے دلائل کو تولکر اس مسئلہ کا یہ فیصلہ کیا ہے کہ نامجات کے لئے تو الہام البتہ مفید ہے لیکن تاریخی کتابوں کے لئے جیسے کہ اناجیل اور اعمال ہیں اگر الہام سے بالکل قطع نظر کر لی جائے تو کچھ نقصان نہیں بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ اگر تاریخی معاملات میں حواریوں کی گواہی صرف دیگر انسانوں کی گواہی کی طرح مانی جاوے جیسا کہ مسیح نے یوحنا باب ۱۵ آیہ ۲۷ میں کہا ہے"۔ جس آیہ کی جانب یہاں اشارہ کیا گیا ہے وہ اور اس سے اوپر کی آیت یہ ہے:۔

"۲۶۔ پر جب کہ وہ تسلی دینے والا جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے آوے تو وہ میرے لئے گواہی دیگا۔

۲۷۔ اور تم بھی گواہی دوگے اور کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو۔" (یوحنا۔ باب ۱۵)

مندرجہ بالا آیہ ۲۶ وہی معرکۃ الآرا آیت ہے جس پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑے زور و شور کی بحثیں رہی ہیں۔ مسلمان محققین کا فیصلہ ہے کہ اس آیت میں "تسلی دینے والا" غلط ترجمہ ہے یا تو ترجمہ میں غلطی کی گئی ہے یا دیدہ و دانستہ یہاں تحریف سے کام لیا گیا ہے۔ اصل لفظ فارقلیط ہے جس کا صحیح ترجمہ "ستودہ صفات" یعنے احمد و محمدؐ ہے اور یہ پیشینگوئی نبی آخرالزمان کی شان میں کی گئی ہے۔ مگر اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ الحاق و تحریف کی بحث میں آئے گی۔

بعد کی آیت یعنی مندرجہ بالا آیہ ۲۷ کے سلسلہ میں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا یہاں نامناسب نہ ہوگا کہ بعض معقول پسند اور سمجھدار عیسائیوں کے نزدیک بھی اناجیل مروجہ حواریوں یا حواریوں کے شاگردوں کی لکھی ہوئی صرف تاریخی کتابیں ہیں۔ اور اس سے زیادہ وقعت کی وہ مستحق نہیں۔ اور مسلمانوں کا اس بارہ میں کہنا یہ ہے کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے رسول مقبولؐ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور ہم تک بلاکسی تغیر وتبدل اور بلاکسی کمی و بیشی کے پہنچا لیکن موجودہ
انجیل اس قسم کا کلام نہیں ہے یہ انجیل نہ وہ کلام الٰہی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر حق تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہو
اور ہم تک بلاتغیر وتبدل اپنی اصلی صورت میں پہنچا ہو۔ نہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصنیف ہے، نہ آپ کی دیکھی
ہوئی اور تصدیق کی ہوئی کوئی کتاب ہے۔ بلکہ یہ محض حواریوں اور ان کے شاگردوں کے ملفوظات ہیں اور
وہ بھی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ صورتوں میں۔ ان حالات میں انجیل مروجہ کا قرآن پاک سے کوئی مقابلہ
نہیں کیونکہ احادیث کی صحت کا جو اہتمام مسلمانوں نے آج تک رکھا ہے اور احادیث کی صحت و عدم صحت
اور صحت کے مختلف مدارج کے تعین میں جو کوشش بلیغ انہوں نے کی ہے اور اصول روایت و درایت
کی تدوین میں جس کمال کا ان سے اظہار ہوا ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم نے آج تک پیش نہیں
کی۔ ہاں اس انجیل کا موازنہ بزرگوں کے ملفوظات سے ہو سکتا ہے مگر اس موازنہ کے بعد بھی مشکل ہے کہ عہد
جدید کی کتابوں کا پلہ بھاری نکلے۔ اس مسئلہ پر بھی تفصیلی بحث کا موقع اسی سلسلہ مضامین میں آگے چل کر
آئے گا۔ باقی۔

مسلم ریویو

تعلیمات قرآن پر ایک نظر

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، ہوم ڈیپارٹمنٹ شملہ)

"اسلام دین فطرت ہے" (۳۰:۳۰)

یہ قرآن کا دعویٰ اور ہمارا ایمان ہے تفصیل اس اجمال کی خواہ کسی قدر طول طویل کیوں نہ ہو، مفہوم اس کا یہی ہے کہ اسلام کی تعلیم اس قدر سادہ اور سیدھی دل میں اتر جانے والی ہے، اس کے اصول قوانین فطرت کی طرح ایسی محکم اور غیر متبدل بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں کہ اس کو قبول کرنے میں ذہن کو، اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے قلوب وجوارح کو، انسانی فطرت کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی، نہیں! بلکہ یہ عین فطرت ہے اور اقتضائے فطرت کی طرح تمام نوع انسانی اسے قبول کرنے کے لئے مجبور ومجبول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تعلیم کو عام طور پر آج اسلام کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ ایسے لاینحل مباحث اور پیچیدہ مسائل کا مجموعہ بن کے رہ گئی ہے کہ بلا کاہش وتردد قبول کرنا تو ایک طرف انسان کی کاوشیں ہزار سلجھانے کی کوشش کریں، اس کی الجھنیں پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دین فطرت کی حقیقی روح تو ہمیں قرن اول میں نظر آتی ہے جبکہ اس سیدھی سادی لیکن واضح تر اور مکمل تر تعلیم نے چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی قوم کو ایک طرف اگر قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کا مالک بنا دیا، تو دوسری طرف اخلاق حسنہ کے اس بلند ترین معیار پر پہنچا دیا کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ ہوتا کیا تھا؟ چند اصول تھے جن پر غائبانہ ایمان، غیر متزلزل ایمان، اور بلا شائبہ تشکیک ایمان ہوتا تھا۔ اس کے بعد عمل کی یہ کیفیت کہ قرآن میں حکم آیا، رسولؐ نے اس کی عملی شکل معین کر دی اور انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

لیکن یہ دور عمل، یہ سیدھا سادھا سپاہیانہ عہد جلد گزر گیا، خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور

اس کے ساتھ ہی عجمی تکلفات اسلامی عنصر میں سرایت کر گئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فراغت کے دن۔ ماہرین علوم وفنون کو باریکیاں تلاش کرنے کی مہلت مل گئی۔ ادھر عجمی معاندین خوب سمجھ چکے تھے کہ اسلام کی علمی اور تکبیر عملی قوت کے مقابلہ میں وہ کبھی نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے موقعہ غنیمت جانا بحث و تمحیص اور مناظرہ و مجادلہ کے میدان میں آن اترے۔ پہلے یہ حالت تھی کہ ادھر قال اللہ تعالیٰ" کی آواز کان میں آئی۔ اور ادھر وہ قال حال کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اب انہوں نے ان کو اس لفظی بحث میں الجھا دیا کہ جب اللہ کے ساتھ قال کا لفظ لگے تو اس قال کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ چنانچہ ماہیتِ خدا۔ کیفیت نبوت۔ حقیقت ملائکہ۔ اصلیت مبداء ومعاد کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ بحث کا مدار ہمیشہ منطق وفلسفہ پر ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا۔ اناجیل کے ابواب کی تشریحات ہوئیں۔ اسرائیلیات کے اضافے عبرانی سے منتقل کئے گئے۔ اگر یہ تمام علمی کاوشیں اپنی اپنی جگہ پر رہتیں تو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کی موجب ہوتیں لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ ایک طرف تو قرآنی حقایق کی کھینچ تان شروع ہو گئی کہ کسی طرح اسے یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کر دیا جائے۔[1] دوسری طرف قصص قرآنی، کہ جن کے صرف ضروری اور متعلقہ حصص خدائے حکیم وعلیم نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت قرآن میں بیان فرمائے تھے، اسرائیلیات کی مدد سے مربوط ہونے شروع ہو گئے نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو قوائے عملیہ زنگ آلود ہو گئے اور دوسری طرف اسلام کی سیدھی سادھی اور فطرتی تعلیم، اصول فلسفہ کی موشگافیوں اور قصص و حکایات کی توہم پرستیوں کی نذر ہو گئی۔

متکلمین کی نکتہ آفرینیوں سے کچھ سکون ہوا تو قرآن سے شاعری شروع ہو گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ قرآن نے اپنے آپ کو جو بے مثل و بے نظیر کہا تو اس کا فقید المثال ہونا صوری و معنوی ہر دو لحاظ سے تھا لیکن لفظی اعجاز ہر کیف ایک ثانوی چیز تھا جو اللہ تعالیٰ نے جہاں تورات و قرآن کی تحدی کی ہے۔ وہاں واضح کر دیا کہ اس سے اصل مقصود کیا ہے

[1] بعینہ اسی طرح آج سب سے بڑی اسلامی خدمت اس کو سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کو منکرین یورپ کا ہم نوا ثابت کر دیا جائے۔ حالانکہ خود ان کے نظریوں کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک کے جھٹلانے کے لئے دو اور موجود ہوتے ہیں۔ قرآنی یقین کے مقابلہ میں انسانی نظریات بہرحال ظنی ہیں۔ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (۵۳ - ۲۸) ان کو اس کے متعلق کچھ علم تو ہے نہیں محض گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ گمان حق کے بالمقابل کچھ کار آمد نہیں ہوتا۔ پرویز

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲۸:۴۹) آپ کہدیجئے کہ اگر تم سچے ہو (اور یہ کتابیں جھوٹی ہیں) تو تم خدا کے پاس سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے ہدایت میں بہتر ہو۔ پھر میں بھی اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

لیکن وہ ظاہری محاسن کے استیعاب میں اس اہتمام و التزام سے منہمک ہو گئے کہ اس کی باطنی حقانیت نظر انداز ہو گئی۔ لغت، صرف و نحو، علم الانشاء، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع وغیرہ مرتب و مدون ہوئے اور پھر ان کے معیار پر قرآن کو جانچ کر ادب و شاعری کی الہامی تصانیف پر اس کو فوقیت دینے کی کوششوں میں تمام ذہنی قوت صرف کر دی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جس عہد سعادت مہد میں قرآن نے وہ نتائج پیدا کئے تھے جن کو دیکھ کر آج تک دنیا کے مفکرین انگشت بدندان ہیں، اس عہد میں ان علوم کا کہیں نشان[1] نہ تھا۔ ان کی نگاہ پوست اور غلاف پر نہ تھی بلکہ عروس حقیقت ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو چکی تھی۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ حضرات متقدمین (علیہم الرحمۃ) کی ان علمی خدمات کی کسی طرح تنکیر و تحقیر کی جائے۔ ہم متاخرین پر ان کے جو علمی احسانات ہیں ان سے انکار کرنا حقیقت ناشناسی اور قدر ناشناسی ہے۔ لیکن ہر علمی دور کا ایک مخصوص رجحان ہوتا ہے۔ اس وقت اسی چیز کو اہم سمجھا گیا ہوگا اور تشریح مسائل اور تدوین علوم متعلقہ قرآن کے اسی شعبہ دراسی نہج کو انفع و انسب خیال کیا گیا ہوگا۔ لیکن جس چیز نے مشکل پیدا کر دی وہ یہ تھی کہ انکی یہ علمی تحقیقات تحقیق و تفتیش کے حدود سے آگے بڑھ کر عین دین قرار پا گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکے بعد مزید تدبر و تفکر فی القرآن کا گویا دروازہ بند ہو گیا[2]۔

---

[1] علم المعانی والبیان پر امام عبدالقاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) نے سب سے پہلی کتاب لکھی۔ لغت کی ابتدا خلیل بن احمد (المتوفی ۱۷۰ھ) نے کی۔ علم بدیع کا موجد ابن معتز (المتوفی ۲۹۶ھ) ہے۔ علم نحو کی ابتدا اگرچہ ابوالاسود دؤلی (المتوفی ۶۹ھ) سے ہوئی لیکن اس نے اس موضوع پر صرف چند مبادیات لکھے۔ سیبویہ (المتوفی ۱۸۳ھ) اور خلیل ابن احمد (المتوفی ۱۷۰ھ) نے اس فن کو مستقل کیا۔ "پرویز"۔

[2] قرآن کریم نے اہل کتاب کے متعلق کہا ہے کہ جب نبی کریم ان کے پاس آئے تو باوجودیکہ آپ ان کی تصدیق کرنے والے تھے، نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲:۱۰۱) ترجمہ: اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا جیسے کہ ان کو کچھ علم ہی نہیں۔
بعینہٖ یہی حالت آج ہماری ہے۔ قرآن ایک نور تھا جو ہمیں اس لئے دیا گیا تھا کہ اس سے سیدھا راستہ دیکھتے چلیں لیکن ہم نے اس نور کی شمع ہدایت کو پیٹھ کے پیچھے رکھ دیا جس سے ہمارا ماضی تو ضرور درخشندہ ہو گیا لیکن مستقبل کو ہم نے خود اپنے ہی سایہ سے تاریک کر لیا۔ اور روشنی ہوتے ہوئے بھی ہم اندھیرے کے اندھیرے میں رہے۔ پرویز۔

ان کی تحقیقات کے نتائج ایسے ہی غیر متبدل اور ناقابل ترمیم گردانے گئے جس طرح خود قرآن۔ تفاسیر لکھی گئیں تو انہی طریقوں پر اور مسائل مستنبط ہوئے تو اسی نہج پر۔ ان کے بعد جو بھی صاحب علم پیدا ہوا اس نے متقدمین کی علمی تحقیقات سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹانا گویا خود قرآن سے انحراف سمجھا۔ اس لئے انہی بنیادوں پر ردّے پر ردّا چڑھتا چلا گیا۔ اور دین کی ایک ایسی مستحکم عمارت قائم ہوگئی۔ جس کی بنیادیں ذہن انسانی کی معین کردہ تھیں پچھلے وقتوں تک تو خیر یہ چیز بیتی چلی گئی۔ کیونکہ ایمان بالغیب کے لئے دلوں میں ابھی تڑپ باقی تھی۔ لیکن جس شخص کو آج کسی "نا قد ذہن" سے واسطہ پڑتا ہے وہ اس مشکل کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے جو اسے ایسے شخص کے سامنے اسلام پیش کرنے میں پیش آتی ہے۔ آج دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ خود قرآن میں تو یہ بات موجود ہے کہ دنیا خواہ اپنی موجودہ سطح سے لاکھ گنا بھی کہیں اور بلندیوں پر چلی جائے تو قرآن اس سے بھی کروڑ گنا اور بلند ہوگا لیکن ذہن انسانی کی پرواز جو آج سے ہزار سال قبل ایک سطح معین کر چکی تھی، وہ تو بہر حال آج سے پیچھے ہی ہوگی۔ لہذا آج فطرت انسانی کو کس طرح سے مجبور کیا جائے کہ وہ اس سطح کو بھی انتہائی بلندیوں کا نشیمن سمجھ کر مطمئن ہو جائے نتیجہ اس جبر و اکراہ کا یہ ہوتا ہے کہ کہیں تو کوہ آتش فشاں کی طرح علانیہ مذہب سے تبرّا و بیزاری برتی جاتی ہے۔ اور کہیں آتش خاموش کی طرح ارتیابی کیفیت اپنی سوزش پنہاں سے حسن ایمان و ایقان کو خاک کا ڈھیر بناتی جاتی ہے۔ لہذا اگر قرآنی حقایق اور اسلام کی تعلیم فطرت پسے اکتسابی غلاف اتار کر اس کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کا وقت کبھی آیا ہے تو وہ آج ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔

ضرورت ہے کہ اسلام کو قرآن اور قرآن کی تفسیر ناطق یعنے اسوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں نمایاں کیا جائے۔ اور انسانوں کے مرتب کردہ قواعد و ضوابط کو اگر دیکھا بھی جائے تو مشورۃً نہ کہ انہی کو عین دین قرار دے لیا جائے۔

لیکن اس ضرورت کا احساس ہوا بھی تو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اور دیگر مسائل کی طرح افراط و تفریط کی رو میں تدبر فی القرآن کے لئے مصنوعی غلافوں کو اس زور سے اتار کر پھینکا گیا کہ ساتھ ہی اس معلم الکتاب والحکمۃ کی ردائے مبارک بھی الجھ کر اتر گئی جس کو خود خدا نے قرآن سمجھانے ہی کے لئے بھیجا تھا جیسا کتاب اللہ کا یہ غلط مفہوم سمجھا گیا کہ قرآن پر عمل پیرا ہونے کے لئے اسوہ رسول اللہ کی بھی ضرورت نہیں۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو خیر مسلمان اگر امام الائمہ نہیں بنتے تھے تو مومنین کی صف میں تو تھے۔ مگر اب رسول کی اطاعت سے انکار کر کے ان صفوں سے بھی بیک بینی و دو گوش نکالے گئے۔ اور اصلاح و تجدد کے اس تشدد نے انہیں دین و دنیا میں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ قرآن کو حشو و زوائد سے پاک کرتے کرتے اس کی اصل پر ہی تبر آزمائی شروع ہو گئی۔

افراط و تفریط کے اس مد و جزر سے مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ان کی تازہ تالیف "تعلیمات قرآن" کی شکل میں برآمد ہوا۔ بدقسمتی سے مولانا ممدوح کے متعلق اس سے پہلے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں اور انہیں بھی عام طور پر منکرین حدیث کے زمرہ میں شمار کیا جا رہا تھا۔ اس لئے جب کتاب میرے سامنے آئی تو سب سے پہلے میں نے باب رسالت اور اس میں سے بھی بالتخصیص اطاعت رسول کے عنوان کو دیکھا۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں منصب رسالت کے عدم فہم سے ایک اصلی فرق پڑتا ہے۔ سب سے پہلے جو فقرہ مجھے کھٹکا وہ یہ تھا۔

رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی پہنچانا ہے اور بس (۱۲۸)

میں نے سمجھا کہ یہ وہی استدلال ہے جو تبیین احکام کے خلاف "اہل قرآن" لایا کرتے ہیں لیکن انہوں نے حاشیہ کی تشریح میں اسے خود ہی صاف کر دیا ہے۔ کہ

"رسولوں کا کام صرف دین کا پہنچانا ہے۔ دین کا بنانا نہیں" (۱۱)

یہی شبہ پھر صفحہ ۱۵۵ پر اطاعت رسول کے عنوان کے تحت جا کر پڑتا ہے جہاں پھر یہ مذکور ہے کہ

بحیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس

لیکن اس شبہ کا ازالہ بھی دو چار سطریں آگے بڑھ کر ہو جاتا ہے جہاں لکھا ہے کہ۔

"ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے"

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ (۶: ۲) میرے اوپر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ اس سے تم کو بھی آگاہ کر دوں۔ اور ان لوگوں کو بھی جن کو وہ پہنچے۔

اس تبلیغ کی تشریح ان الفاظ میں آتی ہے۔

تلاوت و تبیین آیات تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ نفوس سب اسی تبلیغ کے اجزا ہیں۔ (ص ۱۵۶)

نیز: "تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عمل پیرا ہو جائے"۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۱۳۳) تمہارے لئے رسول کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ اس کو وہ عمل متواتر کہتے ہیں۔ جس کی مخالفت بقول ان کے خود قرآن کی مخالفت ہے۔ اس کے بعد اطاعت رسول میں دوسری گھاٹی آتی ہے۔ جہاں منکرین حدیث رسول کی اطاعت بحیثیت امیر ہی فرض سمجھتے ہیں اور بس۔ اس کے متعلق مولنا تحریر فرماتے ہیں:۔

"بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لئے ہے لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی" ص ۱۵۷۔

اور:۔

"بحیثیت رسالت آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضہ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کیا گیا تھا" (۱۱)

ان تصریحات اور مولنا صاحب کے اس بیان کی روشنی میں جو انہوں نے اپنے مسلک کے متعلق "معارف" بابتہ ماہ مئی میں شائع کیا ہے کم از کم میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اگر متشدد فی الحدیث نہیں تو

منکر حدیث بھی نہیں ہیں۔ اور ان کا یہ فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ۔

"جس بات کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ رسولؐ نے فرمائی ہے۔ اس کے متعلق کوئی بحث باقی نہیں رہتی" اس کے بعد ان سے اگر کچھ اختلاف ہو سکتا ہے تو فن روایت و درایت کی شرائط کے متعلق ہی ہو سکتا ہے نہ کہ قال الرسول کی حجیت اور عدم حجیت پر۔

منصب رسالت کے متعلق ان کا مسلک دیکھ لینے کے بعد اب ہم اصل کتاب کے باقی حصص کو دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کی غرض و غایت کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ایک عرصہ سے میرا خیال تھا کہ قرآن کی تعلیمات کو اس طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کروں کہ آسانی سے سمجھ لیں۔ (دیباچہ ص۱)

اس خیال کے مبارک ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:-

"جس طرح بھی ہو سکا اس سال میں نے تعلیمات قرآن کا یہ ایک حصہ مرتب کیا ہے۔ اس میں قرآنی آیات جن کر ترتیب کے ساتھ فراہم کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان جو اب تک قرآن کو تفسیروں اور ترجموں سے سمجھنے کے عادی ہیں، اس کتاب سے خود قرآنی آیات سے اس کو زیادہ فصاحت (و آسانی) کے ساتھ سمجھ سکیں گے" (ص۱)

متقدمین رح کی تفاسیر کے اس زمانہ کے لئے ناکافی ہونے پر اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے۔ باقی رہا ترجمہ۔ سو اگر کسی لفظ قرآنی کا مفہوم خود قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح طور پر معلوم ہو سکے تو لغت کی بجائے یہ زیادہ نافع ہوتا ہے۔ کیونکہ لغت کی مدوین پر اس زمانہ کے ماحول اور لٹریچر کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے جس میں لغت مدون کی گئی ہو۔

کتاب میں اجزاء ایمان (خدا۔ ملائکہ۔ رسالت۔ کتاب اور معاد) کے علاوہ نفس دین اور

(یعنی تخلیق انسانی اور انسانی معاشرت کے مہمات اصول کے متعلق قرآنی آیات مختلف عنوانات کے تحت جمع کی گئی ہیں۔ "ہر ایک عنوان پر اختصار کی غرض سے کم آیتیں لکھی گئی ہیں۔ اور استیعاب کی کوشش نہیں کی گئی" (ص ۱)۔ اگرچہ استیعاب نہ ہونے کی صورت میں بالعموم یہ اعتراض پیدا ہوجاتا ہے کہ مولف نے اپنا نقطۂ نگاہ ثابت کرنے کے لئے انہی آیات کو چنا ہے جو اس کے خیال کی موید ہیں لیکن کتاب پر ایک عمومی نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مؤلف نے اختصار اس غرض کو مدنظر رکھکر نہیں کیا بلکہ محض اختصار کی غرض سے ہی کیا ہے یہ بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ پچھلے دنوں ان کے بعض خیالات کی تردید میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں جو آیات قرآنی ان کے خیالات کی تردید میں پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر خود انہوں نے اس کتاب میں جمع کر رکھی ہیں۔ البتہ انکا مفہوم معترضین سے جداگانہ لیا ہے۔ اگر اختصار کا مقصد یہی ہوتا کہ تردید سے بچ سکیں تو ان آیات کو وہ آسانی سے چھوڑ سکتے تھے، لہٰذا اس باب میں ان کی نیت کے متعلق شبہ کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود نہیں ہیں۔

کتاب کی بنیاد کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ

"میں نے اس کتاب کے متن کی بنیاد قرآن کی نصوص صریحہ پر رکھی ہے تاکہ انکار یا بحث کی گنجائش نہ نکل سکے" (ص ۲)

اسوۂ رسول اللہؐ کے متعلق ان کا مسلک (جو اوپر مذکور ہے) پیش نظر رکھنے کے بعد یہ خیال بھی نہایت مستحسن ہے۔ متن کے بعد جو کچھ انہوں نے اپنی طرف سے تشریح کی ہے۔ وہ حواشی میں درج ہے اور ان کے متعلق بھی انہوں نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ

"میں اپنی باتوں کو اتنی وقعت بھی نہیں دیتا کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں میرا مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھیں" (ص ۱)

جہاں تک اجزاء ایمان کا تعلق ہے، کتاب میں کوئی بحث محل نظر معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ ان اصول سے

جو مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ ان میں دو چار مقام ایسے ہیں جہاں مروجہ عقاید سے اختلاف کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ نفس معجزہ کا وقوع از روئے قرآن ثابت سمجھتے ہیں لیکن نبی کریمؐ کے لئے حسی معجزات کا ثبوت قرآن سے نہیں پاتے۔ اسی طرح وہ قیامت کی جزئیات تک کے قائل ہیں جن کی تفصیل قرآن میں مذکور ہے لیکن موت و قیامت میں فصل زمانی نہیں مانتے لہٰذا عذابِ برزخ ان کے نزدیک قرآن سے ثابت نہیں۔ اسی طرح وہ تقدیر کو اجزاء ایمان میں سے نہیں مانتے بلکہ قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں۔

دین میں تفرقہ اندازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

"علماء میں اختلافات پڑتے ہیں۔ اور ہر ایک کی پیرو ایک ایک جماعت ہو جاتی ہے جو اس کو اپنا امام مان کر اس کے اقوال کو اسی طرح بلا سند تسلیم کرنے لگتی ہے جس طرح اللہ کے قول کو اس لئے ہر فرقہ کا مرکز الگ الگ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اختلافات کا مٹنا محال ہو جاتا ہے۔ اب تا وقتیکہ وہ اشخاص پرستی کو چھوڑ کر کتاب اللہ کی طرف نہ رجوع کریں اور سب کے سب اس ایک مرکز پر نہ آجائیں اس وقت تک متحد نہیں ہو سکتے"۔ (۴۷)

اس میں شبہ نہیں کہ دین میں تفرقہ اندازی جرم عظیم ہے۔ اور کسی امام کے قول کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کرنا بھی کبھی جائز نہیں رکھا جا سکتا لیکن سوسائٹی کے استقرار و اصلاح کے لئے کسی ایک شرح قانون کی تو لامحالہ ضرورت ہے۔ اس لئے اگر قانون کے لئے کسی امام فن کے مدون کردہ ضابطہ کی طرف رجوع کر لیا جائے تو امید ہے کہ مولانا ممدوح اسے اُس تفرقہ اندازی سے منسوب نہ کرتے ہوں گے جس کی بنا پر شرک لازم آجاتا ہے۔

؎ ان تمام اختلافات پر جامعہ اور معارف میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا از سرِ نو اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ پرویز۔

سب سے بڑی ضرورت جس کا احساس ایک عرصہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ تبویب القرآن ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے مضامین جس انداز و طریق سے قرآن میں رکھے ہیں اس سے بہتر ترتیب پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس کے فہم کے لئے تدبر فی القرآن کی بڑی ضرورت ہے اس کے لئے قرآن پر اتنا عبور ہونا چاہئے کہ بیک وقت تمام قرآن کے مختلف مقامات جنمیں یہ مضامین بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح زینت نگار ہیں نظر کے سامنے آجائیں لیکن یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب قرآن سے لوگوں کو شغف تھا۔ اس کی تلاوت زندگی کے لوازم میں سے تھی۔ لیکن آج تو صورت ہی جداگانہ ہے۔ آج یہی نہیں کہ مریض کو مرض کا احساس نہیں ہے بلکہ وہ دوا کے نام سے کوسوں بھاگتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ دوا کو خوش منظر و خوش ذائقہ بنایا جائے کنین کی گولی پر شکر کا خلاف چڑھایا جائے۔ جب وہ قرآن کے پاس ہی نہ آتے ہیں تو ان سے یہ توقع رکھنی کہ اس پر عبور حاصل کر کے اس کے حقائق و معارف سے لذت اندوز ہوں عبث ہے اس لئے بنا بر ضرورت، ان کے لئے قرآن کو اس شکل میں پیش کر دینا چاہئے کہ اس میں ایسا ربط پیدا ہو جائے جیسا انسانی کلام میں ہوتا ہے (میں خود ایک مدت سے اس خیال میں ہوں کہ قرآن کریم کا ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا تیار ہو جائے کہ تمام قرآنی تعلیم مختلف عنوانات کے ماتحت ایک وقت سامنے آجایا کرے۔ خدا کرے میرے اس خواب کی تعبیر کہیں سچی نکل آئے۔ وما توفیقی الا باللہ) تبویب القرآن پر دو ایک کتابیں نظر سے بھی گذریں لیکن "تعلیمات قرآن" میں جس ترتیب کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نہایت عمدہ ہے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ جس حلقہ میں قرآن پہنچانے کے لئے بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، انہوں نے اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔

بہر حال کتاب ابھی نقش اول ہے اور اس میں بڑی وسعتوں کی گنجایش ہے۔ آیندہ اس میں انہی عنوانات پر اور ابواب کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور فہرست مضامین تو اس سے کہیں مفصل ہو سکتی ہے۔ با ایں ہمہ کتاب بطور (Reference Book) بھی نہایت کارآمد ہے اور اس نے ایسی دقتوں کو

رفع کردیا ہے جو مدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے

میرا مقصد اس تعارف سے صرف یہ ہے کہ مولانائے موصوف نے جس عمارت کا خاکہ کھینچا ہے چونکہ وہ نہایت اہم اور وقت کی اشد ضروریات کو پورا کرنے والی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کے سیلاب میں یہ نقوش بہ جائیں۔ کتاب بہرکیف انسانی دل ودماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جس میں سہو وخطا اور رجحان قلبی کا یقیناً امکان ہے۔ اس لئے اختلافی مسائل میں بجائے ذاتیات میں الجھنے کے۔ متانت اور سلامت روی سے تدبر کیا چاہئے۔ اور خوامخواہ مؤلف پر بدنیتی کا الزام نہیں دھر دینا چاہئے کیونکہ انکا اپنا بیان ہے کہ

"قرآن کے اندر نہ میں خود اپنا خیال لے کر گھسا ہوں نہ کسی کے خیال کی پرواہ کی ہے۔ بلکہ دیانت داری
دعویٰ کیا تھ قرآن کو خود قرآن ہی سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے (صٹ)

پھر اس میں اگر کوئی غلطی معلوم ہو تو اسے بھی نیک نیتی کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس بارہ میں بھی مولف کا خود اعلان ہے کہ

"جہاں جہاں مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں اگر طالبین قرآن ان سے مجھکو مطلع فرمائیں گے تو میں ممنون ہونگا۔ اور انشاءاللہ اپنے خیال اور کتاب دونوں کی اصلاح کرونگا (ص۱۱)

لہذا قطع نظر ان تمام فرعی اختلافات کے جو مولانائے موصوف سے کسی کو ہوں، انکا مستحسن اقدام مبارکباد کا مستحق ہے کیونکہ انہوں نے ایک ایسے اہم کام کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جو انفرادی کوششوں کا نہیں بلکہ ایک جماعت کے کرنیکا تھا۔ اور اگر فرعی اختلافات مٹ جانے کے بعد اپنی بنیادوں پر یہ عمارت مکمل ہوگئی تو شاید اس کے صدقے میں وہ غفور رحیم ہم سے اس غضب کو اٹھالے جس میں آج ہم مبتلا ہیں۔ اور شاید کبھی ہم پھر بھی یہ کہنے کے قابل ہوسکیں کہ

زمیں از گردش تقدیر ما گردوں شود روزے   فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

(اقبال)

حدیث کے متعلق چند سوالات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"منکرین حدیث کے جواب میں آپکا فاضلانہ مضمون مندرجۂ ترجمان القرآن پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اسی سلسلہ میں اگر جناب ذیل کے امور پر مزید روشنی ڈالیں تو ذی علم احباب کے لئے عموماً اور ناظرین رسالہ کے لئے خصوصاً بہت ہی مفید ہوگا۔

(۱) حفاظت قرآن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ لا تکتبوا عنی سوی القرآن ایک ضروری احتیاط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ صحابہ کرام قرأت و حفظ قرآن کما نزل کے لئے مامور تھے اور اسی پر عامل رہے باوجود اس کے اختلاف قرآت پیدا ہوا جس کا دفعیہ بعہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ احادیث بمقابلہ قرآن ویسی محفوظ و مثبوت نہیں ہوسکتیں خصوصاً جبکہ فتن جمل و صفین کے بعد مدت تک ان کی جمع اور تنقید کی مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی، جبکہ طرق، رواۃ اور موضوعات کی چھان بین بہت مشکل تھی۔

(۲) احادیث فعلی اور قولی میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ مثلاً احادیث فعلی میں سے کیفیت و ہیئت نماز کے متعلق عقل چاہتی ہے کہ مطلقاً کسی قسم کا اختلاف نہ ہو خصوصاً جب کہ ارشاد نبوی تھا کہ صلوا کما رأیتمونی

اَصَلِّی کم از کم حرمین شریفین میں دن رات میں پانچ مرتبہ ایک گروہ کثیر ہر زمانہ میں متواتر اس عمل کو مشاہدہ کرتا رہا۔ مگر ابتدائے زمانہ ہی میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف جو بصورت رفع یدین، ارسال یدین۔ وضع یدین۔ تامین بالجہر وغیرہ ظاہر ہوا اس تواتر فعلی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور تواتر قولی کی حیثیت اور بھی گر جاتی ہے خبر آحاد کا کیا کہنا۔

(۳) اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیوٰۃ طیبہ ہمارے لئے عملی طور پر سبق آموز ہے۔ قرون اولیٰ میں جبتک کہ جمع احادیث کا تسلی بخش اہتمام نہ ہو سکا، تو یقیناً عظیم کے باہر مسلمان قرآن مجید ہی سے اسوۂ نبوی کا اقتباس کرتے تھے اخلاق رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا اور آپ نے جواباً فرمایا کان خلقہ القرآن غرض قرآن پاک سے اسلامی اخلاق اور زندگی کے معلوم کرنے کے لئے ذخیرہ وافر ہے۔ فی زمانہ بھی بہت تھوڑے ہیں جن کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سوانح بالتفصیل والصواب معلوم ہوں مگر متبعین شریعت عموماً اصول وارکان اسلام سے واقف ہیں اور یہی مقصود تھا لہٰذا مذکورہ بالا بعض منکرین حجیت حدیث کے شبہات ہیں جن کا ازالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ورنہ خاکسار مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کو صحیح معنوں میں لے کر حجیت حدیث صحیح کا قائل ہے۔

ترجمان القرآن : آپ نے جن اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کے علاوہ بیسیوں اور اعتراضات بھی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں مگر ان جزئی باتوں پر جدا جدا بحث کرنا طول کلام کا موجب ہے اور غیر ضروری بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے

نقطۂ نظر یہ ہے۔ جب کسی مسئلہ پر وہ مخالف نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو تمام مخالفت ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب موافق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو تمام دلائل موافقت ہی میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب خالی الذہن ہوکر تلاش حق کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے، اور دونوں میں موازنہ کرکے وہ ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے متاثر یا غیر محتاط علماء کی روایات سے برداشتہ خاطر ہوکر احادیث سے بدظن ہوچکے ہیں وہ جب ایک مخالف نقطے سے احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو حدیثوں کے ناقابل اعتماد اور ناقابل احتجاج ہونے کے لئے دلائل پر دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ قدامت پسندی کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ہر حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، بے چون وچرا مان لیتے ہیں، خواہ وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، اور جب نقطۂ نظر غلط ہیں تو جو کچھ ان نقطوں سے دیکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تمام احادیث کو مطلقاً غلط سمجھنے والے بھی غلطی پر ہیں، اور تمام احادیث کو مطلقاً صحیح کہنے والے بھی۔ وہ لوگ بھی راہ راست سے ہٹ گئے ہیں جو احادیث اور قرآن مجید میں فرق نہیں کرتے اور وہ لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں جو احادیث کو قطعاً ناقابل احتجاج قرار دیتے ہیں۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اور وہ درمیانی راستہ نظر نہیں آسکتا جب تک کہ دیکھنے والا ان متضاد نقطوں سے ہٹ کر وسط کے نقطہ پر نہ آجائے۔ پس اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جزئیات میں الجھنے کے بجائے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر پر براہ راست حملہ کیا جائے اور ان کو وہاں سے ہٹا کر صحیح نقطۂ نظر پر کھینچ لایا جائے۔

تاہم جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیان کردہ امور پر روشنی ڈالی جائے، تو مختصراً میں ان پر اظہار رائے کئے دیتا ہوں۔

(۱) یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے، مگر یہ خیال

صحیح نہیں ہے کہ وہ مطلقاً محفوظ ہی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور عمل ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کے طریقوں اور راویوں کے احوال کی چھان بین میں بہت دقتیں پیش آئی ہیں، اور ان میں محدثین کے درمیان اختلافات بھی ہوئے ہیں۔ مگر فن حدیث کی تاریخ شاہد ہے کہ محدثین نے تحقیق و تفتیش کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، اور اس کام میں اتنی محنتیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ انسان کے بس میں نہیں۔ انہوں نے اپنی ان محنتوں سے جو ذخیرہ فراہم کیا ہے، وہ آج ہمارے پاس موجود ہے، اور ان کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، وہ بھی تمام دلائل و شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر کوئی اس ذخیرہ پر تحقیقی نظر ڈالے تو اس کے لئے آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا کیا اور نہیں کیا۔ اور یہ کہ ہر روایت جو آپ کی طرف منسوب ہے وہ اپنی صحت اور اپنے قابل احتجاج ہونے کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔ اس لئے صحت کا اصلی معیار قرآن ہی ہونا چاہئے۔ جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے مخالف ہوگی اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے، اور اس کا مخالف قرآن ہونا ہی اس امر کا بین ثبوت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے موافق ہوگی، اور تعلیمات قرآن کی ایسی تشریح و توضیح یا احکام کی ایسی تفصیل ہوگی جو قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف نہ ہو، اور روایت و درایت کے طریقوں سے اس کے معتبر ہونے کا ظن غالب بھی حاصل ہو جائے گا اس کو ہم ضرور تسلیم کریں گے، اور اپنی عقلی تفسیر و تشریح اور اپنی رائے پر اس کو ترجیح دیں گے۔

(۲) اس میں شک نہیں کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں، اور ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہئے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ

سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق بھی نہیں ہوسکتے کہ ان کے درمیان یک سرمو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزا میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا، مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائیگا، اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر میں آج ایک تقریر کرتا ہوں۔ ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں، اور جاکر لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر شخص اس کو لفظ بلفظ نقل کر دے۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کریگا، کوئی کسی دوسرے ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کریگا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کرے گا۔ اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہدے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی، یا جو تقریر کی تھی وہ ازسرتاپا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر اس تقریر کے متعلق تمام اخبارِ آحاد کو جمع کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی، بہت سے آدمی موجود تھے، اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق لفظاً یا معنیً پایا جائیگا۔ وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے اور ان سب کو ملاکر تقریر کا ایک مستند مجموعہ مرتب کرلیا جائے گا، اور جن حصوں کے بیان کرنے میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبۃً کم معتبر ہونگے۔ مگر ان کو غلط اور موضوع کہنا جائز نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور ایسی بات ان میں نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہوجائے۔

یہی حال احادیث فعلی کا بھی ہے۔ آپ نے نماز کی مثال پیش فرمائی ہے میں بھی اسی مثال کو سامنے رکھ کر جواب عرض کرتا ہوں۔ نماز کے متعلق تواتر قولی و عملی سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی نماز فرض ادا فرماتے تھے، نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی

مقتدی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہوتے اور آپ کی حرکات و سکنات کی پیروی کرتے تھے۔ آپ قبلہ کی جانب رخ فرمایا کرتے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں داخل ہوتے، قیام، رکوع، سجود، اور قعود سے نماز مرکب ہوتی تھی۔ ہر رکن نماز کی فلاں فلاں ہیئتیں تھیں۔ غرض نماز کے جتنے اہم اجزاء ترکیبی ہیں ان سب میں تمام زبانی روایات متفق ہیں اور عہد رسالت سے آج تک ان کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔ اب رہے جزئیات مثلاً رفع یدین و ارسال یدین، و وضع یدین وغیرہ تو ان کا اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف دیکھا ہوگا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، اور ان میں سے کسی کے کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے، اس لئے آپ جس وقت جیسا چاہتے عمل فرماتے تھے لیکن حضور کے سوا کوئی اور شخص صاحب شریعت نہیں ہے، اور اس کا کام اتباع ہے نہ کہ تشریع، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ آپ کا زیادہ سے زیادہ صحیح اتباع کرنے کی کوشش کریں، اور احادیث کا تتبع کرکے معلوم کریں کہ ہر جزئیہ کے متعلق زیادہ صحیح اور مستند روایات کونسی ہیں۔ اس باب میں اختلاف رائے ممکن ہے، اور ہوا بھی ہے۔ کسی نے کسی روایت کو زیادہ مستند سمجھا اور کسی کو اس کے خلاف روایت پر اطمینان حاصل ہوا۔ مگر یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ ادائے نماز کے متعلق سرے سے کوئی قولی و فعلی تواتر ہی نہیں پایا جاتا۔

(۳) قرآن پاک اور حدیث نبوی کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے تیسرا سوال پیدا ہوا ہے قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور ایمان پر دیا گیا ہے، اور ایمان ہی کی تفصیلات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس کے لئے تو ہمیں قرآن سے باہر جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، اور حدیث میں اس سے زیادہ کوئی چیز ملتی بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اخلاقی تعلیمات ہیں، قرآن میں اصول اخلاق قریب قریب سب کے

بیان کر دئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اخلاق کا تعلق لفظی بیان سے اتنا نہیں ہے جتنا عملی نمونہ سے ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اخلاق کا مجسم نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے مواعظ، اور اپنی تعلیم حکمت اور عملی تربیت (تزکیہ نفوس) سے ان تمام اصول اخلاق کی قولی و عملی تشریح فرما دی جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں پس جو شخص اس اسوۂ نبوی کو چھوڑ کر کہتا ہے کہ اس باب میں ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے،، بلکہ درحقیقت وہ حق تعالیٰ کے اس فعل کو عبث سمجھتا ہے کہ اس نے تنزیل کتاب کے ساتھ رسول بھی مبعوث فرمایا، اور یہ کہکر مبعوث فرمایا کہ ہمارا رسول نہ صرف تم کو ہماری آیات سنائیگا۔ بلکہ تمہارا تزکیہ نفس بھی کریگا۔ اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیگا۔ اور اس کی زندگی میں تمہارے لئے اسوہ حسنہ بھی ہوگا۔

اب رہ گئے احکام تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلّی قوانین بیان کئے گئے ہیں، اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا۔ اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں، ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کرکے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کرسکتے ہیں، مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہوجائے تو ہم اس قابل ہوجائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں دنیا کے علمی و عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہئے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ پورا اور پکا مسلمان بننے کے لئے قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا علم کس قدر ضروری ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک عام مسلمان حدیث کے علم کے بغیر ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے تو میں کہونگا کہ یہ علم حدیث کی ضرورت نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اگر یہ دلیل ہے تو یہی دلیل قرآن کے علم کی ضرورت نہ ہونے پر بھی قائم کی جا سکتی ہے کیونکہ ایک عامی مسلمان قرآن کے علم سے بھی بہت کم بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر بھی اپنی زندگی میں احکام شریعت کا اتباع کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ معیاری مسلمان تو دراصل اس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں، اور جن کی رگ وپے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو۔ باقی رہے عوام تو وہ اس وقت بھی ان معیاری مسلمانوں کے پیرو تھے، اور آج بھی ہیں۔ عہد نبوی میں جن صحابہ نے جتنا زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت اور تعلیم کا فیض اٹھایا وہ اتنے ہی زیادہ معیاری مسلمان سمجھے گئے، اور ان کے مقابلہ میں کبھی ان لوگوں کو باعتبار علم یا باعتبار عمل ترجیح نہیں دی گئی جنہوں نے آنحضرت سے تعلیم اور صحبت کا فیض نہ اٹھایا تھا۔ بلاشبہ مسلمان دونوں تھے۔ مگر دونوں کے مراتب کا فرق کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تقریظ و انتقاد

تعلیماتِ قرآن

تالیف مولٰنا اسلم جیراجپوری ضخامت ۲۲۴ صفحہ۔ قیمت عا۔ پتہ: قرول باغ۔ دہلی۔

قرآن کریم کی آیات کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنے کی متعدد کوششیں ابتک کی جاچکی ہیں اور اس سلسلہ میں بعض اچھی کتابیں شایع بھی ہوی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں آیات قرآنی کو صرف مضامین کے اعتبار سے مرتب کردینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُس ترتیب سے نتائج اخذ کرنے اور مختلف مسائل کے متعلق قرآن کی تعلیمات کو ایک مسلسل اور مرتب بیان کی صورت میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والا ایک نظر میں قرآن کے مقصود و مدعا کو معلوم کرسکے۔ اس طرح یہ کتاب محض تبویب القرآن ہی نہیں ہے بلکہ تفسیر القرآن بالقرآن بھی ہے۔ اس میں شک نہیں جیسا کہ جناب مؤلف نے خود اعتراف فرمایا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب انسان کو قرآن سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔ کیونکہ قرآن تو ایک بحر بے کنار ہے جس کے مضامین کو عنوانات کی قید میں لانا بہت مشکل ہے لیکن آج کل جبکہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات قرآن مجید کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے، ایسی کتابوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جن میں قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ خود قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کردیا گیا ہو تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک تفہیمی مقدمہ کا کام دے سکیں۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے قرآنی تعلیم کے چھ اہم ترین مسئلوں کو بیان کیا ہے۔ خالق، مخلوق، دین، رسالت، کتاب اور معاد۔ ان میں سے ہر عنوان کے تحت انہوں نے متعدد ذیلی عنوانات قائم کرکے

ایک سلسلہ کے ساتھ آیات قرآنی درج کی ہیں اور بیچ بیچ میں مختصر تفسیری و تشریحی جملے بھی لکھدئے ہیں جن سے خیالات کا ربط اور تسلسل قائم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے الفاظ اور بیانات کو کم سے کم جگہ دی ہے۔ اور بڑے بڑے مباحث کو سمیٹ کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کر دیا ہے۔

قرآن کریم کی خدمت سے زیادہ مبارک خدمت دنیا میں کوئی نہیں ہے، اور جو شخص اس خدمت کو انجام دے، وہ اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کریں، اور اس کے کام کی قدر کریں لیکن یہ خدمت جتنی مبارک ہے اتنی ہی نازک بھی ہے۔ قرآن کی نسبت سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے خیالات اور عقاید پر بہ نسبت دوسری چیزوں کے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے جو چیز بھی قرآن کی نسبت سے پیش ہو اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ پیش کرنے والے کا بھی فرض ہے کہ وہ ہر بات اور ہر سئلے کی صحت کا زیادہ سے زیادہ اطمینان کرے اور دوسروں کا بھی فرض ہے کہ اگر کوئی فروگذاشت ان کو نظر آئے تو نکتہ چینی و خردہ گیری کی نیت سے نہیں بلکہ خدمت قرآن کی نیت سے اس کو واضح کر دیں تاکہ آیندہ اس کی تصحیح ہو سکے۔ مولف کی علمی شان سے ہمکو توقع ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط برتی ہوگی اور وہی پیش کیا ہوگا جو ان کے نزدیک صحیح تھا لیکن ہمارے نزدیک کتاب میں اب بھی متعدد فروگذاشتیں رہ گئی ہیں اس لئے ہم بھی ان کو پیش کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ اگر جناب مولف ہمارے کسی بیان سے مطمئن نہ ہو سکیں تو انہیں حق ہے کہ ہم سے مزید تبیین کا مطالبہ کریں۔

جن و انس | صفحہ ۳۰ پر جن و انس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ دونوں لفظ جہاں جہاں ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں"۔ یہ تشریح غالباً اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کی گئی ہے جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں جنوں کے شریک ہونے پر عموماً کیا جاتا ہے لیکن جس آیت پر یہ نوٹ لکھا گیا ہے اس میں "جن اور انس کے ساتھ "طیر" کو بھی حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل کیا گیا ہے۔ کیا یہ طیر بھی انسانوں ہی کا کوئی طبقہ تھا؟ پھر دوسری جگہ بیان کیا گیا

ہے کہ ہوا حضرت سلیمانؑ کے تابع کی گئی تھی؟ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ۔ کیا ہوا سے مراد بھی انسانوں کا کوئی طبقہ لیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو محض لفظ جن کی تاویل کرنے سے کیا حاصل؟ تاویل تو ایسی ہونی چاہئے جو قرآن کے دوسرے بیانات سے مطابقت رکھتی ہو۔ قرآن مجید میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ۔ دوسری جگہ شیطان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ جن تھا۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ تیسری جگہ جنوں کے متعلق فرمایا گیا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ۔ اور چوتھی جگہ شیطان کی حقیقت خود اس کی زبان سے یہ بیان کرائی گئی ہے کہ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ۔ ان سب بیانات سے متحقق ہو جاتا ہے کہ جو جن حضرت سلیمان کے تابع کئے گئے تھے وہ آتشیں مخلوق ہی تھے۔ مگر وہ کیسے جن تھے؟ اور ان کی ماہیت کیا تھی؟ یہ ہم کو نہیں بتایا گیا اور جب اس راز کو کھولا نہیں گیا تو محض قیاس آرائی سے ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جناب مؤلف کا یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ، اور وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذَيْنِ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ اور وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ میں اگر جنوں سے انسانوں ہی کا کوئی طبقہ مراد ہے تو اس کو انسان ہی کیوں نہ کہا گیا، "جن" کے جداگانہ لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا۔ اور اگر وہ انسانوں ہی کا کوئی الگ طبقہ ہے تو آخر وہ کونسا طبقہ ہے؟ غالباً مؤلف نے ان لوگوں کی رعایت مدنظر رکھی ہے جن کو "جن" نامی ایک آتشین مخلوق کے وجود سے انکار ہے۔ مگر شاید انہوں نے غور نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کے دلائل علمی حیثیت سے بہت کمزور ہیں۔ اتنے کمزور کہ ان سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ ایسی باتوں سے مرعوب ہونے کا زمانہ مدت ہوئی کہ گذر گیا۔

قب معنی خلا | مؤلف نے ہر جگہ خلافت کے معنی بادشاہی کے لئے ہیں اور صفحہ ۴۶ پر اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں" کرکے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ :-

خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں۔ اور خلافت فی الارض کے معنی ایک کی جگہ دوسرے کو زمین کا بادشاہ بنانا ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ پھر ان کے بعد زمین میں ہم نے تم کو جانشین بنایا کہ دیکھیں تم کس طرح کام کرتے ہو۔

حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے۔ نیابت حق یا خلافت الٰہی کا خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ جس کی شان یہ ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ اس کا جانشین کوئی کیونکر ہو سکتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کی وہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کی تفسیر خلافت الٰہی سے کرنا غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ آیت میں صرف لفظ "خلیفہ" آیا ہے جس کے معنی جانشین، نائب اور قائم مقام کے ہیں اس کے ساتھ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے صریح مفہوم یہ نکلتا ہو کہ میں ان لوگوں کی جگہ ایک دوسری مخلوق کو بادشاہ بنانے والا ہوں جو اب تک زمین میں بستے تھے۔ بلکہ آیت کے الفاظ سے صرف یہ مفہوم نکلتا ہے کہ "میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں" اس کی تاویل اگرچہ وہ بھی کی جا سکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے۔ مگر اس کی یہ بھی تاویل کی جا سکتی ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت سے سرفراز کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس تاویل میں جو قباحت مؤلف نے ظاہر کی ہے وہ محض لفظ "جانشین" سے پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ اگر وہ اگر خلیفہ کا ترجمہ "نائب" کرتے تو کوئی قباحت نہ رہتی۔ اگرچہ حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن پردہ میں ہے۔ اور پردہ میں رہنے والے کی نیابت، پردہ کے باہر رہنے والا کر سکتا ہے۔ اس نیابت کے تخیل میں جو رفعتیں ہیں

وہ پرانے ساکنین ارض کی جانشینی کے تخیل میں ہرگز نہیں ہیں۔ کاش مولانا لفظی قیود سے بالاتر ہو کر معانی کے عالم میں ان دونوں مفہوموں کا فرق ملاحظہ فرماتے۔

قرآن مجید کی بکثرت آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلافت سے مراد زمین میں خداوند تعالےٰ کی نیابت ہی ہے۔ جگہ جگہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی و برتری دی (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ) اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی (وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا) اور زمین میں جو کچھ ہے ان کے لئے مسخر کر دیا (سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ)۔ پھر فرمایا گیا کہ جس بار امانت کو سنبھالنے کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کی مخلوق کو ہمت نہ ہوئی تھی، وہ بار انسان نے اٹھا لیا۔ اس سلسلہ کی تمام آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے علم، اپنی قدرت، اپنی عقل، اپنی قوت تمیز اور اپنی حاکمانہ برتری کے اعتبار سے تمام ان مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے جو زمین اور اس کے ماحول میں موجود ہیں، اور اسی برتری کے اعتبار سے اس کو مجازاً نہ کہ حقیقی لغوی معنوں میں "خلیفہ خدا" کہا گیا ہے۔ اس خلافت کے مقام اور حیثیت سے آگاہی بخشنے کا مقصود دراصل یہ جتانا ہے کہ نائب ہونے کی حیثیت سے انسان کو اپنے محکوموں اور اپنی تابع فرمان اشیاء کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ خود رب العالمین کا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ اَحْسِن كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ کی الٰہی نصیحت اسی اصل پر مبنی ہے۔

آدم کا گناہ صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے کہ "آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا ورنہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی"۔ یہ تفسیر بالرائے کی ایک بری مثال ہے۔ توبہ قبول کرنے کا مفہوم گناہ معاف کر دینے کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے واضح کیا جائے۔ حضرت آدم کے متعلق حق تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ نہ صرف ان کی توبہ قبول کی گئی، بلکہ ان کو برگزیدہ کیا گیا اور انہیں ہدایت بخشی گئی (ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ)۔ پھر صفحہ ۱۳۹ پر خود مؤلف نے آدم کے نبی ہونے کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا؟

رہا یہ سوال کہ اگر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو معاف کر دیا تھا تو انہیں جنت سے کیوں نکال دیا؟ تو اس کا جواب خود قرآن ہی سے مل جاتا ہے۔ قرآن میں یہ کہاں ارشاد ہوا ہے کہ آدم جنت میں رہنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے؟ وہاں تو صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جب آدم کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا اسی وقت ان کو زمین کی خلافت دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ اس تصریح کے بعد اس شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے؟

قبول توبہ اور عفو تقصیر میں جو فرق مولانا نے کیا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جہاں جہاں قرآن میں توبہ قبول کرنے کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد عفو تقصیر ہی ہے، اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے کہ وہ کفار و مشرکین تک کو یہ امید دلاتا ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو اور اپنے گناہ سے باز آجاؤ تو خدا تمہارے پچھلے قصور معاف کر دیگا۔ یہ رحمت اور عفو و کرم کا دروازہ جو اسلام نے کھولا ہے۔ وہ اس تفریق سے بند ہو جاتا ہے جو قبول توبہ اور عفو گناہ میں کی گئی ہے۔

غلامی کا مسئلہ صفحہ ۵۵ پر مولانا نے لکھا ہے۔

> "ایک انسان کا دوسرے کو غلام بنانا فطرت کے خلاف ہے لیکن دنیا میں غلامی رائج ہوگئی تھی اور نزول قرآن کے زمانے میں عربوں کے پاس بھی مملوک تھے قرآن نے بعض مصالح کی وجہ سے ان مملوکوں پر جو ان کی غلامی میں آچکے تھے ان کی ملکیت کو بدستور رہنے دیا۔"

اس کے بعد انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ :-

> "قرآن میں جہاں بھی مملوکوں کا ذکر ہے بصیغہ ماضی یعنی ملکت ایمانکم ہے بصیغہ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی۔"

یہ متن اور حاشیہ دونوں نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھ کر تدریجی طریقے سے اصلاح کی گئی ہے لیکن کوئی مثال قرآن میں ایسی نہیں ملتی کہ کسی مسئلے میں اس نے اپنی تدریجی اصلاح کو نامکمل چھوڑ دیا ہو، اور آخری اصلاح کا حکم نزول وحی کے زمانہ ہی میں نہ دیدیا ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ اگر درست ہے تو کیا غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید کا کوئی ایسا حکم دکھایا جا سکتا ہے جس نے غلامی کی ہر شکل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہو؟ رہی یہ بات کہ عرب میں چونکہ غلامی رائج تھی اور لوگوں کے پاس ممالیک موجود تھے اس لئے غلامی کو مصلحتاً باقی رکھا گیا، تو غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ ایسی مصلحت شناسی کو خدا کی طرف منسوب کرنا دراصل خدا کی طرف کمزوری کو منسوب کرنا ہے جس خدا نے شراب کو حرام کر دیا اور اس معاملہ میں بندوں کی خواہشات کی ذرا پرواہ نہ کی، جس نے زنا کو حرام کر دیا، اور اس امر کی ذرا پروا نہ کی کہ عرب اور دوسرے ممالک میں زنا کا کس قدر رواج تھا، اس کو کونسا امر غلامی کی ہر صورت کو قطعاً حرام کر دینے سے روک سکتا تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ غلامی کی دو صورتیں اس وقت دنیا میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ بعض ممالک کے آزاد باشندوں کو پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان دونوں شکلوں میں سے پہلی شکل کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی بنونگا۔ (بخاری کتاب البیوع) اور دوسری شکل کے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کا یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن سے مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کا مبادلہ کر لیا جائے لیکن اگر رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو، اور فدیہ وصول نہ ہو سکے، اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ البتہ اس قسم کے غلاموں کے ساتھ انتہائی حسن سلوک اور رحمت و رافت کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو تعلیم و تربیت دینے اور

انہیں سوسائٹی کے عمدہ افراد بنانے کی ہدایت کی گئی ہے، اور مختلف صورتیں ان کی رہائی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس باب میں اسلام کا صحیح قانون معلوم کرنے کے لئے قرآنی احکام کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات، اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

مالملکت ایمانکم سے جو نکتہ مؤلف نے پیدا کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے نزول قرآن کے بعد بھی صحابہ کے عہد میں بہت سے اسیران جنگ کو ممالیک کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔ خود اہل بیت رسول کے گھروں میں جنگ سے پکڑے ہوئے غلام اور مفتوح ممالک سے آئی ہوئی لونڈیاں موجود تھیں۔ تو کیا ان سب لوگوں نے حکم قرآن کی دانستہ خلاف ورزی کی؟ یا یہ سب قرآن کے حکم سے ناواقف تھے؟

پھر اگر یہ قاعدہ بنا لیا جائے کہ جو کچھ قرآن میں بصیغۂ ماضی کہا گیا ہے اس سے مراد صرف ماضی ہی ہوگا، حال یا مستقبل نہ ہوگا، تو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کی تاویل آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں کہ "جب قیامت آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا" اور کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کا ترجمہ آپ نے "اس کا عرش پانی پر ہے" کیوں فرمایا؟

آگے چل کر مؤلف نے حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً سے یہ استدلال کیا ہے کہ:۔

"غلامی کا صرف ایک ہی رستہ تھا یعنی اسیران جنگ۔ قرآن نے ان کو آزاد کر دینے کا حکم دے کر ہمیشہ کے لئے اس راستہ کو بند کر دیا۔"

لیکن مولانا نے یہ غور نہ فرمایا کہ اگر کفار نہ مال کی صورت میں فدیہ دیں، اور نہ اسیران جنگ کا مبادلہ کریں تو کیا ایسی صورت میں بھی مسلمانوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ لازماً اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کر دیں؟ اگر اسیران جنگ کو رہا کرنے سے دشمن کو مزید قوت پہنچنے کا خطرہ ہو، اور مسلمانوں کو اندیشہ ہو کہ

یہ لوگ آزاد ہو کر پھر ہم سے لڑنے آئیں گے تو کیا اس صورت میں بھی یہ حکم ہے کہ انھیں رہا کر دیا جائے؟ کم از کم آیت کے الفاظ سے یہ قطعی اور لازمی حکم نہیں نکلتا۔ آیت میں "منّا" کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں۔ اور قرآن میں کہیں احسان کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ ہر جگہ اسے افضلیت کا درجہ دے کر اس کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن مجید کا مقصود یہ ہے کہ احسان رکھ کر چھوڑ دینا زیادہ افضل اور بہتر ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اگر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو تب بھی احسان کیا جائے اور ضروری کیا جائے۔

زمین کی ملکیت کا مسئلہ صفحہ ۵ پر مولف نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ حکم نکالا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت (زمینداری) ناجائز ہے چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

> زمین کی وراثت کا جہاں جہاں قرآن میں ذکر ہے ..... اس کے معنی حکومت کے ہیں۔ شخصی ملکیت یعنی زمینداری کے نہیں ہیں۔ قرآن نے بجز حق انتفاع کے زمین پر حق ملکیت عطا نہیں کیا ہے۔"

یہاں پھر نکتہ آفرینی کی کوشش میں مولانا حق سے تجاوز کر گئے ہیں۔ انھیں غور فرمانا چاہئے تھا کہ زمین کی شخصی ملکیت کا دستور نزول قرآن کے وقت تمام دنیا میں رائج تھا صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا۔ اور تمدن کے اساسی دستوروں میں داخل ہو گیا تھا۔ اگر قرآن کا مقصود فی الحقیقت اس نظام تمدن میں ایسی اساسی ترمیم کرنا ہوتا، اور اگر وہ فی الواقع زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا چاہتا جس کی جڑیں انسانی تمدن میں اتنی گہری جمی ہوئی تھیں، تو کیا ایسی انقلاب انگیز کارروائی کے لئے وہی زبان موزوں ہو سکتی تھی جو وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ میں استعمال کی گئی ہے؟ ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی اہم اور اساسی اصلاحوں کے لئے محض سرسری اشارے کافی نہیں ہوتے بلکہ صریح احکام دینے ضروری ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی کافی نہیں ہوتا کہ محض سابق دستور کو مٹا دیا جائے، بلکہ اس کو مٹانے

کے ساتھ خود اپنی طرف سے ایک دوسرا دستور بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اب کیا مولنا یہ بتاسکتے ہیں کہ قرآن نے شخصی ملکیت کا قاعدہ منسوخ کرکے کونسا دوسرا قاعدہ اس کی جگہ مقرر کیا؟ اور اگر قرآن کا منشا کوئی دوسرا قاعدہ مقرر کرنا ہی تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے شخصی ملکیت کے قدیم دستور کو کیوں باقی رکھا، اور خود لوگوں کو جاگیریں دیں؟

جس آیت سے مولانا استدلال فرمارہے ہیں اس کے الفاظ اور موقع ومحل پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مقصود کوئی قانون بنانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ساری تقریر اس انداز پر ہے کہ "رحمان نے قرآن کا علم دیا" انسان کو پیدا کیا' اسے بیان کی قوت دی۔ اسی کے حکم سے چاند سورج گردش میں ہیں۔ درخت اور گل بوٹے سب اسی کے آگے سربسجود ہیں۔ اس نے آسمان کو اونچا کیا، اور نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھادی جس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں، اور طرح طرح کے اناج اور خوشبودار پھول ہیں اب تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤگے"۔ اس تقریر میں تمدنی قانون بیان کرنیکا کونسا موقع تھا؟ اور صرف یہ فقرہ کہ "نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھادی" یہ معنی کہاں دیتا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت ناجائز ہے؟ قرآن سے احکام نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ اور اس کے موقع ومحل اور سیاق وسباق کو پیش نظر رکھا جائے۔ پھر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ جو قانون ہم اس آیت سے اخذ کر رہے ہیں آیا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں عملاً جاری بھی فرمایا تھا یا نہیں۔ اگر معلوم ہو کہ آپ نے ایسا قانون جاری نہیں فرمایا، بلکہ آپ کا عمل اس کے خلاف رہا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ بادی النظر میں قرآن کا جو مفہوم ہم سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلط ہوگا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام دئے گئے ہیں ان پر عمل کرکے بتائیں اور زندگی کے معاملات میں ان کو جاری کردیں اگر آپ احکام قرآنی کے مطابق زندگی کے قدیم طریقوں میں اصلاح نہ فرماتے اور الٰہی قوانین کو نافذ کرنے کے بجائے پرانے دستوروں کی پیروی کرتے تو نعوذ باللہ آپکی بعثت بالکل فضول ہوتی، بلکہ بعثت کا اصل منشا ہی فوت ہوجاتا کم از کم اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ آنحضرت ﷺ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ باقی

نقد و نظر

۱۔ رسائل۔

جنوری سنہ رواں سے تین خاص رسالے جاری ہوئے ہیں خوشی کی بات ہے کہ یہ تینوں رسالے مذاق عام کے غلام نہیں ہیں۔

جاوید دہلی | مرتب۔ مولوی عبدالوحید صاحب صدیقی و مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی ضخامت ۶۲ صفحات سالانہ چندہ تین روپیہ ملنے کا پتہ۔ مٹیا محل دہلی۔

جاوید کے تین نمبر ہمارے پیش نظر ہیں۔ ہر نمبر سابقہ نمبر سے بہتر ہے مضامین زیادہ تر علمی اور مذہبی ہیں مولنا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولنا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم دیوبند جیسے علماء کی قلمی اعانت اس کو حاصل ہے۔ عام دلچسپی کیلئے کبھی ایک آدھ افسانہ کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اگر جاوید اسی مسلک پر چلتا رہا تو ہم امید کرتے ہیں کہ وہ دین اور علم کی مفید خدمت انجام دیگا۔

کونین، گورکھپور | ۔مرتب: ۔مولوی عزیز الرحمان صاحب اصلاحی و محمد یحییٰ صاحب عظمی بی۔اے ضخامت ۴۰ صفحات، سالانہ چندہ ۱؏۔ ملنے کا پتہ: ۔منیجر رسالہ کونین، لکھوکھرپور۔گورکھپور۔

اس رسالہ کا مقصد ایسے لوگوں کیلئے معلومات فراہم کرنا ہے "جو دنیا کے حالات سے بہت کم واقف ہیں"۔ اس لئے "زبان اور مضامین میں ایسے ہی لوگوں کے ذوق و رجحان کی پابندی" کی جاتی ہے۔ دینیات، سیاسیات، معاشیات، مختارات، وجدانیات، نسانیات، ادبیات، بصائر و حکم، تعلیم و تربیت، تاریخ و سیر، حوادث وایام، عالم اسلام، زرعیات، اقتباسات اور معلومات اس کے مستقل عنوانات ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت مفید مضامین درج کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ میں ایک خاص چیز، مولنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر القرآن کے ایک جزو (سورۃ اللھب) کا ترجمہ ہے" جو تیسرے نمبر سے شروع ہوا ہے اور مسلسل شائع ہو رہا ہے

کو نہیں بڑا کام کرے گا۔ اگر مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر کے شائع شدہ اجزا کا ترجمہ شائع کرتا رہے گا۔

شہاب جونا گڈھ مرتبین:۔ مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی و قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی ضخامت ۴۸ صفحات سالانہ چندہ (عہ) روپیہ۔ ملنے کا پتہ دفتر شہاب کنگ روڈ جونا گڈھ کاٹھیاواڑ

اس رسالہ کے کاتب و مرتب ملک کے مشہور اہل قلم ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کاٹھیاوار میں "اردو کی اشاعت کی جائے اور ایسے اسباب مہیا کئے جائیں جن سے اس زبان کی طرف لوگوں کو خود رغبت پیدا ہو"۔ اس پرچہ کے چھ خاص عنوانات ہیں: لمعات، اس کو معارف کے شذرات سمجھئے، مقالات، تاریخ۔ ادبیات، معلومات۔ اور علمی خبریں۔ مقالات کے تحت پروفیسر سید محمد علی صاحب کا مضمون علم مواقیت الصلاۃ اور اسمٰعیل ابرہانی صاحب کا مضمون "انگریزی اعلیٰ تعلیم کا دردناک انجام" اور تاریخ کے تحت مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی کا مضمون "بوہرہ قوم کی اصلیت" قابل قدر مضامین ہیں۔

تحفہ معراج شریف از جناب حاجی رحیم بخش صاحب ایم۔ اے ضخامت ۳۱ صفحات اس رسالہ میں جناب حاجی صاحب نے نہایت قابلیت سے مسئلہ معراج پر گفتگو فرمائی ہے اور قرآن میں تدبر اور آیات کا تتبع کر کے ثابت کیا ہے کہ معراج جسمانی تھی۔ اور جو الفاظ قائلین معراج روحانی کے لئے محل شک ہوئے ہیں کلام عرب سے ان کے معنی کی تحقیق کی ہے۔ حق یہ ہے کہ حاجی صاحب کا یہ رسالہ اس باب میں قول فیصل ہے۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ جلد ۴۔ عدد ۴

معذرت۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ایڈیٹر کی مسلسل بیماری کے سبب سے ان مضامین کا سلسلہ رک گیا ہے جو ترجمان القرآن میں شایع ہو رہے تھے۔ رسالے کی ترتیب بھی درست نہیں رہی ہے اور اشاعت بھی تاخیر سے ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ آیندہ مہینے میں اس نقصان کی تلافی ہو جائیگی۔

منیجر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

(پچھلے سال اسی مہینے میں آپ کو برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کے وہ کارنامے سنائے گئے تھے جو اس نے ۱۸۰۴ء سے ۱۹۳۲ء تک انجام دیے ہیں۔ آج ہم اس سبق آموز داستان کا ایک دوسرا ورق پیش کرتے ہیں جو ۳۳-۱۹۳۲ء اور ۳۴-۱۹۳۳ء کی رپورٹوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ داستان سبق سکھانے والی ضرور ہے۔ مگر افسوس کہ ہم میں ابھی تک سبق سیکھنے والے پیدا نہیں ہوئے۔ کاش! سبق سنتے سنتے ہم میں سیکھنے اور عمل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جائے۔)

۳۳-۱۹۳۲ء میں اس سوسائٹی نے دنیا کی ۱۲ نئی زبانوں میں بائبل کے ترجمے شائع کیے، جن میں سے چھ زبانیں ایشیا کی ہیں چار افریقہ کی، ایک امریکہ کی اور ایک یورپ کی۔ اس طرح اُن زبانوں کی تعداد ۶۶۷ تک پہنچ گئی جن میں بائبل کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔

ایک سال کے اندر بائبل اور اس کے متفرق حصوں کے جتنے نسخے دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کیے گئے ان کی مجموعی تعداد (۱۰۶۱۷۴۰۰) تھی جو سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے مقابلہ میں ۶۵ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ممالک کے لحاظ سے اس تعداد کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

ایشیا	۶۹۵۰۰۰۰
یورپ	۱۶۶۰۰۰۰

جزائر برطانیہ	۸۵۷۰۰۰
جنوبی امریکہ	۳۹۸۰۰۰
افریقہ	۳۵۲۰۰۰
کنیڈا اور نیوفاؤنڈلینڈ	۳۱۷۰۰۰
آسٹریلیا	۱۷۰۰۰۰
نیوزی لینڈ	۳۴۰۰۰
اوشیانیا	۴۰۰۰

سب سے زیادہ اشاعت چین میں ہوئی جہاں بائبل اور اُس کے مختلف حصوں کے ۲۴ لاکھ نسخے ایک سال کے اندر شائع ہوئے۔

ہندوستان میں صرف الہ آباد کی شاخ نے جس قدر کام کیا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک سال میں ۹۱۶۶۲۳ نسخے تقسیم کئے گئے۔ جو ۴۰ مختلف زبانوں میں تھے۔ ۵۴ مردوں اور ۶ عورتوں نے گھر گھر پھر کر ۵۴ ہزار سے زیادہ نسخے فروخت کیے۔ یونیورسٹیوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو ۲۹۴ نسخے مکمل بائبل کے اور ۴۹۹ نسخے جدید عہد نامہ کے مفت دیئے گئے، اور ۴۵۴۹ روپے کے عطیے بائبل سوسائٹی کی امداد کے لئے وصول ہوئے۔

الہ آباد کی شاخ ۱۸۴۸ء میں قائم ہوئی تھی پہلے سال اس نے تقریباً ۱۰ ہزار نسخے شائع کئے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ تعداد ۴۹ ہزار تک پہنچی، اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۵۸ سال کی مدت میں صرف اس شاخ سے بائبل کے جو نسخے شائع ہوئے ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۷۷ لاکھ سے زیادہ ہے۔

اب سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء کی روداد سنیے۔

تمام دنیا میں ۱۰۹۳۳۲۰۳ نسخے شائع ہوئے جو بمقابلہ سال گذشتہ کے ۴ لاکھ زیادہ تھے۔ ممالک کے لحاظ سے تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ یورپ	۱۵۸۹۰۰۰	مغربی یورپ	۱۰۳۴۱۱۴
		وسطی یورپ	۳۰۸۰۰۰
		شمالی مشرقی یورپ	۷۵۰۰۰
		جنوبی مشرقی یورپ	۱۷۱۰۰۰
۲۔ ایشیا	۶۷۰۸۰۰۰	چین	۳۹۰۲۰۰۰
		کوریا	۶۵۵۰۰۰
		ملایا	۱۷۸۰۰۰
		سیلون اور ہندوستان	۱۱۸۷۰۰۰
		برما	۱۳۴۰۰۰
		جاپان	۵۴۱۰۰۰
		ایران و عراق	۶۹۰۰۰
		فلسطین و شام	۳۸۰۰۰
۳۔ افریقہ	۵۰۹۰۰۰		
۴۔ جنوبی امریکہ	۴۴۳۰۰۰		
۵۔ کینیڈا اور نیوفاونڈ لینڈ	۲۷۶۰۰۰		
۶۔ نیوزی لینڈ	۲۵۰۰۰		

۷۔ آسٹریلیا ۱۷۲۰۰۰

۸۔ برطانیہ عظمیٰ ۸۴۴۵۵۸

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ یورپ میں بائیبل کی اشاعت گھٹ رہی ہے۔ اسپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، بلجیم، جرمنی، زیکوسلوواکیا، یوگوسلیویا، یونان، لتھوانیا، فنلینڈ اور خود بائیبل سوسائٹی کے گھر یعنی جزائر برطانیہ کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ سال گذشتہ کے مقابلہ میں ہزاروں کی کمی ہوئی ہے لیکن شرقی ممالک میں بیشتر ایسے ہیں جو گذشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال بائیبل کے زیادہ خریدار نظر آتے ہیں مثلاً ہندوستان میں ۹۵ ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔ برما میں ۴۴ ہزار، جاپان میں ۱۵ ہزار، ایران و عراق اور فلسطین و شام میں ۴ ہزار، شمالی افریقہ میں ۶ ہزار، استوائی افریقہ میں ۱۸ ہزار، وسط جنوبی افریقہ میں ۵۵ ہزار، نٹال میں ۳ ہزار، اور کیپ کے علاقہ میں ۸۰ ہزار کی بیشی ہوئی ہے۔

جاپان میں بائیبل کی اشاعت جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ چار نفری گشتوں نے ایک سال میں تین تین ہزار سے زائد نسخے فروخت کئے، اور ایک کے فروخت کردہ نسخوں کی تعداد تو ۵۴ ہزار تک پہنچ گئی۔

اس سال ۱۱ نئی زبانوں میں بائیبل کا ترجمہ ہوا جن میں سے ۹ زبانیں افریقہ کی ہیں۔ ایک یورپ کی اور ایک اوشیانیا کی۔ اس طرح ان زبانوں کی تعداد ۸۷۶ تک پہنچ گئی ہے جن میں اب تک بائیبل یا اس کے بعض حصوں کے ترجمے شایع ہو چکے ہیں۔

جن نئی زبانوں میں اس سال تراجم شائع کئے گئے ہیں ان کا بھی مختصر حال سن لیجئے۔

نائیجریا کی کمبری زبان جس کے بولنے والے ۴۵۰۰۰ ہیں۔

نائیجیریا کی ڈاکا زبان جس کے بولنے والے ۲۰۰۰۰ ہیں

استوائی افریقہ کی یاکا " " ۱۵۰۰۰ "

" لمبو " " ۱۵۰۰۰ "

" بایا " جس میں خواندہ لوگوں کی تعداد صرف ایک ہزار ہے

نیکا " جس کو زیادہ تر مسلمان بولتے ہیں۔

سوڈان کی بابی زبان جس کے بولنے والے اسلامی علاقوں سے محصور ہیں۔

حبش کی سیڈاموزبان جس کے بولنے والے ۱۵۰۰۰۰ ہیں۔

اوشیانیا کی کوتینی زبان جس کے بولنے والے ۲۵۰۰ "

یہ اعداد خود اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں کہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں اگر کسی زبان کو چار دو ہزار انسان بھی بولتے ہیں تو اس میں بائبل منتقل کر دی گئی ہے تاکہ یہ لوگ خود اپنی زبان میں اس کتاب کو پڑھ سکیں اور مسیحیت کا پیغام سمجھ سکیں۔

پھر یہ بھی نہیں ہے کہ ترجمے محض سرسری طور پر رواروی میں کر دیے گئے ہوں۔ ان میں سے بیشتر تراجم ایسے ہیں جو کئی کئی آدمیوں نے مل کر کیے ہیں۔ بار بار ان کی نظرثانی کی گئی ہے۔ دیسی باشندوں کو خاص طور پر تعلیم دے کر اس لئے طیار کیا گیا ہے کہ ترجمہ اور نظرثانی میں مدد دے سکیں۔

حال میں بائبل کا سب سے اہم ترجمہ وہ ہے جو افریقان بائبل کے نام سے مشہور ہے۔ افریقانی زبان جنوبی افریقہ کی عام زبان ہے۔ اب تک وہاں ولندیزی زبان کی بائبل رائج تھی جس کو عوام نہ سمجھ سکتے تھے۔ بائبل سوسائٹی نے مترجموں کا ایک بورڈ اس زبان میں کتاب مقدس کا ترجمہ کرنے کے لئے مقرر کیا جس نے دس سال کی مسلسل محنتوں کے بعد پچھلے سال اس کام کو مکمل کیا ہے۔ سال رواں میں پہلی مرتبہ اس ترجمہ کے ۲۲۰۰۰ نسخے

طبع کرکے جنوبی افریقہ بھیجے گئے اور سب کے سب فروخت ہو گئے۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا اثر یہ ہوا کہ مسیحیت جو جنوبی افریقہ میں مردہ ہوتی چلی جارہی تھی، یکایک جی اٹھی، کلیسا پھر سے بھرنے شروع ہو گئے اور گھروں میں اہل خاندان کے مل کر دعا کرنے کا طریقہ جو قریب قریب موقوف ہو چکا تھا از سرِنو جاری ہو گیا۔

اب کچھ تھوڑا سا حال ان لوگوں کا بھی سن لیجیے جنہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں بائیبل کے ترجمے کئے ہیں۔ ہم ان کی طویل فہرست میں سے صرف چھ مثالیں پیش کریں گے تاکہ یہ داستان زیادہ طویل نہ ہو جائے، اور چند نمونوں سے آپ اس دین پرست جماعت کے جذبۂ خدمت کا اندازہ لگا لیں۔

بورنیو کے جنگلوں میں ایک قوم ڈایک نامی رہتی ہے جس کے چند قبائل سراوک کی ریاست میں آباد ہیں اس قوم کی زبان کا نام بھی ڈایک ہی ہے۔ اب سے ستر برس پہلے وہاں جو مبلغین نے کام شروع کیا اور بہت سے خاندانوں کو عیسائی بنا لیا۔ اس وقت تک ڈایک زبان میں تحریر کا رواج نہ تھا۔ مشنریوں نے ان کے لئے ایک رسم الخط ایجاد کیا۔ مدارس قائم کئے اور اس حد تک تعلیم پھیلا دی کہ اب کم از کم ہر گھر میں ایک لکھا پڑھا آدمی موجود ہے اس طرح زمین طیار کر لینے کے بعد بائیبل کا ترجمہ شروع کیا گیا۔ ان کی زبان میں الفاظ کی بہت کمی تھی اور جو تھوڑے بہت الفاظ تھے بھی تو وہ وسیع معانی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سالہا سال کی کوششوں کے بعد اس زبان کو اس قابل بنایا گیا کہ بائیبل کے مضامین اس میں ادا ہو سکیں، اور ابھی پچھلے سال اناجیل اربعہ کا مکمل ترجمہ ڈایک میں شائع ہوا ہے

وسط افریقہ میں ایک زبان بولی جاتی ہے جس کا نام بن ٹو ہے، اس کے بولنے والے بھی بالکل وحشی تھے مشنریوں نے جا کر ان کے درمیان پوری پوری عمریں گذاریں۔ ان کی زبان سیکھی۔ اس کے لئے رسم الخط ایجاد کیا۔ اس کی گرامر مرتب کی۔ قاموس بنائی۔ مدرسے قائم کر کے لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اس کے بعد بائیبل کا ترجمہ شائع کیا

سب سے پہلے لٹریچر کی جس کتاب سے یہ لوگ آشنا ہوئے وہ یہی بائبل تھی اس سے انکے اندر دفعتہً ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی اپنے لوگوں کے بچے جب کتابیں پڑھتے تو ان کے خاندان والے اس عجیب تماشے کو دیکھنے کے لئے جمع ہوجاتے تھے، اور بسا اوقات ایک ایک بچے کی زبان سے پورا پورا گاؤں بائبل سنتا تھا۔ ان مناظر نے پوری قوم میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کردیا۔ اور اس اچھوتی زمین میں مسیحیت کی پہلی ہی تخم ریزی خوب بارآور ہوئی۔

بن ٹو زبان میں بائبل کا پہلا ترجمہ ناقص تھا۔ مشنریوں کے جو بچے اس سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، اور جن کے لئے بن ٹو زبان مادری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، وہ اب بڑے ہوکر اس ترجمہ پر نظرثانی کررہے ہیں۔

مغربی افریقہ میں ساحل سمندر سے ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ایک قوم رہتی ہے جس کا نام ٹانگالیسی ہے ۴۰ ہزار کے قریب ان کی آبادی ہے علم و تہذیب تو درکنار، کپڑوں تک سے ناآشنا۔ زیادہ سے زیادہ لباس جو ان کے ہاں مستعمل ہوتا ہے وہ کچی کھالیں اور تازہ پتے ہیں۔ نہایت مشکل اور بے ڈھنگی زبان بولتے ہیں جس کو قید تحریر میں لانا محال معلوم ہوتا تھا۔ مگر مسیحی مشنری کا جذبۂ عمل ان تمام مشکلات پر غالب آگیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں لوقا کی انجیل ان کی زبان میں شائع کی گئی۔ اور سنہ ۱۹۳۰ء میں پورا عہدنامہ جدید خود اس علاقہ کے ایک پریس میں چھاپ دیا گیا۔ اس وقت وہاں ۳۰ مدرسے قائم ہیں۔ خود وہیں کے چند آدمی جو ابتداءً عیسائی ہوگئے تھے اور جنہیں مشنریوں نے پڑھا لکھا دیا تھا، ان مدرسوں کو چلا رہے ہیں۔ استاد اپنے کھیتوں میں محنت کرتے، اور فرصت کے اوقات مفت تعلیم دینے میں صرف کردیتے ہیں۔ مدرسوں کی عمارتیں بھی دیسی باشندوں نے خود بنالی ہیں، مشنریوں کو ایک پیسہ اپنے پاس سے صرف کرنا نہیں پڑتا۔

جنوبی افریقہ کے اندرونی علاقوں میں ایک قوم سوٹو زبان بولتی ہے سنہ ۱۸۶۰ء میں ایک نوجوان مشنری اڈولف مابیل نامی اپنی بیوی سمیت وہاں جاکر رہا اور پورے ۴۴ سال وہیں گذار دیے۔ اس نے وہاں ایک

نارمل اسکول قائم کرکے اساتذہ تیار کرنے شروع کئے۔ اس مدرسہ کی ابتدا صرف تین آدمیوں سے ہوئی تھی۔ بعد میں اس سے اتنے اساتذہ تیار ہوئے کہ سارے ملک میں تعلیم دینے کے لئے پھیل گئے۔ پھر اس نے بائبل اسکول اور دینیات کی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا اور ایک مطبع کھولا اور ایک رسالہ نکالا جس کو ابتداءً وہ خود ہی لکھتا اور خود چھاپتا تھا پھر اس نے سات آدمیوں کی مدد سے بائبل کا ترجمہ شروع کیا، اور بیس سال کی لگاتار محنت کے بعد اس کو مکمل کرکے چھوڑا۔ وہ اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ ہر کتاب کا ترجمہ مکمل کرنے کے بعد ہم اس پر کئی کئی مرتبہ نظر ڈالتے اور اگر اطمینان نہ ہوتا تو اس کو ردی کرکے پھر ترجمہ کرتے۔ بعض اوقات ہم کو ایک ایک کتاب کا ترجمہ چار چار مرتبہ کرنا پڑا۔ اس محنت شاقہ کے ساتھ ۱۳ تبلیغی مراکز اور ۱۲ مدرسوں کی نگرانی بھی وہ خود کرتا تھا، رسالے اور پریس کا کام بھی انجام دیتا تھا، اور چار گھنٹے روزانہ پڑھاتا بھی تھا۔

ایک دوسرے شخص ڈاکٹر ایڈورڈ اسٹیر کا کارنامہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ یہ لنڈن یونیورسٹی کا گریجویٹ، قانون کا ڈاکٹر، فن قانون کی مہارت میں سونے کا تمغہ پائے ہوئے تھا۔ باپ چاہتا تھا کہ بیرسٹری کرے مگر اس نے فلسفہ و الٰہیات کا مطالعہ کیا اور اپنی زندگی مسیحیت کی خدمت کیلئے وقف کر دی ۱۸۶۴ء میں زنجبار کے بشپ ٹوزر کے ساتھ مشرقی افریقہ گیا، اور وہاں ایک مدرسہ جاری کیا جس میں ابتداءً صرف پانچ زنگی لڑکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سواحلی زبان سیکھنی شروع کی جو افریقہ کی سب سے زیادہ عام تجارتی زبان ہے، اور برّ اعظم کے اندرونی علاقوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس زبان میں کافی مہارت حاصل کرنے کے بعد اس نے پہلے متی کی انجیل کا ترجمہ کیا جو ۱۸۶۹ء میں لندن سے شائع ہوا۔ پھر ۱۸۸۲ء میں وہ پورے عہد نامہ جدید کا ترجمہ لے کر خود انگلستان گیا اور اسے اپنی نگرانی میں طبع کرایا۔ اس کے بعد اس نے عہد عتیق کا ترجمہ شروع کیا مگر عمر نے وفا نہ کی، ایک روز اچانک وہ اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ اس کی میز پر ترجمہ کا مسودہ پڑا ہوا تھا اور آیندہ کام جاری رکھنے کے لئے ہدایات لکھی ہوئی موجود تھیں۔

سیموئل پولرڈ بھی اسی طرح کا ایک صاحب عزم مشنری تھا۔ سنہ ۱۸۸۷ء سے چین میں تبلیغ مسیحیت کر رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں چین کے ایک نیم وحشی قبیلہ میاؤ سے اس کے تعلقات ہوئے اور اس نے ۴۰ برس کی عمر میں ان کی زبان سیکھنی شروع کی۔ ان کی زبان میں تحریر کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے ایک آسان سا رسم الخط ایجاد کیا اور قلیل مدت میں سینکڑوں آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ پھر اس نے عہد جدید کا ترجمہ ان کی زبان میں شروع کیا سنہ ۱۹۰۹ء میں مرقس کی انجیل شایع کی۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں پورا عہد جدید شایع کر دیا آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ قضا کا پیغام آ گیا اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ میرے لئے اس سے بڑھکر خوشی کی کوئی بات نہیں کہ یہ لوگ سب سے پہلے جس کتاب کو پڑھیں گے وہ مسیح کی کتاب ہوگی۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسیحیت اپنی کمزوریوں کے باوجود دنیا کے ہر حصہ میں پھیلتی چلی جا رہی ہے، اور آبادیاں کی آبادیاں کلیسا کے دائرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر میں سب کو نظر آتی ہے۔ یعنی عیسائی قوموں کی دولت، ان کے تمدنی اثرات اور ان کی سیاسی طاقت۔ لیکن اس ظاہر کی تہ میں جو ایثار، جو قربانیاں، جو فداکاریاں، جو حیرت انگیز محنتیں اور کوششیں کام کر رہی ہیں، ان کا حال کم لوگوں کو معلوم ہے حالانکہ درحقیقت مسیحیت کے پھیلنے میں عیسائی قوموں کی مادی طاقتوں کا اتنا حصہ نہیں ہے جتنا عیسائی مشنریوں کی ان محنتوں اور پرخلوص جدوجہد کا حصہ ہے۔ اگر ان میں خدمت دین کا یہ زبردست جذبہ نہ ہوتا تو محض دولت اور تمدن اور سیاسی قوت کے بل پر مسیحیت کو کبھی یہ فروغ نصیب نہ ہوتا۔

یہ دنیا دار العمل ہے۔ یہاں کا قانون یہی ہے کہ جو اپنے مقصد کے لئے جان و مال اور آرام و آسایش کو قربان کرے گا وہی کامیاب ہوگا۔

غور تو کیجئے کہ ایک مشنری انگلستان جیسے متمدن ملک میں پیدا ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے، اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ مادی ترقیوں کے امکانات اس کے استقبال کو موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان سب کو چھوڑ کر اپنے وطن سے دور صحراؤں میں انتہا درجہ کی وحشی قوموں کے درمیان جا بستا ہے جہاں کی ہر چیز اس کے مزاج، اس کی عادات اور اس کے ذہنی و جسمانی مالوفات کے بالکل خلاف ہے۔ اس وحشت کی دنیا میں یہ متمدن اور تعلیم یافتہ انسان سال دو سال نہیں تیس تیس اور چالیس چالیس سال گذار دیتا ہے۔ جوان جاتا ہے اور بوڑھا واپس آتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس کو پھر اپنا وطن دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔ وہ ان وحشی قوموں میں اس طرح رہتا ہے جیسے ان ہی میں کا ایک آدمی ہے۔ لگاتار محنتوں سے اُن کے توحش کو دور کر کے ان میں علم کا شوق اور مذہب کا ذوق پیدا کرتا ہے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس سے جو زمینیں بنجر پڑی ہوئی ہیں ان میں آبپاشیاں اور تخم ریزیاں کرتا ہے، اور ہزار مرتبہ ناکامیوں سے دوچار ہونے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارتا، مایوس نہیں ہوتا، پھر محنت کرتا ہے اور پھر کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ قربانیاں اور محنتیں رائیگاں جا سکتی ہیں؟ کیا ایسے اولوالعزم اور اپنے مقصد کے پیچھے جانیں لڑا دینے والے لوگ ناکام رہ سکتے ہیں؟ اگر کامیابیاں ایسے لوگوں کے قدم نہ چومیں گی تو کیا ان لوگوں کی قدمبوسی کریں گی جو صرف زبان سے مذہب پر جان دیتے ہیں، مگر اپنے کسی فائدے اور کسی لذت اور کسی لطف کو اس پر قربان کرنے کے لئے طیار نہیں، مسندوں پر گاؤ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، معتقدوں اور شاگردوں سے خدمتیں لیتے ہیں۔ بہتر سے بہتر کھانے اور عمدہ سے عمدہ لباس، اور اچھے سے اچھے مکان کے بغیر گزر نہیں کر سکتے، عقیدتمندوں کے جمگھٹ میں بیٹھ کر تقریریں کرتے ہیں۔ ہر طرف سے احسنت مرحبا کے شور سنتے ہیں اور اس زندگی کو سمجھتے ہیں کہ یہ دین کی خدمت میں بسر ہو رہی ہے۔

عیسائی تو اس جوش اور خلوص اور محنت کے ساتھ اس کتاب کی خدمت کر رہے ہیں جس کے محرف ہونے کا خود ان کو بھی علم ہے۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے مسیح کا کلام بھی نہیں ہے مسیح کے خاص

حواریوں کا کلام بھی نہیں ہے۔ بلکہ جن کی طرف منسوب ہے ان کی طرف بھی اس کی نسبت مشکوک ہے۔ بخلاف اسکے تمہارے پاس وہ کتاب ہے جس کے خاص کلام آلہی ہونے کا ہم کو علم اور یقین ہے۔ ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ کتاب رحمت کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ دنیا جس آب حیات کی پیاسی ہے، اور جس کے دھوکے میں ہر سراب کی طرف دوڑ رہی ہے، وہ دراصل اسی سرچشمہ کا پانی ہے، مگر ہم کو گریبانوں میں منہ ڈالکر دیکھنا چاہیے کہ اس کتاب کے نور کو پھیلانے کے لئے ہم کیا کوشش کر رہے ہیں؟ عیسائیوں میں اڈولف ہابیل اور ڈاکٹر اشپیر جیسے سینکڑوں موجود ہیں۔ مگر ہم ان کا سا ایک آدمی بھی نہیں رکھتے۔ عیسائی ۸۷۰ زبانوں میں بائیبل کا ترجمہ شایع کرتے ہیں۔ مگر قرآن مجید کے تراجم ابتک شاید دو درجن سے زیادہ زبانوں میں نہیں ہوئے، اور ان میں بھی بیشتر حصہ عیسائیوں ہی کا ہے۔ عیسائیوں نے جتنے ترجمے شائع کئے ہیں سب مستند اور معتبر ہیں اور ان کی صحت کا اطمینان کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہاں اردو اور فارسی کے سوا کسی زبان میں بھی کوئی قابل اطمینان ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ عیسائیوں نے ان زبانوں تک میں ترجمے کروائے ہیں جن کے بولنے والے ہزاروں سے زیادہ نہیں ہیں۔ مگر ہم نے ابھی تک ان زبانوں میں بھی قرآن کا ترجمہ نہیں کیا جن کے بولنے والے کروڑوں ہیں۔ حد یہ ہے کہ ہم نے آج تک انگریزی زبان میں بھی کوئی صحیح اور معتبر ترجمہ شایع نہیں کیا، حالانکہ ہمارے پاس اس کے ذرائع کا فقدان نہیں ہے، اور اغیار تو درکنار خود ہماری اپنی ملت کے ہزاروں تعلیمیافتہ اشخاص اس ترجمے کے حاجتمند ہیں۔ عیسائیوں نے وحشی زبانوں تک کو خاص بائبل کے ترجمے کے لئے ادبی اور تعلیمی زبان بنا دیا۔ مگر ہم نے ان زبانوں کو بھی قرآن کے علم سے بہرہ مند نہ کیا جو پہلے سے ادبی اور تعلیمی زبانیں ہیں۔ اس تفاوت عظیم کے باوجود اگر آج اسلام مسیحیت کا کامیاب مقابلہ کر رہا ہے اور اکثر میدانوں میں اسے شکست دے رہا ہے تو یہ صرف اس لئے ہے کہ اسلام کو مسیحیت پر بالذات فوقیت حاصل ہے، رہے مسلمان اور مسیحی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خدمت دین کے لحاظ سے مسیحی مسلمان کے مقابلہ میں ہزار درجہ بلکہ لاکھ درجہ زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

تفسیر سورۃ التین

از

مولوی اکرم علی صاحب محمدی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ۔

اس سورۂ شریف کی ابتدا میں واو قسمیہ ہے۔ قسم کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے وہ شریف و بزرگ اور جلیل المرتبت ہونی چاہئے۔ اس بنا پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ تین اور زیتون میں کونسا شرف ہے؟ اور اگر شرف ہو بھی تو باری تعالیٰ کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے کہ وہ کسی چیز کی قسم کھائے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب کسی بات کا یقین دلانا مقصود ہو۔ اس بنا پر اعتراض ہوتا ہے کہ جو شخص کسی بات کا منکر ہو اس کے سامنے قسم کھانا کچھ مفید نہیں۔ اس کو تو دلیل و برہان سے قائل کیا جا سکتا ہے نہ کہ قسم سے۔

علامہ ابن قیم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن مجید میں جتنی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ یا تو خود اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی قسمیں ہیں یا اگر مخلوقات کی ہیں تو اس حیثیت سے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کی نشانیاں ہیں۔ اس سے پہلا شبہ دور کرنا مقصود ہے۔ دوسرے شبہ کو وہ اس طرح دور کرتے ہیں کہ جن چیزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہ خود مقسم علیہ یعنی اللہ کی ذات اور اس کی آیات اور دیگر امور ایمانیہ مثلاً معاد وغیرہ پر دلالت کرتی ہیں۔ امام رازی نے پہلے شبہ کو دور کرنے کے لئے ان چیزوں کا شرف ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے جن کی قسمیں قرآن مجید میں کھائی گئی ہیں۔ اور دوسرے شبہ کو وہ یہ کہکر دور کرتے ہیں کہ قسم درصل مخاطب کو متنبہ کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے تاکہ وہ قسم کا لفظ سن کر متوجہ ہوجائے اور سمجھے کہ اب جو کچھ کہا جانے والا ہے وہ کوئی بڑی بات ہے۔

لیکن علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ امعان فی اقسام القرآن میں ثابت کیا ہے کہ قسم کا مقصود استشہاد ہے۔ شرف اور بزرگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ درصل ان امور کی صداقت پر گواہی دیتی ہیں جو قسم کے بعد بیان کئے گئے ہیں۔ یہ اقسام قرآن کی بہترین تاویل ہے جو کی گئی ہے۔ اور اس تاویل کی رو سے پہلی آیت کے معنی یہ ہونگے کہ تین اور زیتون اور طور سینین اور بلد امین گواہ ہیں۔ اس بات پر جو آگے بیان کی جانے والی ہے۔

تین اور زیتون کے معروف معنی انجیر اور زیتون نامی پھلوں کے ہیں۔ ایک گروہ جس میں عکرمہ مجاہد، حسن، ابراہیم اور کلبی رحمہم اللہ شامل ہیں، اس طرف گیا ہے کہ آیت مذکور میں تین سے مراد وہی انجیر ہے جس کو ہم کھاتے ہیں اور زیتون سے مراد وہی چیز ہے جس کا ہم تیل نکالتے ہیں۔ ابن جریر طبری، امام رازی اور قاضی بیضاوی وغیرہم نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تین سے مراد مسجد دمشق اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ کعب اور قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ایک تیسرا گروہ تین کے متعلق کہتا ہے کہ اس سے مراد مسجد نوح علیہ السلام ہے جو کوہ جودی پر تھی۔ اور زیتون سے مراد بیت المقدس ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول منقول ہے۔ جن لوگوں نے تین اور زیتون سے معنی معروف مراد لیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں پھلوں کو ان کے فوائد کے لحاظ سے قسم کے لئے انتخاب کیا گیا ہے۔ مگر یہ تاویل تکلف سے خالی نہیں ہے۔ اور تکلف کے باوجود طور سینین اور بلد امین سے معنوی ربط قائم نہیں ہوتا۔ البتہ اگر تین سے مراد منابت تین اور زیتون سے مراد منابت زیتون لئے جائیں تو ایک طرح سے ربط قائم ہوجاتا ہے لیکن طور سینین اور بلد امین کی جس خصوصیت کا لحاظ کرکے ان کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس کی رعایت اگر ملحوظ رکھی جائے تو زیادہ بہتر تاویل یہی نظر آتی ہے کہ تین سے مراد

جودی اور زیتون سے مراد بیت المقدس لئے جائیں۔ کیونکہ ان دونوں کو دو بڑے جلیل القدر پیغمبروں (نوح اور عیسیٰ علیہما السلام) کے ساتھ نسبت ہے اور انہی دونوں کا ذکر تورات میں "سعیر" اور "قدس" کے نام سے کیا گیا ہے (۲:۳۳)۔

طور سینین سے مراد بعض لوگوں نے محض ایسا پہاڑ لیا ہے جس پر درخت ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ طور پہاڑ کو کہتے ہیں اور سینین حبشی زبان میں خوش منظر کے معنی میں آتا ہے۔ عکرمہ، مجاہد اور کلبی نے یہی معنی اختیار کئے ہیں لیکن ابن عباس، ابن زید، کعب، قتادہ اور حسن کہتے ہیں کہ اس سے موسیٰ بن عمران علیہ السلام والا پہاڑ مراد ہے۔ یہی تاویل زیادہ صحیح ہے اور توراۃ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پروردگار سینا سے آیا (۲:۳۳)

بلد امین سے مراد بالاتفاق مکہ معظمہ ہے جس کے متعلق حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، اور جس کے متعلق خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا۔ اور جس کے متعلق توراۃ میں آیا ہے کہ خدا فاران سے روشن ہوا (۲:۳۳)۔

پس آیۃ مذکورہ کا ترجمہ یہ ہوا کہ جودی جس پر نوحؑ نے خدا کو یاد کیا، اور بیت المقدس جہاں عیسیٰ نے اپنے رب کی تقدیس کی اور طور جہاں موسیٰ سے خدا نے کلام کیا اور بلد امین جہاں ابراہیم و اسمٰعیل اور محمد علیہم السلام نے شمع حق جلائی، اس بات پر گواہ ہیں۔

وہ بات کیا ہے جس پر یہ چار عظیم الشان تاریخی مقامات گواہی دے رہے ہیں؟ وہ یہ ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت، بہترین صورت نہایت معتدل ترکیب کا بنایا اور اس کی خلقت کو ایسا استوار کیا کہ کوئی اور مخلوق اس معاملہ میں اس کے برابر نہ ہوئی۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۔ پھر ہم نے اس بہترین خلقت کے باوجود اس کو مخلوقات کے نیچے سے نیچے درجہ میں پھینک دیا۔ کیوں؟ اس کا جواب بعد کے فقرہ سے مل جاتا ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔ مگر اس ذلیل ترین درجہ میں گرنے سے وہ لوگ بچ گئے جنہوں نے ایمان کے ساتھ عمل صالح کئے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ مخلوقات کے سب سے نیچے درجہ میں پھینکے گئے ان کا

یہ انجام اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے رب کو نہ پہچانا، اور ایمان و عمل صالح سے اعراض کیا۔ دوسری مخلوقات تو انسان سے اسی لئے فروتر نہیں کہ ان کو وہ قوت ہی نہ دی گئی تھی جس سے وہ اپنے رب کو پہچانتیں اور علی وجہ البصیرت اس کی عبادت کرتیں۔ وہ اللہ جل و عز کی تقدیس و تسبیح محض اس بنا پر کرتی تھیں کہ ان کی جبلت ایسی ہی بنائی گئی تھی۔ مگر جب انسان نے معرفت حق کی قابلیت رکھنے کے باوجود اس کا غلط استعمال کیا اور تمام مخلوقات سے بہتر ہونے کے باوجود خدائے بزرگ و برتر کو چھوڑ کر اپنے سے فروتر مخلوقات کو معبود بنایا، پتھروں کے سامنے جھکا، درختوں کی تعظیم کی، جانوروں کو پوجا، دریاؤں کی تقدیس کی، تاروں کا پرستار بنا، روحانی اور خیالی ہستیوں کی عبادت میں مشغول ہو گیا، اور ہر اس قوت کے سامنے سرنیاز خم کرنے لگا جو اس کی خدمت کیلئے مسخر کی گئی تھی، تو وہ ان سب چیزوں سے زیادہ ذلیل کر دیا گیا جن پر اسے احسن تقویم میں ہونے کے سبب سے فوقیت و برتری حاصل تھی۔ یہی کوہ جودی ہے جس نے اس کو غرق ہوتے اور اس کی مایۂ ناز تہذیب کو اس کے سرمایۂ فخر آلات و ادوات سمیت تباہ ہوتے دیکھا ہے۔ یہی بیت المقدس ہے جس نے اس کو بابل و ایران اور روم و یونان کی فوجوں سے پامال ہوتے، اور ہمیشہ کے لئے ذلت و مسکنت میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے۔ یہی طور سینین ہے جس نے اس کی ایک سرکش قوم کو غرقاب ہوتے دیکھا ہے۔ یہی بلد امین ہے جس کے گرد وہ صدیوں تک جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ بخلاف اس کے یہی انسان ہے کہ جب وہ ایمان کے نور سے بہرہ ور ہوا اور نیکی کے راستوں پر چلا، تو اس کو وہ نعمتیں نصیب ہوئیں جن پر نوح کا جودی اور موسیٰ کا طور، اور عیسیٰ کا بیت المقدس اور ابراہیم و آل ابراہیم کا بلد امین گواہی دے رہا ہے۔ اس کو برکت اور سلامتی کا مژدہ سنایا گیا، اس کو خدا سے ہمکلامی کا شرف بخشا گیا، اسے تمام جہاں کی امامت سے سرفراز کیا گیا، اس کو وہ معراج نصیب ہوی جو کسی کے حصہ میں نہ آئی تھی، اسے وہ اجر دیا گیا جو بے حساب اور غیر منقطع ہے۔ دنیا میں بھی اس کا بول بالا ہوا، اس کو عزت نصیب ہوی، اس کا نام چمکا، اسی کے دین کا سکہ چلا، اسی کی خاک پا کو کروروں انسانوں نے عقیدت کے ساتھ سرمۂ چشم بنایا، اور آخرت میں بھی وہی اپنے رب کے تقرب، اور اپنے مالک کے جمال کی دید سے بہرہ مند، اور غیر فانی نعمتوں

اور لذتوں سے فیض یاب ہوگا۔

مگر یہ کس چیز کا صلہ ہے؟ صرف ایمان کا نہیں۔ صرف عمل صالح کا نہیں۔ ایمان اور عمل صالح دونوں کا۔ اسفل سافلین میں گرنے سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ کئے گئے ہیں۔ جو ایمان بھی لائے اور جنہوں نے عمل صالح بھی کئے ایمان بلا عمل ایک روح ہے بے قالب۔ اور عمل بلا ایمان ایک قالب ہے بے روح جس طرح زندگی کے آثار اور احکام روح اور قالب دونوں کے مجموعہ پر مترتب ہوتے ہیں۔ نہ کہ کسی ایک پر، اسی طرح اجر غیر ممنون بھی ایمان اور عمل صالح دونوں کے مجموعہ پر ہی مترتب ہو سکتا ہے نہ کہ کسی ایک پر۔

پھر فرمایا فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۔ یعنی اے انسان کفر و نافرمانی کے یہ نتائج، اور ایمان و عمل صالح کے یہ ثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اب کیا چیز ہے جو تجھکو دین کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ کیا چیز ہے جس نے تجھے اللہ کی اطاعت سے منہ موڑنے پر اکسایا ہے؟ کس چیز سے دھوکہ کھا کر تو سمجھ رہا ہے کہ تیرے کردار کا کبھی حساب نہ لیا جائے گا۔ اور تجھے اپنے دل اور ہاتھوں کی کمائی کا انجام نہ دیکھنا پڑے گا؟ کیا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی تجھے معلوم نہ ہوا کہ خدا سب حاکموں کا حاکم ہے؟

پاپولر

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے (ہوم ڈیپارٹمنٹ) تمثیلہ

ہر زمانہ میں ہر ایک سوسائٹی میں عام طور پر کچھ الفاظ ایسے مروج و متداول ہوتے ہیں جن کا اطلاق بالعموم اس سوسائٹی کے اعلیٰ ترین اخلاق و محاسن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ان کا انتساب کسی فرد واحد کے مکارم اخلاق کی معراج کمال کا کفیل یعنی وہ الفاظ ایسے مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) ہوتے ہیں کہ ان سے اجتماعی و انفرادی نبض اخلاق کا صحیح صحیح درجہ معلوم ہو جاتا ہے بھلے دنوں میں "اسلامی سوسائٹی میں امین. صدیق. مجاہد. مومن متقی. متشرع. پرہیزگار. رشید. دیانتدار اور ایسے ہی بہت سے الفاظ مروج تھے کہ ادھر متکلم کی زبان سے ادا ہوئے اور ادھر مخاطب کے ذہن میں ان کے منسوب الیہ کی سچی سچی تصویر مرتسم ہو گئی. مگر آج ہماری اینگلو مسلم سوسائٹی[ل] میں یہ الفاظ تو قدامت پسندی. دقیانوسیت. ملائیت پر محمول کئے جاتے ہیں. البتہ انکی جگہ ایک جامع لفظ مستعار لیا گیا ہے جس کا انتساب ہزار عزت و افتخار کا موجب اور جملہ اخلاق جمیلہ کا ماحصل ہوتا ہے یعنی جس کسی کی انتہائی تعریف مقصود ہو اس کے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ وہ بہت پاپولر ہے. یہ وہ اعزاز ہے جس کا حصول آج عین مقصد حیات قرار پا رہا ہے. اور جس کے لئے ہر قربانی "جہاد فی سبیل اللہ" کا درجہ رکھتی ہے یوں تو اس کے معنی محض "ہر دلعزیز" ہیں لیکن روشن خیال طبقہ کی اس ہر دلعزیزی کے عناصر ترکیبی اس ہر دلعزیزی سے کہیں مختلف ہیں جو کبھی قدامت پسندوں کے "دور جہالت" میں رائج تھے۔

مثلاً کسی صاحب سے آپ کو اس قدر دلی نفرت ہو کہ آپ اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں۔ کہیں تنہائی میں اس کا خیال آجاتا ہے تو اس کی تخریب و تذلیل کے لئے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے اس کے حادثات

ل اس سے مراد وہ تہذیب جدید ہے جو اسلامی جسد اور مغربی روح کے امتزاج و ائتلاف سے پیدا کی جا رہی ہے۔ منہ

خصائل۔ رنگ ڈھنگ، انداز و اطوار غرض اس کی ہر ادا آپ کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہے۔ وہی شخص راہ چلتے ہوئے اتفاقیہ سامنے آجاتا ہے خوشی سے آپ کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ دور سے ہی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھ جاتا ہے۔ "ہیلو مسٹر" کی غلغلہ انداز آواز فضا میں مسرّت خیز لہریں پیدا کر دیتی ہے۔ ہاتھ اس کشش و جاذبیت سے ملایا جاتا ہے کہ "سوزِ محبت" گھٹنوں تک مغزِ استخواں میں حرارت پیدا کئے رکھتا ہے۔ بڑے تپاک کی باتیں۔ بڑی محبت کی گفتگو۔ کہیں نہ ملنے کے گلہ ہائے دراز کہیں تغافل بیجا کی شکایت ہائے رنگیں کبھی اظہار مسرت کہ امتحان میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی کبھی ایمائے خوف و اندیشہ کہ محنتِ شاقہ سے صحت پر برا اثر پڑا ہے جو صحت کے لئے دوائیں آئندہ ترقیوں کے لئے دعائیں تبریک و تہنیت کا خط نہ لکھ سکنے کی معذرت۔ محفل احباب میں شرکت کی دعوت غرض کہ غالب مرحوم نے جہاں تمام دعائیں صرف دربان کر دی تھیں آپ نے بھی تمام ادائیں صرف مہربان کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور قلت وقت کے عذر۔ اور آئندہ سلسلہ ملاقات جاری رکھنے کے وعدہ و وعید اور اصرار و تکرار پر رخصت ہوئے۔ اس نے منہ ادھر موڑا اور ادھر یاران نکتہ داں میں ایک قہقہہ بلند ہوا کہ یار غضب بنایا۔ کہنے لگے کہ میاں پاپولر ہونے کی سکیم اسی طرح کامیاب ہوا کرتی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ سمجھ لیجئے کہ یہ صاحب ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کے رہیں گے۔

یا مثلاً آپ کہیں باہر جانے کی تیاری میں ہیں کہ ادھر سے نوکر ایک ملاقاتی کا کارڈ ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کارڈ دیکھ کر سب سے پہلے آپ کا ہاتھ ماتھے پر جاتا ہے اور سب سے پہلا سوال نوکر سے یہ ہوتا ہے کہ "تم نے کیا جواب دیا ہے۔ یہ تو نہیں کہ دیا کہ صاحب گھر میں ہی ہیں"۔ اگر ملازم کہیں نیا نیا ہی آیا ہے یا ملنے والے صاحب "نئی گھر کے بھیدی" واقع ہوئے ہیں تو یہ اطلاع ان تک پہنچ چکی ہوتی ہے کہ صاحب گھر میں ہی ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں نوکر پر جو قیامت ٹوٹنے والی ہے اس کا وقت تو ذرا ٹھیر کر آئیگا۔ سب سے پہلے ملاقات کے کمرے میں تشریف لائے آدھا جلا ہوا سگار پھر سے جلایا۔ (تاکہ ظاہر ہو کہ ایک عرصے سے یہیں بیٹھے ہیں) حکیم آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی کتاب سامنے رکھ لی (جسے تمام دنیا میں ابتک معدودے چند اشخاص ہی سمجھ سکے ہیں)۔ اور جذب و انہماک کی

انتہائی گہرائیوں میں آواز دی کہ ہاں بلا لاؤ۔

"اُٹھا آپ کدھر سے نکل آئے۔ ارے میاں اب تم ہم لوگوں سے ملتے ہو بھلا۔ سپرنٹنڈٹ ہاتھوں میں افسر خوش اور آپ چاہئے کیا" (معراج زندگی ملاحظہ ہو)۔

"میں مسٹر جوزف[1] (یہ اس محمد یوسف کا تفریحی سے جوان کے والد بزرگوار نے اسلام سے کچھ نسبت پیدا کرنے کے لئے رکھ دیا تھا) لوگوں کے ساتھ تعلقات خواہ کسی نوعیت کے ہوں لیکن جو قلبی واسطہ تمہارے ساتھ ہے وہ کبھی کم ہو سکتا ہے؟ اس تو میں کیا تمہاری مصروفیتوں میں ہارج تو نہیں ہوا۔

شکریہ۔ نہیں بھائی صبح سے بیٹھا بیٹھا اکتا گیا تھا۔ جی میں ہی تھا کہ کوئی ادھر آنکلے تو تنہائی رفع ہو۔ تم تو پیغام رحمت ہو۔ اور ہاں۔ یار۔ چائے پیو گے" (حالانکہ دس ہی منٹ پیشتر انہیں خود چائے مانگنے پر جواب ملا تھا کہ گھر میں دودھ نہیں)۔

"نہیں تکلف کی ضرورت نہیں۔ اپنا گھر ہے۔ میں ابھی ابھی چائے پی کے آرہا ہوں" (خواہ صبح سے مارے مارے پھر رہے ہوں۔ اور پیٹ میں چوہے ناچ رہے ہوں) "اور ہاں ان صاحب سے ملئے میرے عزیز ترین دوست مسٹر ایل۔ کے۔ ناز"

"آپ سے ملکر بے حد خوشی ہوئی" (یعنی جس کے متعلق نہ کچھ جانتے ہیں نہ پوچھتے ہیں۔ اور دونوں نووارد وبال جان ہو رہے ہیں۔ اس سے ملکر بے حد خوشی ہوئی)۔

"بھائی تم سے تصنع برتنے کی کیا ضرورت۔ اس وقت آنے سے غرض یہ ہے کہ مسٹر ناز.... ہوسائٹی کی سکرٹری شپ کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہو رہے ہیں۔ آپ اس کے ممبر ہیں۔ آپ کا ووٹ چاہئے۔ اور میں یکہ تنہا چلا یہ کہے جارہے ہیں (اور بالکل غلط) کہ صاحب میں نے ابھی صبح ہی مسٹر... سے وعدہ کر لیا ہے آپ پہلے تشریف لے آتے تو کیا ہی اچھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ مگر ادھر سے اصرار پر اصرار چلا جارہا ہے۔ اور ان کی بھی مروت کا تقاضا ہے کہ "روکھا جواب" نہ دیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اچھا صاحب میں آپ کو ہی ووٹ دونگا مطمئن رہئے۔

[1] اس تمام مضمون میں روئے سخن کسی خاص شخص کی جانب نہیں بلکہ عام حالت کا بیان مقصود ہے۔ مدیر

جب آپ کہتے ہیں کہ ان حضرت سے بہتر اور کوئی شخص اس عہدہ کے لئے موزوں نہیں تو صبح کا زبردستی وعدہ لیا ہوا اس کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھتا ہے "!

مزید توثیق و تصدیق کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ صاحب بھولنا نہیں۔ اور اپنے حلقہ احباب میں بھی ذرا انکا پروپیگنڈا کرنا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے گردن ہلادی۔

شام کے وقت فریق مخالف کے صاحب آن دھمکے اور راسی اصرار و تکرار۔ عذر و معذرت کے اعادہ کے بعد ان سے بھی وعدہ کرلیا کہ اچھا صاحب ووٹ آپکا۔

تاریخ انتخاب کی صبح سے ہی جو آپ غائب ہوئے ہیں۔ رات تک واپس نہیں آئے۔ دوسرے دن ناکام امیدوار سے معذرت چاہی کہ "اچانک ایک دوست کا ٹیلی گرام آگیا جس کی وجہ سے مجھے باہر جانا پڑگیا میں نے تو کوشش بہت کی لیکن خیر پھر سہی"۔ کامیاب امیدوار سے جوش مسرت میں معذرت کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ کہ ممکن ہے اُسے یاد ہی نہ ہو کہ یہ واپس آئے بھی تھے یا نہیں۔ اور کہدیا کہ استادبیں ووٹ میرے فراہم کردہ تھے"!

سمجھ لیجئے کہ ایک دن یہ صاحب یقیناً تمام سوسائٹی میں پاپولر ہوں گے

یا مثلاً کھانے کی میز پر احباب کا جمگھٹا ہے مختلف مذاہب (باعتبار پیدائش) کے لوگ بیٹھے ہیں۔ مذہب نے نوع انسانی کو جس ذلت و خواری کی پستیوں میں ڈھکیل رکھا ہے اس کے خلاف اظہار نفرت کیا جارہا ہے۔ اب آپکے پاپولر ہونے کی اسکیم کیلئے ضروری ہے کہ آپ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیے۔ چنانچہ "ملا ازم" کے متشابہات سے خدا اور رسول کے محکمات تک سب کے سب اس استہزار و تمسخر کی لپیٹ میں بہے چلے جارہے ہیں قہقہوں پہ قہقہے اڑ رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی تمام "پارینہ خیالات" کی دھجیاں فضا میں اُڑتی جاتی ہیں۔

اس حریت فکر اور "آزادی خیال" کا ہیرو بھی ایک نہ ایک دن پاپولر ہو کے رہیگا۔

یا مثلاً ایک واقعہ کے متعلق گفتگو ہورہی ہے۔ کوئی غلط کہتا ہے کوئی صحیح۔ آپ کو اس کا حتمی طور پر علم ہے

لیکن چونکہ اس یقینی علم کے اظہار سے کسی کبھی کی تخلیط ضروری ہے اس لئے ہر دلعزیزی کی سکیم کا تقاضا ہے کہ حقیقت پوشی سے کام لیں جب آپ سے پوچھا بھی جائے تو صاف کہدیں کہ "نا بھئی مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔

یہی نہیں آپ کے سامنے ایک حقدار کا حق دوسرا شخص غصب کئے جا رہا ہے یعنی شہادت آپ کی ہی ہے آپ سے پوچھا جاتا ہے پاپولر ہونے کی اسکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ کہدیں کہ نہیں صاحب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ میں اخبار بینی میں ایسا محو تھا کہ کچھ سنا ہی نہیں "۔

یا یہ کہ کسی کی غیبت میں اس کی ذات کے خلاف بدترین اتہام لگائے جائیں لیکن جب اس کے سامنے ذکر آئے تو صاف صاف مکر جائیں۔ اس سے آپ تو معتبر کے معتبر رہیں گے اور آپ کے بیان کے شاہد خود بخود دروغ باف اور فتنہ پرداز قرار پا جائیں گے۔

یا مثلاً ایک شخص کے متعلق آپ کو خوب علم ہے کہ بیحد متنفی برا بد فطرت۔ دروغ گو حاسد اور خود پسند ہے۔ خوشامد پسند وں کے طفیل پبلک کی کوئی امانت اس کے سپرد کئے جانے کی تجویز ہے۔ جس کا وہ ہرگز ہرگز اہل نہیں۔ وہ از راہ کسر نفسی (جسے فی الحقیقت کبر نفسی کہنا چاہئے) کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب میں تو اس کا اہل نہیں ہوں۔ پاپولر ہونے کی سکیم کے لئے ضروری ہے کہ آپ فوراً پکار اٹھیں۔ کہ "واہ صاحب اس قدر کسر نفسی۔ خدا کی قسم۔ اس قحط الرجال میں آپکا وجود گرامی ہمارے لئے از بس مغتنم ہے۔ آپ کو کیا علم کہ آپ کس قدر مبارک ہستی ہیں بھائی! اپنے لئے نہیں تو محض خدا کا کام سمجھ کر اسے سنبھال لئے۔ آپ سے زیادہ اس کا کوئی اور اہل نہیں"۔

یا کوئی صاحب گپ ہانک رہے ہیں۔ ہر دلعزیز بننے کی اسکیم کا تقاضا ہے کہ اُسے ٹوکئے نہیں لوگوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ تنہائی میں بھی اسے اس کی کذب بیانی یا کسی ایسے ہی اور عیب پر متنبہ نہ کیجئے کیونکہ اس سے وہ برا مانے گا۔ اور آپ پاپولر نہیں رہ سکیں گے۔

غرض کہ یہ چند اصول ہیں جن پر کاربند ہونے سے پاپولر ہونے کی سکیم کا کامیاب ہونا یقینی ہے ان کے علاوہ بہت سے فروع بھی ہیں جن کی تفصیل طول طویل ہو گی منجملہ ان کے۔ اپنی تنخواہ کو اصل سے

ہمیشہ تین گنا بتانا۔ اپنے آباو اجداد کو کسی نہ کسی نواب صاحب کے خاندان سے منسوب کرنا یہ بھی ضروری ہے کہ بیوی کا (اگر وہ پردہ میں ہے تو) خواہ پاجامہ پھٹ رہا ہو مگر صاحب کی پتلون کی سلوٹ نہ خراب ہو جائے۔ بچے کے لکھنے کی تختی نہ آئے مگر ٹینس کا ریکٹ ضرور والد ماجد کی بغل میں ہونا چاہئے کہ اس سے کسی بڑے آدمی کے ٹینس کورٹ تک رسائی ہو سکتی ہے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں خواہ آٹا ادھار لے کر کھانا پڑے لیکن سینما جانا کبھی ناغہ نہ ہو۔ بیوی بچے خواہ گھر کے اندر باسی روٹیوں پر گذران کر رہے ہوں لیکن آپ کے ٹفن میں جو لوگوں کے سامنے جائے امرغ مسلم نہیں تو کم از کم مرغ پلاؤ تو ضرور ہو۔ علاوہ بریں مہینے میں ایک آدھ دعوت بھی ضرور دیں اور کھانے والے یہ کہکر کھا جائیں کہ خوب الو بنایا (اور اس کا آپ کو خوب علم ہو۔ کیونکہ جب آپ کسی کے ہاں کھانے پر گئے تھے تو یہی فقرہ اس میزبان کی شان میں غائبانہ ارشاد ہوا تھا)

مختصراً یہ کہ اصول ہوں یا فروع نکتہ پیش نظر رہے کہ جو کچھ آپ ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائیں اور جو ظاہر ہوں وہ حقیقت نہ ہو۔ جو محسوس کریں وہ کہیں نہیں۔ اور جو کہیں وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔ قلب اور زبان میں ہم آہنگی کبھی نہ ہو۔ اور اس روش کا نام پالٹیکس یا مصلحت رکھ لیں بس پاپولر ہونے کی اسکیم کا کامیاب ہونا یقینی۔ اور یہ آخری ڈگری ہے جو آج اخلاقی یونیورسٹی سے آپ کو مل سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ محض نام بدل دینے سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے تو آئیے دیکھیں کہ قرآن کے دفتر سے اس اعزاز عظمےٰ کو کیا سند ملتی ہے قرآن کریم نے قول و فعل ظاہر و باطن قلب و زبان کی یکسانیت و ہم آہنگی کو ایک مسلم کا معیار خصوصی قرار دیا ہے۔ اور قول و فعل میں مغایرت اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ — اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱:۱) — خدا کے نزدیک یہ بہت ناپسندیدہ ہے کہ تمہارا قول و فعل یکساں نہ ہو

اور منافقین کے متعلق فرمایا کہ۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ (۳ : ۱۶۷) وہ زبان سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی اور اللہ خوب جانتا ہے جس چیز کو وہ دل میں چھپاتے ہیں

گویا اسلام اور حق وصدق مرادف الفاظ ہیں۔ استیعاب مقصود نہیں ورنہ تمام قرآن ان اشال و نظائر سے بھرا پڑا ہے جن میں اس ایمان اور اقرار کی قطعاً کوئی قیمت نہیں رکھی گئی جو حلق سے نیچے اتر کر قلب کے عمیق گوشوں میں جاگزین نہ ہو۔

اعلاء کلمۃ الحق کی اہمیت کے اظہار اور کتمانِ حقیقت کے خلاف کس قدر بین الفاظ میں ارشاد ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ...... فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ؀ (۴ : ۲۰)۔ اے ایمان لانے والو تم انصاف پر قائم رہو اور خدا کی طرف سے (ہمیشہ) حق کے شاہد رہو خواہ یہ گواہی خود تمہارے اپنے نفس کے خلاف۔ یا والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شخص (جس کے خلاف حق کی شہادت دینی پڑے) خواہ امیر ہو خواہ غریب۔ اللہ کو ان کے ساتھ یکساں تعلق ہے۔ تو تم خواہش نفس کی اتباع نہ کرو کہ (کہیں تم) حق و انصاف سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔

ان تین احکام کی موجودگی میں قرآن کو قرآن جاننے والے کے لئے کہاں یہ گنجائش رہتی ہے کہ ایک واقعہ اس کے سامنے پیش ہو۔ اور وہ اس کے متعلق غلط بیانی کرے۔ یا حق گوئی سے اعراض کرے اور خاموش رہے۔ وہ ایسے وقت میں اللہ کی بے نیام تلوار ہے جو ذاتی خواہشات اور رجحانات دنیوی کو بالائے طاق رکھکر حق وصداقت کے لئے چل نکلتی ہے خواہ اس کی زد خود اس کی اپنی گردن پر ہو۔ یا اپنے والدین یا عزیز و اقارب کی گردن پر امیر کی امارت اور غریب کی غربت اس کی حق گوئی کے

راستہ میں مانع نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ وہ مخالفین میں سے کسی ایک پارٹی کی طرف سے بطور گواہ شہادت نہیں دے رہا ہے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ یعنی وہ اللہ کی طرف سے گواہ بنا ہے۔ اس لئے کسی پارٹی کا خیال اسے جادۂ حق و صداقت سے کسطرح منحرف کرسکتا ہے۔ واضح رہے کہ شہادت سے محض وہی شہادت مقصود نہیں جو عدالت کے کمرہ میں ہی دی جائے۔ کیونکہ اس کی کہیں تخصیص نہیں۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں دنیا کے کسی گوشہ میں جہاں کوئی واقعہ اس کے سامنے پیش ہو، بحیثیت مسلم اس کا فرض ہے کہ حقیقت بیان کردے اور نہ صرف یہ کہ کج بیانی سے ہی باز رہے بلکہ گواہی کے موقع پر خاموش رہنا بھی قرآن کے نزدیک قابل مواخذہ ہے۔ اگر خاموش نشینی گناہ است۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (۲: ۱۶) اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کے پاس خدا کی طرف سے کوئی گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں کہ لوگوں کو برائیوں سے روکتے پھریں اور ان کے اعمال حیات کا جائزہ لے کر احتساب کرتے رہیں۔ سو جو مسلمان ہیں وہ سن رکھیں کہ اوروں سے تو غرض نہیں مسلمان تو یقیناً دنیا بھر کے ٹھیکہ دار ہیں۔ ایک مسلم کی تخلیق کا مقصد اس کا امتیاز خصوصی ہی یہی ہے کہ وہ دنیا بھر میں جہاں کہیں برائی دیکھے اسے روکے اور اس کی جگہ بھلائی کا حکم دے۔ فرمایا کہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳: ۱۲) تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لئے نکالا گیا ہے تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

المعروف اور المنکر پر الف۔ لام استغراق کے لئے آیا ہے کہ بھلائی کی اشاعت اور برائی کی

لہ فریضۂ احتساب اور امر بالمعروف مستقل عنوان ہیں جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز اس موضوع پر مستقل طور پر علٰحدہ لکھا جائے گا سردست ضمنی طور پر چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ منہ

روک تھام میں کسی خاص نوعیت۔ یا زمان و مکان کی تخصیص نہ ہو۔ یعنی ایک مسلم۔ اُس شہنشاہ حقیقی کا سپاہی ہے جو رب العالمین ہے اور اس کا فریضۂ حیات یہ ہے کہ جہاں تمرد و سرکشی دیکھے اس کا احتساب کرے۔ جہاں کسی کو صراط مستقیم اور حق و صداقت سے ہٹتا ہوا پائے، فوراً اسے روک کر راہ راست پر لے آئے۔ اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بدولت یہ خَيْرَ اُمَّةٍ ہے اور یہ فریضہ بھی ہر مسلم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ فرض ہے۔

لیکن آہ۔ آن قدح بشکست و آن ساقی نماند۔

آج معیار تہذیب اور اقتضائے وقت کا زمانہ ہے پرانے وقتوں کی یہ باتیں کون سنتا ہے۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ خواہ مخواہ ساری دنیا کو دشمن بنا لیا جائے دل کو محبت کے لئے مخصوص کر دینا چاہئے۔ ہر اک سے پیار۔ ہر اک کی عزت۔ انکسار۔ درگذر عفو چشم پوشی تسامح پاس و لحاظ۔ مروت تحسین۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو شرف انسانیت ہیں اور یہی اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیم بڑی خوش آیند اور بیحد مرغوب نظر آتی ہے۔ اور ان الفاظ میں وہ محبوبیت و جاذبیت ہے کہ ایک دفعہ تو انسان ضرور رک جاتا ہے کہ بات تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو سوائے لفظی طلسم کے اس وعظ کے اندر اور کچھ حقیقت نہیں ملتی۔ سب سے پہلے تو معیار اخلاق کے ایسے مدعی سے خود اس کی زندگی کا تجربہ پوچھنا چاہئے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے واقعی ہر موقع پر اس پر عمل بھی ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ان مواعظ حسنہ کا خود تجزیہ کیجئے تو نظر آئے گا کہ ان صفات میں سے ہر ایک صفت ایک وقت میں خود ایک عیب بن جاتی ہے، اور جو کچھ اس کی ضد ہوتا ہے وہ اس کی جگہ صواب ہو جاتا ہے مثلاً عفو و درگذر بڑی اچھی چیز ہے لیکن کن لوگوں سے؟ محض ان سے جو اپنے کئے پر پشیمان اور اپنی غلطیوں پر نادم ہوں لیکن وہی عفو و درگذر عادی مجرم

سے کرتے جائیے۔ دیکھئے دنیا کے نظام کا کیا حشر ہوتا ہے۔ مظلوم سے محبت کے معنی یہی ہیں کہ ظالم سے نفرت کی جائے نیکی کو اگر پسند کروگے تو اس کی خاطر بدی کو برا کہنا ہی پڑے گا۔ بدکردار سے مروت برتنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نیکوکار انسانوں پر دنیا تنگ کرتے جارہے ہیں۔ غضب و ظلم کی تحسین کے یہ معنی ہیں کہ آپ دنیا سے عدل و انصاف کو برباد کرتے چلے جارہے ہیں۔ عاجزی و شرافت بڑی خوبی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ غیرت و خودداری ہاتھ سے نہ جائے خاکساری اور انکسار بڑی نیکی ہے بشرطیکہ[1] اس سے شریر و نفسی شیاطین کے حوصلے نہ بڑھتے جائیں۔ کسی بے کس کو پناہ دیجئے تو حسن اخلاق لیکن کسی مفرور مجرم کو پناہ دیجئے تو آپ بھی برابر کے مجرم۔ کسی معصوم و بے گناہ کے ایک چھری مار دیجئے تو دونوں جہانوں میں مستوجب عقوبت لیکن بے گناہوں پر حملہ آور کے سینے میں سنگین گھونپ دیجئے تو بقائے دوام کا سہرا آپ کے سر۔ قتل و خونریزی دنیا کے عظیم ترین گناہوں میں سے ہے لیکن جب کوئی مجسٹریٹ حقیقی قاتل کے خلاف فتویٰ موت صادر کرتا ہے تو منصف و عادل کا لقب پاتا ہے۔ غرض اس اصول کو جہاں تک پھیلاتے جائیے نظر آتا جائے گا۔ کہ ایک محبت کے لئے ایک بغض۔ ایک عفو کے لئے ایک انتقام۔ ایک کی مدد کے لئے دوسرے کی دشمنی۔ ایک تعمیر کے لئے ایک تخریب، لازمی اور ضروری ہے۔ جہاں محض انتقام و سخت گیری کوئی اخلاق نہیں وہاں محض عفو و درگذر بھی کوئی خوبی نہیں۔ بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ان دونوں کی حدبندی اور ان کا جائز استعمال ہی عین اخلاق ہے۔ اور یہی وہ حدبندی ہے جسے اسلام نے صراط مستقیم۔ جادۂ اعتدال اور دین فطرت قرار دیا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے لئے فرمایا ہے کہ

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ (۲ : ۱۷)

اور اسی طرح ہمنے تم کو درمیانی اور وسط کی امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے (اعمال کے) تم گواہ بنو۔ اور تم پر رسول گواہ ہو۔

اب سوچئے کہ آپ کی اس سماحت اور درگذر کا فلسفہ کہاں رہتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی سوسائٹی قائم ہو جائے کہ جس کا ہر فرد یہ اپنا فرض سمجھے کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی وہ اپنے ابنائے جنس کو متنبہ کر دیا کریگا

[1] بشرطیکہ مقصد اس سے اصلاح اور خیر ہو نہ کہ دوسرے کی تحقیر و تذلیل۔ پرویز۔

تو بڑے بڑے جرم جو فی الحقیقت انہی چھوٹی چھوٹی ابتدائی غلطیوں کے آخری نتائج ہوتے ہیں، دنیا سے نیست و نابود ہوجائیں لیکن جس سوسائٹی کے افراد سے احتساب کا احساس اٹھ جائے۔ غلط روی اس سوسائٹی کی گویا، فطرت ثانیہ ہوجاتی ہے اور آہستہ آہستہ عیب کو عیب شمار ہی نہیں کیا جاتا یہی حالت آج ہماری ہوچکی ہے[1]۔

ان مواقع کا تعین مشکل ہے کہ کہاں کہاں عفو و تسامح سے کام لینا چاہئے اور کہاں کہاں انتقام و مواخذہ ضروری ہوجاتا ہے۔ لیکن ایک چیز بالکل واضح ہے جسے بطور اصول کے پیش نظر رکھنا چاہیے یعنے جہاں آپ کی اپنی ذات کا تعلق ہو۔ اور مجرم اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا رہا ہو وہاں آپ کو اختیار ہے کہ نرم روی عفو و درگذر، پاس و لحاظ سے کام لیں لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آپڑے وہاں ہر حال میں حق کی تائید اور باطل کی تردید آپ پر لازم آجائے گی۔ قرآن کریم نے عفو۔ درگذر۔ نرم روی خوش خلقی حلم اور انکسار کو مومنین کی صفات قرار دیا ہے۔ خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۳ : ۱۶)

پس خدا کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم خو ہوگئے ورنہ اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپکے پاس سے سب منتشر ہوجاتے۔ پس ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لئے بخشش مانگئے۔

یہ موقع عام طور پر حسن اخلاق، کشادہ روئی، صبر و تحمل کا تھا لیکن جب کفر و ایمان حق و باطل صدق و کذب کے مقابلہ کا موقع آیا تو حکم ملا کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ان پر سختی کرو۔ اس لئے کہ مفسدین سے نرمی برتنا دنیا کو فساد اور شر کا گھر بنانا ہے ان احکام کی تفسیر، ان نازک مواقع کا تعین، یہ باریک سی حد بندی ہمیں مخبر صادق، قرآن ناطق کے نقوش قدم میں صاف اور بیّن طور پر ملتی ہے۔ اہل مکہ نے ہر ممکن اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جان تک لینے کے منصوبے باندھے کئی مرتبہ حضورؐ سے صحابہؓ نے عرض بھی کیا کہ آپ ان کے لئے بددعا ہی کیجئے لیکن قربان جائیے اس رحمتِ دوعالم کے عفوِ کریمانہ کے

[1] کہا جاتا ہے کہ آج کل جو نکہ کسی میں حق سننے کی تاب نہیں اس لئے حق گوئی کے لئے فضا سازگار نہیں ہے لیکن یہی کمزوری کا ایمان ہے حق گوئی کا تو بہترین وقت وہی ہے جب باطل کا زور ہو رپرویز

کہ اسے ذاتی انتقام کے لئے بددعا تک نہ کی لیکن ایسی بے کسی کے عالم میں اہل مکہ کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں آتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے پر تیار ہیں اور جو کچھ چاہیں ہم مان لینے پر آمادہ ہیں لیکن ہمارے معبودوں کی تکذیب چھوڑ دیجئے اور تو اور خود حضورؐ کے چچا ابو طالب تک نے کہدیا کہ محمدؐ کیا ہرج ہے اگر ایسا کر لو" لیکن یہ حق و باطل کا مقابلہ تھا۔ اس مقام پر ان کا کوئی لالچ حضورؐ کو پھسلا سکا۔ نہ ان کی طرف سے آنے والے مصائب قدم میں لغزش پیدا کر سکے۔ فرمایا۔ اور صاف صاف فرمایا کہ۔

لو جئتمونی بالشمس حتیٰ تضع فی یدی ما سئالتکم غیرھا۔ (بخاری)

اگر تم میں ایسی قوت و طاقت پیدا ہو جائے کہ سورج کو آسمان پر سے اتار کر میری ہتیلی پر رکھدو۔ جب بھی طلب حق کے سوا تم سے اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اور وہی کہوں گا جو کہہ رہا ہوں۔

اور خود قرآن نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کہ

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ٥ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ٥ (۶۸:۱)

ان تکذیب کرنے والوں کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے کام میں کچھ ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ اس کا کہنا کبھی نہ مانئے جو (بڑھ بڑھ کر قسمیں کھا رہا ہے اور بے وقعت ہے۔

ظاہر یہ ایسا وقت تھا کہ بہ تقاضائے مصلحت اُن سے مداہنت برتی جاتی لیکن حضورؐ نے ایسا نہیں کیا اور اس طرز عمل پر حضورؐ کو قرآن کریم نے فرمایا۔ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (قلم) بیشک آپ خلق حسن کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔ حق و صداقت کے راستے میں روڑے اٹکانے والوں کے خلاف جان و مال سے جہاد کیا لیکن جب ان کفار پر آخری فتح حاصل کی۔ اور فاتح و منصور اس شہر میں داخل ہوئے جسے انہی دشمنوں کی شقاوت قلبی نے چھڑا دیا تھا۔ تو وہ تمام دشمن پا بزنجیر سامنے کھڑے تھے۔ وقت تھا کہ عمر بھر کے مصائب کا آج بدلہ لیا جاتا لیکن یہ بدلہ ذاتی ہو جاتا فرمایا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ آج کے دن تم سے

کوئی مواخذہ نہیں۔ رحمت دو عالم کا یہی وہ خلق تھا جس کی وجہ سے تمام مکے تمام پاؤں میں آگرے۔ غرض جہاں اپنی ذات کا معاملہ تھا اس عفو کرم سے کام لیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی لیکن جہاں حق و باطل کا مقابلہ آیا، ذرا نرمی نہ برتی۔

اسی اخلاقی جرأت کے مظاہرے ہمیں قرن اول کے مسلمانوں میں ملتے ہیں جنہوں نے شمع نبوت سے اکتساب ضیا کیا تھا۔ حضرت عمرؓ (کہ جن کے سایے سے شیطان بھاگتا تھا) بھرے مجمع میں لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ اگر میں جادۂ حق و صداقت سے انحراف کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔" ایک بدو اٹھ کر کہتا ہے کہ "خدا کی قسم اس تلوار سے تمہارا سر اڑا دوں"۔ وہ پرستارِ صداقت باغ باغ ہو جاتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ قوم میں اتنی جرأت ایمان موجود ہے۔ یہی نہیں۔ بھرے مجمع میں حضرت عمرؓ کو (جو امیر المومنین تھے) ٹوک دیا جاتا ہے کہ ہمیں بتاؤ یہ کرتا کہاں سے بنوایا؟ اور جب تک اطمینان بخش جواب نہیں ملتا آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ اللہ اللہ کس قدر جرأت تھی ان کہنے والوں میں اور کس قدر بلند حوصلگی اور وسعت ظرف تھی ان سننے والوں میں۔

اگرچہ جب خلافت بادشاہی میں بدلی تو درباری زندگی اور عجمی اثرات نے خوشامد پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا لیکن پھر بھی ایمان کی یہ چنگاری اس میں اکثر اوقات شعلہ فشاں نظر آتی ہے۔ ہارون الرشید کے دربار میں ایک شاعر قصیدہ مدحیہ پڑھتا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "اے خلیفہ اگر عمرؓ و علیؓ کے زمانہ میں آپ ہوتے تو خلافت پر کوئی جھگڑا ہی نہ پڑتا"۔ یعنی بلا اختلاف لوگ آپ کو خلیفہ منتخب کر لیتے۔ وہیں اہل دربار میں سے ایک مرد مومن اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیوں غلط کہتے ہو۔ خلیفہ کے جد امجد حضرت عباس اس وقت موجود تھے پھر جھگڑا کیوں نہ چک گیا"۔ کچھ اندازہ فرمایا آپ نے اس جرأت ایمان کا۔ شخصی حکومت۔ بھرا دربار لیکن حق و باطل کے مقابلہ میں کسی ڈرانے والے کا ڈر اسے باز نہ رکھ سکا۔ اور اعلائے کلمۃ الحق میں وہ رعب تھا کہ خلیفہ بھی سنکر مسکرا دیا۔ اور اسے کہنا پڑا کہ ٹھیک کہتے ہو۔

مامون الرشید کے عہد میں مسئلہ خلق قرآن نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی کس سے پوشیدہ ہے۔

ایک صاحب ایمان (عبدالعزیز بن یحییٰ) اس جسارت و صداقت کو قلب میں لیکر مکہ سے روانہ ہوتے ہیں اور جامع بغداد میں جاکر علی الاعلان کہتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ ہرگز ہرگز مخلوق نہیں ہوسکتا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس کہنے کا انجام کیا ہوگا۔

خوف طوالت مزید مثالیں پیش کرنے سے روک رہا ہے تاریخ امراء اسلام اٹھا کر دیکھئے اس جرأت ایمان کی کتنی ہی مثالیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ یہ کیوں تھا اس لئے تھا کہ ان کے سامنے قرآن عظیم کی تعلیم اور حضور نبی اکرم کا اسوہ حسنہ موجود تھا۔ حضور نے فرمایا۔

مَن رأى منكم منكرا فليغيره بيده ومن لم يستطع فبلسانه ومن لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان۔ (ترمذی شریف)

جو مسلمان کسی برائی کو دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ کے زور سے مٹا دے اگر اس کو استطاعت نہ ہو تو زبان سے برا کہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں ہی برا سمجھے۔ مگر یہ سب کمزور ایمان ہے۔

لگر قید استطاعت سے یہ مراد نہیں کہ آپ اپنی جرأت اخلاقی کو خود ذرا ذرا دکھ کر کے جائیں اور عدم استطاعت کی آڑ میں ہر طرح کی منافقت پر اتر آئیں۔ بلکہ استطاعت کا سوال نہ مقابلہ کی مجبوریوں سے ہوگا۔ قرآن کریم نے صرف ایک موقع ایسا ہے جہاں اتنی اجازت دی ہے کہ صرف جان بچانے کی خاطر اگر زبان سے کفر کا اقرار کر لیا جائے تو مباح ہے۔ یعنی وہاں بھی صرف اجازت ہے۔ حکم نہیں۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۶: ۱۰۶)

جو کوئی ایمان لانے کے بعد کفر کرے بجز اس کے کہ وہ مجبور ہی کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو مگر جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور بھاری عذاب ہے۔

لیکن آپ محض ہردلعزیز ہونے کی خاطر، ممدوح خلائق بننے کے لئے، لوگوں کی ملامت سے بچنے کے کارن

منافقت اختیار کریں تو یاد رہے کہ قرآن کریم میں اس کے لئے بڑی سخت سرزنش آئی ہے۔ فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ..... وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۵ : ۸)۔

اے ایمان والو جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایک ایسی قوم لے آئے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور اللہ سے ان کو محبت ہوگی۔ (ان کے اوصاف یہ ہونگے کہ) وہ ایمان لانے والوں کے آگے منکسر المزاج اور نہ ماننے والوں پر سخت گیر ہونگے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا (مطلقاً) کوئی خوف ان کے دل میں نہ ہوگا۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ عطا فرمائے اللہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔

گویا کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا اور بلاخوف وخطر سچی بات کہدینا یہ خصوصیت ہے اس قوم کی جو اللہ کو محبوب ہے اور اس اخلاقی جرأت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت فرمایا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کے نزدیک سب سے پہلا محاسبہ خود اپنے اعمال ونفس کا ہے اس کا اعلان ہے کہ

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۲ : ۵)

(کیا غضب ہے کہ لوگوں کو تو نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو)

اس کے نزدیک سب سے بڑی سرزنش اور سب سے سخت ملامت خود ضمیر انسانی کی ہے یہی اس کا نامۂ اعمال ہے جو ہر وقت اس کے گلے کا ہار ہوکر لٹکا رہتا ہے اور اسی کا احتساب سب سے زیادہ سخت گیر ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷ : ۲)

اور ہم نے ہر انسان کا نامۂ اعمال اس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے جسے قیامت کے دن نکال کر اس کے سامنے پیش کردینگے اور وہ اسے کھلا ہوا دیکھے گا۔ (پھر کہا جائے گا کہ) اپنا

نامۂ اعمال پڑھ لے آج خود تیرا نفس ہی تیرے لئے کافی محاسب ہے۔

لیکن باین ہمہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ دوسرے شخص کو غلطی پر تنبیہ وہی کرے جو خود کبھی غلطی نہ کرتا ہو۔ گنہ گار کو اس کے گناہ کی تنبیہ وہی کرے جو خود معصوم ہو۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ احتساب اعمال صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تک ہی محدود رہے۔ حالانکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور اصلاحِ نفس دو جداگانہ اور مستقل احکام ہیں۔ خود اپنے نفس کا تزکیہ و اصلاح سب سے مقدم ہے لیکن جس مسلمان کو دوسرا مسلمان نیکی کی طرف بلائے اور برائی سے روکے اُسے محتسب کے نامۂ اعمال کی تفتیش کرنے کے بجائے خود اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ نماز کے وقت اگر آپ سو رہے ہوں اور دوسرا شخص آپ کو آکے جگائے تو کیا آپ اسلئے اٹھنے سے انکار کردیں گے کہ جگانیوالا خود پابند نہیں ہے؟ اسکے لئے تو مسلمان ایک طرف کوئی غیر مسلم بھی آپ کو ہشیار کرے تو اس کا ممنونِ احسان ہونا چاہئے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ قرآن کے نزدیک ایسے شخص کی کوئی عزت و توقیر نہیں جس کے اعمال و اقوال میں مطابقت نہ ہو۔ مسلمانوں کی کسی ممتاز صف میں اسے جگہ نہیں مل سکتی کیونکہ قرآن کے معیار کے مطابق۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ۔ اللہ کے نزدیک وہی زیادہ بزرگ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

لیکن آپ اپنی اصلاح کے لئے انظر ما قال و لا تنظر من قال۔ (یہ دیکھو کہ کیا کہا گیا ہے نہ یہ کہ کہنے والا کون ہے) کو پیش نظر کیوں نہ رکھیں محتسب اپنے اعمال کا خود ذمہ وار ہے اور اسی طرح اسے ٹوکنے والا کوئی اور مل جائیگا آپ کو تو اسکا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُسنے خبردار کر دیا کہ سنبھل کر قدم رکھنا آگے ہلاکت و تباہی کا عمیق و مہیب غار ہے نہ یہ کہ اس کی طرف سے انتقامی جذبہ پہلو میں رکھکر تو ہ میں رہا جائے کہ کب اسے ٹوکنے کا موقع ملتا ہے لیکن آج سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا اور باقی سب دنیا غلطی کرتی ہے۔

میں اصل مقصد سے ضمناً کچھ دور نکل گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف کئے

بغیر حق و باطل کے مقابلہ کے وقت ہماری زبانیں حق کی حمایت کے لئے کھل جانی چاہئیں۔ اس میں اگر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہونے دیجئے یاد رکھو کہ خدا اور شیطان میں سے بیک وقت ایک ہی کو تم راضی کر سکتے ہو۔ لیکن آج تو یہ حالت ہے کہ بقول اکبر مرحوم۔

مغوی کو برا مت کہو ترغیب ہے یہ　　　　میں کس سے کہوں نفس کی تخریب ہے یہ

شیطاں کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن　　　　اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

پس یقین جانئے کہ یہ صرف آج کی تعلیم ہے۔ قرآن سے اس کو کچھ واسطہ نہیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھئے کہ نرم روی، سلامت پسندی، پاس خاطر نہایت عمدہ عادات ہیں لیکن بشرطیکہ ان میں ایمان سلامت رہ جائے یہ نہ ہو کہ۔

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است　　　　با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

اس منافقت سے تو یقیناً وہ کفر اچھا جس میں ظاہر و باطن کی مطابقت ہو۔

وفاداری بشرط استواری مین ایماں ہے۔ (غالب)

قرآن نے صرف دو راستے بتائے ہیں۔ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ حق اور باطل کفر اور اسلام کذب و صدق شرک اور توحید۔ اہرمن اور یزدان۔ ان میں سے جس پر دل ٹھکے اسے اختیار کر لو۔ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ لیکن ان دونوں کے بین بین کوئی تیسری راہ قرآن میں نہیں ملتی۔ اگر تمہارا دل کوئی ایسی راہ پیش کرتا ہے اور دلیل یہ لاتا ہے کہ اس میں سلامت روی اور ہر دلعزیزی ملتی ہے، تو یاد رکھو یہ نفس شریر کا دھوکہ ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۲:۲)

ایسے لوگ اللہ اور (اس کے) مومن (بندوں) کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) وہ خود اپنے نفس کو دھوکہ دیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں

شیطان جو پہلے دن سے ہی ذریت آدم کے پیچھے لگ گیا تھا کبھی تو وہ خوف اور امید کے مہیب اور خوشنما دیوتاؤں کی شکل میں باہر سے حملہ کرتا ہے اور کبھی خود انسان کے حملہ دماغ میں ہر دلعزیزی اور عزت طلبی کے گمراہ کن مفہوم کی فریب کاریوں اور باطل آرائیوں کے ساتھ اندر سے حملہ آور ہوتا ہے پس اس کے تباہ کن حملوں سے بچنے کے لئے قرآن کا یہ فیصلہ ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے کہ۔

لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۳ : ۱)

(حقیقی) عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے لیکن یہ منافق (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں۔

حاملان قرآن

شیخ محمد وارث عمادی

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی (بی یس سی علیگ)

نام تو نفس محمدؐ تھا، مگر حضرت صدیق اکبرؓ سے لیکر حضرت شیخ عمادؒ تک تمام علمی و روحانی نعمائے خاندانی آپ کو وراثت میں ملی تھیں، اس لئے راسخین فی العلم کے حلقہ میں محمد الوارث سے مخاطب ہوئے کہ آپ کی ذات وارث صفات انبیاء و المرسلین تھی۔ ابتلا و فتنان میں آپ اکثر پڑے، ارادت مندوں نے اس سے محفوظ رہنے کی دعا کے لئے جب جب درخواست کی ہمیشہ یہی فرماتے رہے "أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ" (۲۹: ۱) کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اتنا کہہ دینے پر کہ ہم تو ایمان لائے چھوڑ دیے جائیں گے اور آزمائش میں نہ ڈالے جائیں گے ؟

در مسلخ عشق جز نکو را نہ کشند　　لاغر صفتان زشت خو را نہ کشند
گر عاشق صادقی ز کشتن مگریز　　مردار بود ہر آن کہ او را نہ کشند

پائندہ پور سے آپ نے فتن پور میں نقل مقام فرمایا جو نظام آباد سے متصل ایک معروف آبادی ہے جہاں حضرت ابو ایوب انصاری صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے عہد میں غازیان مدینۂ قیصر کے اول جیش میں تھے جن کے لئے "مغفور لہم" کی بشارت تھی۔ آپ کی ضرب شمشیر کا نشان دیوار قسطنطنیہ پر اب تک مرتسم ہے۔ وہیں آپ شہید ہوئے اور اُسی عہد میں قیصر نے آپ کے مشہد مبارک سے متعدد کرامتیں مشاہدہ کرنے کے بعد ایک مسجد تعمیر کرا دی جو اب تک مقام ابی ایوب انصاری

کے نام سے شہرۂ آفاق ہے اور سلاطین آل عثمانؒ کی رسم تاج گذاری (تاجپوشی) وہیں ادا ہوتی تھی۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ایک خاندان مدینہ مبارکہ سے چل کر گجرات میں فروکش ہوا اور یہاں فتن کے نام سے ایک معمورہ بسایا جسے باختلاف لہجہ پتن بھی کہتے ہیں اور اسی کا مُثنّیٰ حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس سرہٗ کا پاک پتن بھی ہے جو اُن دنوں اجودہن مشہور تھا۔ گجرات کی بوہرہ جماعت کے نامور دانشمند نہایۂ ابن اثیر کے مُلخص اور مجمع بحار الانوار کے مولف شیخ محمّد طاہر فتنی اُسی فتن انصار کی یادگار تھے، یہ زمانہ سلاطین گجرات کا تھا جو بزرگان دین واتقیائے مخلصین کے خاص قدرشناس تھے بسقوط سلطنت کے بعد یہ مجمع علمی بھی منتشر ہوگیا اور میرزا عبدالرحیم بیگ کے عہد میں کہ خان خانان دولت اکبر شاہی تھا اس خاندان انصار کو کثرت فِتَنْ نے ترک فَتَن پر مجبور کیا۔ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ میں مراغم کی تلاش کرتے ہوے سرائے میر علی عاشقان قدس سرہٗ تک پہونچا جن کا دست گرفتہ شیر شاہ بادشاہ دہلی تھا۔ حضرت شیخ کی روحانیت نے اِس خاندان کے لئے وہ سرزمین منتخب فرمائی جو اپنے وطن (فتن، گجرات) کے نام پر ان بزرگوں نے یہاں بسائی اور امتداد ایام سے فتن پور موسوم ہے، اس خاندان کے بزرگ قاضی قطب الدین تھے جن کی شریعت پناہی قضائے شرعی کی مسند آرائی کرچکی تھی۔ فتن پور انہیں کی یادگار ہے۔

حضرت شیخ محمد وارث نے اسی فتن پور کو یاد الٰہی کے لئے پسند فرمایا اور اسی خاندان انصار میں نکاح کرکے یہیں رہ پڑے، اس خاندان کا مجد و شرف اب تک زبان زد ہے اور آل عماد کے ساتھ آج تک اس کے تعلقات قائم ہیں۔

حضرت محمد وارث اگرچہ شیخ المہاجرین تھے مگر فتن پور میں سید الانصار کی حیثیت میں مقیم رہے اور اسی مُقعَدِ صدق" میں ملیکِ مقتدر سے جاملے۔ شیخ عبدالرحیم صاحب مرحوم کے خانہ باغ میں ایک مرتفع چبوترہ ہے جسے قاضی قطب الدین کا روضہ کہتے ہیں۔ وہیں آپکا مزار مبارک ہے جس کے پائیں میں اہل خاندان کی قبریں ہیں۔

ارادت مندوں نے ایک مرتبہ درخواست کی کہ کفار فجار نے آل عماد کو خانہ بدر کر دیا آپ ان کے
بد دعا کیجئے فرمایا۔ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ
(۲: ۳۳)۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے کیسی حکیمانہ ترتیب رکھی ہے جس کا پہلا درجہ افراغ صبر دوسرا ثبات
قدم پھر سب کے آخر میں نصرت علی الکافرین ہے ایما یہ ہے کہ پہلے پہلی منزلت کے لئے پھر دوسری کے لئے
پھر آخری نتیجہ کے لئے حسن توفیق کے طلبگار رہو۔ زبان ہی سے نہیں بلکہ فعل سے بھی ارہاب عدو اللہ درجۂ
نصرت سے فروتر ہے مگر وہاں بھی اعداد قوت بقدر استطاعت و رباط خیل کا حکم ہے اس عالم ظاہر میں
بدون اس کے ارہاب و ترہیب میسر ہی نہیں"

فرماتے تھے صبر کے متعدد معنی ہیں مثلاً۔

۱۔ حبس و اکراہ۔ اور یہی اصل معنی ہیں۔ حدیث میں ہے "نَهَى رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم عن صبر ذی الروح۔ یعنی صبر کے معنی بھی یہیں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۔ استادگی اور اسی سے نصب للقتل کے معنی نکلے حدیث میں ہے نَهَى رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم عن قتل شیءٍ من الدواب صبراً"۔ آختگی کا مفہوم بھی یہیں سے نکلا ہے
جس کے لئے عبداللہ بن مسعود کی روایت میں لفظ "صبر" وارد ہے۔

۳۔ خودداری بوقت خذر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (۱۸: ۴)۔

۴۔ بردباری۔ حدیث میں ہے۔ لا احدٌ اصبر علی اذیً یسمعہ من اللہ
عزّوجلّ۔

۵۔ استقامت۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

۶۔ ثبات۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

۷۔ کفالت حسنؓ کی حدیث میں یہی مراد ہے جہاں "صبیر" معنی کفیل آیا ہے۔

۸۔ سرداری و زعامت۔ یقال صبیر القوم زعیمهم المقدم فی امورهم

۹۔ قصاص۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی سخت کلامی سے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو غیظ آگیا اور زدوضرب سے پیش آئے۔ صحابہ نے جب ان کی شکایت کی تو حضرت عثمانؓ نے جواب دیا۔ هٰذه یدی لعمار فلیصطبر یعنی میں حاضر ہوں، عمار آئیں اور مجھ سے بدلہ لے لیں۔

۱۰۔ کمال شدت۔ اصمعی کہتے ہیں۔

اذا لقی الرجل الشدة بکمالها قیل لقیها باصبارها۔

۱۱۔ جمع۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے "دخلتُ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان عند رجلیه قرظاً مصبوراً۔

۱۲۔ تراکم و تکاثف۔ اسی لئے ابر کو صبیر کہتے ہیں جس کا سبب بخارات کا تکاثف ہے

۱۳۔ سختی و غلظت۔ اعشیٰ کے شعر میں اسی لئے پتھر کو "صبارہ" کہا ہے اور اسی بنا پر صبیر پہاڑ کو کہتے ہیں

۱۴۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب کے خطبہ میں سخت سردی کے لئے صبارّہ کا لفظ آیا ہے جس طرح سخت گرمی کے لئے حمّارہ ہے (صبارّة القرّ و حمّارة القیظ)۔

۱۵۔ جرأت و جسارت۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔

دیکھو اللہ تعالیٰ حصول نصرت کے لئے جہاں تم کو صبر کی تاکید کرتا ہے وہاں تم سے متوقع ہے کہ حبس نفس، استادگی، خودداری، بردباری، استقامت، ثبات، کفالت، سرداری، طاقت، انتقام، شدت، جمعیت، سختی، حرارت، جرأت، وغیرہ کی شان اپنے آپ میں پیدا کرو کہ یہی صبر کے معنی ہیں

اسی ذیل میں ایک بات یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی "صبور" کہتے ہیں جس کے معنی

"حلیم" کہے ہیں، فرق یہ ہے کہ "صبور" کہنے کی صورت میں عقوبت سے رستگاری کی اتنی توقع نہیں جتنی "حلیم" کہنے کی صورت میں ہے۔

حلقۂ درس فراخ تھا، وہ تھے اور کلام اللہ کا مفہوم، وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔

سوال ہوا۔ "قضاء" و "امر" و "کن فیکون" کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: "قضا" بہت سے معنی میں مشترک ہے۔

۱۔ خلق ومنہ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ۔

۲۔ علم ومنہ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ۔

۳۔ امر ومنہ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔

۴۔ لزوم ومنہ قضیٰ کل ذی دینٍ فوفّی غریمہٗ
وَعزّۃ فی مطلٍ مُعنّیً غریمھا۔

۵۔ توفیہ ومنہ فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ۔

۶۔ ارادہ ومنہ اذا قضیٰ امراً۔

کلام اللہ میں کلمہ "امر" کا اطلاق چودہ معانی پر ہوا ہے:۔

۱۔ دین ومنہ "حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ"

۲۔ قول ومنہ "فَإِذَا جَاءَ أَمْرُنَا"

۳۔ عذاب ومنہ "لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ"

۴۔ عیسیٰ بن مریم ومنہ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا ای اوجد عیسیٰ علیہ السلام۔

۵۔ قتل ومنہ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ"

۶۔ فتح۔ ومنہ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ" اے امر فتح مکہ

۷۔ جلاء ومنہ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ" ای بامر جلاء

النضیر و بنی قریظہ۔"

۸۔ قیامت ومنہ "اَتیٰ اَمْرُ اللّٰہِ"۔

۹۔ قضار ومنہ "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ"۔

۱۰ وحی۔ ومنہ "یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ"۔

۱۱۔ اعمال خلق ومنہ "اَلَا اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ"۔

۱۲۔ نصرت ومنہ "ھَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ"

۱۳ ذنب ومنہ۔ "فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِھَا"۔

۱۴۔ شان ومنہ "وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ"۔

رہی یہ بات کہ کن فیکون سے کیا مراد ہے تو حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ "وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ" اور اسی لئے قاضی بیضاوی "کن فیکون" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لیس المراد حقیقۃ امر و امتثال بل تمثیل حصول ما تعلقت بہ ارادتہ بلا مھلۃ بطاعۃ المامور المطیع بلا توقف۔

قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ

از

(از جناب مولٰنا عبدالماجد بی اے دریابادی)

اس مرتبہ "اشارات" لکھے جا چکے تھے کہ "سچ" کا خاص نمبر وصول ہوا جس میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے قرآن مجید کے ایک مستند انگریزی ترجمہ اور تفسیر کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے اپنی ان کوششوں کا ذکر فرمایا ہے جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے شروع کی ہیں، اور ان ضروریات کو بھی بیان کر دیا ہے جن کا پورا ہونا اس کام کے لئے ضروری ہے ہم اس مضمون کو ناظرین ترجمان القرآن کی واقفیت کے لئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ نہ صرف انگریزی دان غیر مسلموں کو بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیمیافتہ جماعت کے ایک بڑے گروہ کو بھی اسلام کی صحیح واقفیت بہم پہونچانے کے لئے انگریزی زبان میں ایک صحیح اور مستند ترجمہ و تفسیر قرآن کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ اس وقت ہمارے جدید تعلیمیافتہ گروہ میں اگر کوئی شخص اس خدمت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے تو وہ مولٰنا عبدالماجد دریابادی ہیں۔ اس لئے کہ وہ قریب قریب ان تمام منزلوں سے گذر چکے ہیں جن میں آج کل کے مغربی تعلیمیافتہ حضرات عموماً بھٹکا کرتے ہیں۔ ان کو وہ تمام راستے معلوم ہیں جن سے شک اور الحاد دماغوں میں داخل ہوتا ہے۔ اور خدا کے فضل سے ان کے پاس وہ اسلحہ بھی موجود ہیں جن سے موجودہ دور کے الحاد و تشکیک کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے موزوں شخص کے مل جانے کے بعد یہ سوال تو حل ہو گیا کہ کام کرنے والا کون ہے؟ اب صرف یہ سوال باقی

رہ جاتا ہے کہ کام کرنے کے ذرایع کہاں سے مہیا ہوں؟ اس دوسرے سوال کا حل صرف مسلمانوں کے جذبۂ خدمت دین پر موقوف ہے۔ اگر ضرورت کا صحیح احساس اور خدمت کا سچا جذبہ موجود ہو تو یہ قوم کم از کم اتنی گئی گذری نہیں ہے کہ چند ہزار روپے کی کتابیں بھی فاضل مترجم کو مہیا نہ کر سکے

ایڈیٹر

کلام مجید کا کوئی ترجمہ انگریزی میں کچھ یہ نہیں ہے کہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ایک چھوڑ کئی کئی ترجمے موجود ہیں غیروں کے کئے ہوئے بھی اور اپنوں کے قلم سے بھی ...... بعض اچھے بھی اور محض ستے بھی۔ ان سب میں سے قدیم ترجمہ پادری جارج سیل کا ہے، جو اٹھارویں صدی کا انسان تھا۔ اس بیچارے کی عربی استعداد غالباً کچھ یوں ہی سی تھی۔ اس لئے غلطیاں بکثرت رہ گئیں۔ اور کہیں کہیں جھلک تعصب و عناد کی بھی نظر آجاتی ہے۔ تاہم نقش اول کے لحاظ سے اس کا ترجمہ قابل قدر، اور متن و حواشی دونوں میں اس کی محنت قابل داد ہے اور ترجمہ سے قبل اس کا مبسوط مقدمہ تو مفید ترین معلومات سے لبریز ہے۔ جس سے آج بھی بے نیازی نہیں برتی جا سکتی۔ ترجمہ کی زبان امتداد زمانہ سے بہت پرانی ہوگئی ہے۔ اور بہتیرے الفاظ متروک سے۔

سیل کے بہت عرصے کے بعد انیسویں صدی کے ثلث آخر میں، دوسرا انگریزی ترجمہ پادری جے۔ ایم راڈویل کا شائع ہوا۔ ان حضرت نے ترجمہ بڑے دعوی کے ساتھ کیا، اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے، راڈول کی زبان سیل سے بے شبہہ کہیں زیادہ شگفتہ و رواں ہے لیکن نافہمی کی بنا پر اس کے اغلاط کا شمار بھی سیل سے کم نہیں، اور تعصب و عناد کا تو یہ شخص پتلا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق خبث نفس کا اظہار اپنے مختصر حواشی میں اس دریدہ دھنی کے ساتھ کرتا گیا ہے کہ مسلمان کے لئے ان کا مطالعہ سخت صبر آزما بن گیا ہے۔ ایک جدت آپ نے یہ فرمائی ہے کہ قرآن پاک کی ترتیب بدل دی ہے، اور اپنے خیال و پندار کے مطابق سورتوں کو ان کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔

تیسرا ترجمہ ۱۸۸۰ء میں ایک انگریز ای ایچ پامر کے قلم سے نکلا ہے جو شام وعرب وغیرہ میں ایک مدت تک اہل زبان کے ساتھ رہ چکے تھے اور کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے معلم بھی تھے۔ ایک عربی گرامر کے بھی مصنف ہیں توقع تھی کہ یہ ترجمہ کم از کم فہم زبان قرآنی کے اعتبار سے تو محققانہ ہوگا لیکن خلاف توقع اس ترجمہ میں بھی گو سیل وراڈول سے کمتر پھر بھی خاصی تعداد میں نافہمی کی مثالیں موجود ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایک تو مترجم نے کلام کی اہمیت کے مناسب وقت نہ دیا، چلتا ہوا کام سمجھ کر محض سرسری طور پر کر دیا۔ دوسرے یہ کہ احکم الحاکمین کے کلام کو محض ایک بدوی عرب کا کلام سمجھا، اور ترجمہ بالکل اس انداز سے کیا، کہ گویا کسی بدوی کے خطبات کو وہ انگریزی میں منتقل کر رہا ہے! پھر حواشی بھی اس ترجمہ میں برائے نام ہیں۔ البتہ پہلے ایڈیشن میں مترجم کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو دوسرے اور ارزاں ایڈیشن میں نکال دیا گیا، اور بجائے اس کے پروفیسر نکلسن کے قلم کا ایک دلآزار مختصر مقدمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ تینوں ترجمے ان افراد کے قلم سے تھے، جو قرآن کے کلام آلہی ہونے کے منکرین ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسوں کے ذہن پر کلام مجید کیسے کھل سکتا تھا؟ غیرت خداوندی کیونکر اسے گوارا کر سکتی ہے، کہ انوار قرآنی کو سیاہ سینوں کے اندر جگہ ملے؟ ان تین مکمل ترجموں کے علاوہ ایک ترجمہ بعض اجزائے قرآنی کا لین کا بھی کیا ہوا ہے، جو اس وقت نایاب ہے۔ لین عربی زبان کا مشہور ماہر اور مستند لغوی تھا۔ مدالقاموس اسی کی تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ بڑی تلاش کے بعد بھی، اب تک کہیں نہ مل سکا لیکن لین کی شخصیت سے توقع یہ ہوتی ہے، کہ یہ ترجمہ، کم از کم نحوی ولغوی نافہمیوں سے تو ضرور محفوظ ہوگا۔

مسلمان مترجموں میں تبرکاً سب سے پہلا نام زبان پر ڈاکٹر عبدالحکیم خاں مرحوم پٹیالوی کا آتا ہے۔ ترجمہ جیسا بھی کچھ ہو، بہرحال مترجم کو سب سے پہلی کوشش کا اجر ضرور ملے گا، اور ان کے السابقون الاولون میں شامل ہونے کے فخر کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ ان کے بعد ایک ترجمہ، تین مختصر جلدوں میں، مرزا حیرت دہلوی کے

نام سے ملتا ہے۔ اس میں حواشی برائے نام ہیں اور ترجمہ ابتدائی کوشش کے لحاظ سے غنیمت ہے۔ حافظ غلام سرور (جج ہائیکورٹ پنجاب) کا تازہ ترین ترجمہ محاسن ظاہری کے لحاظ سے قابل داد ہے لیکن حواشی سے بالکل معرّیٰ جس کے باعث بہت سے مقامات اجنبیوں کے لئے ناقابل فہم رہ گئے ہیں۔ اور جہاں تک نفس ترجمہ کا تعلق ہے افسوس ہے کہ اس میں بھی مترجم صاحب ترجمہ کی زبان کو ادیبانہ وشاعرانہ بنانے کی سعی میں، الفاظ قرآنی سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ اور انکا ترجمہ بجائے اس کے کہ ایک سنجیدہ دینی ضرورت کو پورا کرے، گستاخی معاف، کچھ ایک ادبی تکلف کی سی چیز بن کر رہ گیا ہے۔

غالباً سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں، حیدرآباد میں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے، بڑے سازوسامان کے ساتھ ترجمہ کا ارادہ فرمایا۔ نواب صاحب گو خاندانی شیعہ تھے لیکن اپنے ذاتی عقاید کے لحاظ سے نیم سنی ضرور تھے، عربی و انگریزی دونوں کے ادیب تھے، گو علوم دینیہ کے ماہر نہ تھے نصف قرآن سے کچھ زائد کر چکے تھے، کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ربط و ضبط بڑھا۔ مولاناؒ (صاحب نظم القرآن عربی) اس دور میں قرآن فہمی کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔ مولانا مرحوم کے مشورہ سے نواب صاحب نے اپنے ترجمہ کی نظر ثانی شروع کی۔ مسودہ شاید سورۂ طٰہٰ تک پہونچا تھا کہ نواب صاحب کی خرابی صحت نے کام روک دیا۔ اور پھر دونوں صاحبوں کا انتقال ہوگیا۔ اتنے اجزاء کے چند نسخے نواب صاحب نے اپنے خاص احباب سے مشورہ کے لئے طبع کرائے تھے، عام اشاعت کسی ایک جزو کی بھی نہ ہوسکی۔ یہ ترجمہ بڑی احتیاط سے کیا ہوا ہے، اور زبان کے لحاظ سے بھی اس کا معیار بہت بلند ہے۔ کاش اس کی تکمیل ہوگئی ہوتی! نامکمل رہ جانے سے قطع نظر دو بڑی کوتاہیاں اس قابل قدر ترجمہ میں بھی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ نرا ترجمہ ہی ترجمہ ہے، کوئی حاشیہ برائے نام بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی انگریزی وہ ٹھیٹھ انجیلی انگریزی ہے، جو سنہ ۱۶۱۱ء سے بائبل کی زبان چلی آتی ہے۔ اردو میں اگر کوئی اس بیسویں صدی کے وسط میں، میر تقی میر کی زبان میں اشعار کہنا شروع کردے، تو کتنے اس کے سمجھنے والے اور قدر کرنے والے نکلیں گے؟ اہل قادیان نے اپنے غالیانہ رنگ میں، ایک پارہ کا، مدرسۃ الواعظین (شیعہ) لکھنؤ نے بھی ایک پارہ کا

اور الہ آباد کے ایک صاحب نے اپنے "مجتہدانہ" رنگ میں شاید سارے قرآن کا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ ان تراجم پر کسی تفصیلی تبصرہ کی نہ ضرورت نہ گنجائش۔

حقیقۃً قابل ذکر انگریزی ترجمے صرف دو ہیں۔ ان میں سے ایک مولوی محمد علی لاہوری ایم اے (امیر جماعت احمدیہ مرزائیہ) کا ترجمہ وی ہولی قرآن ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۷ء میں، دو قسم کے کاغذوں پر مع متن قرآن، ایک مفصل مقدمہ اور مفصل حواشی کے نفاست کاغذ و طباعت کے اعلیٰ لوازم کے ساتھ نکلا تھا، اور دوسرا (بلا متن) اس سے چھوٹی تقطیع پر محاسن ظاہری کی انھیں خصوصیات کے ساتھ، ابھی سال دو سال ہوئے نکلا ہے۔ یورپ اور خود ہندوستان کا انگریزی نما طبقہ، جس ترجمہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے، اور جو ان کے درمیان سب سے زیادہ پھیلا ہے وہ یہی ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ سے متعلق ایک خالص انگریزی خواں دوست کی رائے ملاحظہ ہو، جو ماشاء اللہ اپنے عقائد میں بالکل اہل سنت کے ہم مسلک ہیں:-

> میں چونکہ ایک انگریزی خواں فضا میں رہتا ہوں، جہاں خواب بھی آئے تو انگریزی میں، اس لئے انگریزی خواں طبقہ کی نبض کچھ پہچانتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ خواہ عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہو یا آزاد خیال، کچھ اس کی افتاد اس قسم کی پڑ چکی ہے کہ وہ اب منقولات کے بجائے معقولات سے زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ محمد علی اپنی تفسیر میں قرآن سے اگرچہ بہت دور جا پڑے ہیں، لیکن وہ زمانہ شناس بہت واقع ہوئے ہیں، انہوں نے ہر چیز کو بالکل زمانہ کے موافق پیش کر دیا ہے، خواہ حقیقت کا اس میں شائبہ بھی نہ ہو، نتیجہ یہ کہ جس جماعت میں یہ قرآن پہونچا، وہ چونکہ قرآن سے قطعاً نابلد تھی، اس لئے اس کے اغلاط و اہمال کی تحقیق تو نہ کر سکی، لیکن چونکہ باتیں جی میں دل لگتی ہوئی، اس لئے سمجھ بیٹھی، کہ اسلام یہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ زہر جو اس جماعت میں

پھیلایا گیا ہے۔ اور اسی زہر کا تریاق اب درکار ہے، جس کی شکل یہی ہو سکتی ہے، کہ صحیح قرآن و اسلام کو اسی شرح و بسط سے پیش کیا جائے جس صراحت سے غلط اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے"۔ (مکتوب مورخہ مارچ ۱۹۴۶ء)۔

تشخیص صحیح ہے۔ مولوی محمد علی صاحب کے ترجمہ کی خوبیوں سے، اس کے اثرات سے، اس کی تبلیغی کامیابیوں سے انکار کرنا آفتاب کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ صد ہا ہزار ہا بیگانوں کو یگانہ بنانے، صد ہا ہزار ہا منکروں کو اسلام سے قریب لانے میں وہ یقیناً معین ہوا ہے۔ خود اپنے متعلق میں یہ اعتراف بمسرت کرتا ہوں کہ آج سے پندرہ سولہ سال پیشتر جب میں الحاد و ارتیاب کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا، اس وقت گنتی کی دو چار کتابیں جو مجھے اسلام سے قریب لانے میں معین ہوئی تھیں، ان میں سے ایک یہی ترجمہ قرآن تھا، مترجم کے ہمنام مولانا محمد علی (مدیر کامریڈ) بھی اس سے بہت متاثر تھے اور اس کی تعریف ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن ان سارے اعترافات کے ساتھ یہ بھی مجبوراً کہنا پڑتا ہے، کہ

۱۔ ترجمہ و تفسیر میں اسلام کی حقیقی تصویر پیش نہیں ہو سکی ہے۔ مترجم بدنام اپنی قادیانیت کے لئے ہیں، لیکن ترجمہ و تفسیر میں 'قادیانیت' سے کہیں زائد غالب 'نیچریت' ہے، معجزات وغیرہ کے باب میں تقریباً تمامتر سید احمد خانی خیالات کی ترجمانی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے منہ بناتا ہے تو کنین کی گولی پر شکر خوب لپیٹ دینی چاہئے لیکن یہ تو نہ ہو کہ اس میں مبالغہ کرتے کرتے کنین سرے سے غائب ہو جائے، اور بخار کے مریض کو خالی شکر پھنکائی جاتی رہے! جدید خیالات کی مطابقت میں مترجم کو ضعیف سے ضعیف بھی جو تاویل مل گئی ہے بس اس کو بے تکلف اختیار کر لیا گیا ہے، اور لغت، نحو، حدیث، سیاق قرآنی، اجماع اکابر امت، کسی شے کی اس کے مقابلہ میں پروا نہیں کی گئی ہے۔

۲۔ شبہات جدیدہ کے جوابات دینے کی ایک خاصی حد تک کوشش کی گئی ہے، پھر بھی وہ حد بہت ناکافی ہے، اور مزید کوششوں کی ضرورت پوری طرح باقی ہے۔

۳۔ جا بجا فہم مطالب قرانی میں بھی غالباً زیادہ وقت نہ دے سکنے کے باعث، لغزشیں ہو گئی ہیں۔ مثلاً آیہ
مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ ان ینزل الخ میں نا فہم انگریز مترجمین
کی طرح المشرکین (مجرور) کا عطف الذین کفروا پر کر دیا ہے، جو صریحاً اہل الکتاب پر ہونا چاہئے تھا۔
وقس علیٰ ہذا۔

۴۔ زبان کا معیار بھی ہر جگہ زیادہ بلند نہیں۔ اور نہ حوالے ہر جگہ پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔

دوسرا قابل ذکر ترجمہ نو مسلم انگریز مارماڈیوک پکتھال صاحب کا ہے۔ پکتھال صاحب انگریزی نہیں بلکہ اپنی زبان کے ایک کہنہ مشق انشا پرداز بھی ہیں اس لئے زبان کے اعتبار سے ان کے ترجمہ کا کیا پوچھنا بے اختیار یہی جی چاہتا ہے کہ بار بار اسے پڑھے جائے۔ اور لطف لئے جائے! اتنی بہتر زبان تو ہم لوگ سالہا سال کی سعی و محنت کے بعد بھی نہیں پا سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ صحت مطالب کے اعتبار سے، اس کا معیار خاصا پست ہے موٹی موٹی غلطیاں صرف پہلے پارہ میں ۱۵۔۲۰ کی تعداد میں ہونگی۔ جن میں سے بعض اس قدر کھلی ہوئی ہیں کہ بجز اتفاقی سہو نظر کے اور کسی سبب پر محمول ہی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر حواشی بھی اس ترجمہ میں بمنزلہ صفر کے ہیں بحیثیت مجموعی یہ ترجمہ صرف اس قابل ہے کہ کوئی دوسرا مترجم اس کو زمین اور اصل قرار دے کر اسی پر اپنی محنت و تحقیق کے لحاظ سے ایک نئی عمارت تعمیر کرے۔

موجودہ تراجم کے اس اجمالی تذکرہ سے ان کا ناکافی ہونا واضح ہو گیا، گو بعض ترجمے بجائے خود اپنے اپنے حدود کے اندر کیسے ہی نافع رہے ہوں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ایک ترجمہ ایسا شایع کیا جائے، جو ایک طرف جمہور اہل سنت کے عقائد کا ترجمان ہو، مسائل میں قطع و برید کرنے والا نہ ہو، اور دوسری طرف ٹھیٹھ مولویانہ بھی نہ ہو۔ اس کی تشریحات ایسی نہ ہوں کہ پڑھنے والے کو جزئیات ہی میں الجھا دیں۔ جو ذہنیت یورپ کی اور یورپی تعلیم پائے ہوؤں کی ہے، اس کی رعایت حواشی میں خاص طور پر ملحوظ رہے، اور ترجمہ و تفسیر اس انداز سے

کی جائے کہ جدید شبہات حتی الامکان پیدا ہی نہ ہونے پائیں۔ ساتھ ہی زبان درست ہو اور کاغذ، جلد، طباعت وغیرہ کی دیدہ زیبی یوروپی مطبوعات کے معیار پر ہو۔

اس ضرورت کا احساس عرصۂ دراز سے تھا لیکن سوال ہمیشہ یہی رہا کیا، کہ **کون** اس ضرورت کو پورا کرے؟ کام اپنی اہمیت و وسعت کے لحاظ سے افراد کے نہیں جماعت کے کرنے کا تھا۔ بائبل کے ترجمے مغربی زبانوں میں جماعتوں اور مجلسوں ہی نے کئے ہیں۔ اور جب کبھی ان ترجموں کی نظرثانی و ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ فرض بھی کسی فرد نے، خواہ وہ مذہبی و علمی حیثیت سے کیسا ہی بلند پایہ ہو، نہیں بلکہ بڑی بڑی ذمہ دار جماعتوں ہی انجام دیا ہے —— یہاں جماعتوں اور مجلسوں کا کیا ذکر، افراد و اشخاص ہی کا وجود عنقا!

ابھی چند ماہ کا ذکر ہے، کہ اس فرض کا احساس، ایک عامی و بے علم ننگِ اسلام و ننگ خلائق پر دفعۃً اس شدت سے مستولی ہوا، کہ اختیار اور اضطرار میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ دل نے کہا کہ آدمی جب دریا میں ڈوبنے لگتا ہے، تو کیا بے اختیار اپنے ہاتھ پیر مارنا نہیں شروع کر دیتا؟ کیا وہ وقت اس کے انتظار کا ہوتا ہے، کہ پہلے پیرنے کے فن کو باضابطہ کسی ماہر سے سیکھ لیا جائے، اور اس کے بعد ہاتھ پیر چلائے جائیں؟ جب گھر میں آگ لگتی ہے، تو کیا گھر والے فائر بریگیڈ کے انتظار میں ہاتھ پیر توڑے بیٹھے رہتے ہیں یا مضطر ہو کر دوڑ پڑتے ہیں اور جو جس سے بن پڑتا ہے، اس کوشش میں لگ جاتے ہیں؟ کوئی عزیز اگر جنگل بیابان میں سخت علیل ہو جائے، تو عزیزوں کے دل سے تو یہ نہ ہو گا، کہ کلکتہ اور بمبئی کے ڈاکٹروں اور لکھنو اور دہلی کے طبیبوں کے انتظار میں صبر کئے بیٹھے ہیں، بڑی بھلی تدبیر جو بھی بن پڑے گی بے تحاشہ فوراً شروع کر دیں گے —— فرصت عمرِ محدود زندگی کا بیشتر حصہ غفلتوں اور تباہ کاریوں کی نذر ہو چکا۔ اللہ پاک کے کلام کی خدمت کسی ادنیٰ درجہ میں بھی اگر مقبول ہو گئی، تو دنیا تو خیر جیسی گذری، گزری، عقبیٰ میں تو انشاء اللہ یکسر محرومی نہ رہے گی۔

اپنی طرف نظر گئی تو عقل مسکرائی، اور جسارت خود، دنگ ہو کر رہ گئی علمی استعداد، انگریزی میں بالکل مبتدیوں جیسی۔ عربی میں مبتدیوں سے بھی کمتر رہا تقویٰ و طہارت، سو ان الفاظ کے معانی سے تو کبھی دور کا بھی رشتہ نہیں رہا! اس بے بضاعتی پر یہ حوصلے! اس بے مائگی پر یہ ولولے! سنتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب بازار مصر میں فروخت ہونے کو آئے ہیں، تو ایک سیدھی سادھی ضعیفہ، اپنے سوت کی پٹریاں لیکر اُنھیں خریدکرنے کو نکلی تھیں! چودھویں صدی ہجری کے وسط میں وہی روح ایک نئے قالب میں نمودار ہوئی! تاریخ کا اپنے آپ کو دوہرانا آخر کہتے کس کو ہیں؟ ان ضعیفہ کی سادہ دلی اگر تبسم کی مستحق تھی، تو یہ جسارت قہقہہ کے قابل! —— لیکن پھر یاد پڑا، کہ جن کا کلام ہے، وہ جب کوئی کام کیا چاہتے ہیں تو آلہ کار کے ضعف و قوت کی پرواہی کب کرتے ہیں؟ کیا نمرود کی روایت سننے میں نہیں آئی، کہ ایک مچھر کو اس پر مسلط کر دیا گیا۔ کیا صاحب فیل ابرہہ کا واقعہ تاریخ میں نہیں گذر چکا ہے، کہ اس کے سارے لشکر اور ہاتھیوں کے غول کے لئے چند بے بساط چڑیاں اور ان کے ننھے ننھے پنجوں کی کنکریاں کافی ہو گئیں؟ کیا بڑے بڑے سائنس دانوں کا یہ متفقہ مشاہدہ نہیں ہے کہ بڑے بڑے کڑیل جوان روزمرہ، خوردبینی کیڑوں سے۔ طاعون اور ہیضہ کے پردے میں، ہلاک ہوتے رہتے ہیں؟

ہمت بندھی، اور دو تین مخصوص بزرگوں کی دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں نے چیونٹی میں عقاب کا حوصلہ پرواز اور گوسفند میں شیر کا دل و جگر پیدا کر دیا! ۲۳ء ختم ہو رہا تھا، اور ۵۲ھ کا ماہ رمضان المبارک تھا کہ اللہ کا نام لےکر کام کو ہاتھ لگایا، اور ڈیڑھ دو مہینے میں پہلا پارہ جوں توں ختم ہو گیا لیکن جب نظر ثانی کی نوبت آئی، تو نظر آیا کہ حواشی بہت ناکافی رہے ابتدائی خیال یہ تھا کہ، صرف ترجمہ امکانی صحت کے ساتھ کر دیا جائے، اور حواشی مختصر بھی ہوں، اور صرف وہی ہوں، جہاں بغیر ان کے کسی طرح کام نہ چلے، لیکن کام کا کسی قدر تجربہ ہونے کے بعد، اور انگریزی مترجمین، خصوصاً راڈول کی شرارتوں کے

مشاہدہ کے بعد اس رائے پر قائم رہنا ناممکن ہوگیا، اور اس نظر سے جب نظر ثانی کی، تو کام کہنا چاہئے، کہ بالکل نیا ہوگیا۔ ان ظالموں نے عجیب عجیب طریقوں سے زہر اگلا ہے، جن کی ہمارے قدیم مفسرین اور قدیم طرز کے علماء کو خبر بھی نہیں۔ اس زہر کا تریاق یوں ہی ہو سکتا ہے، کہ حواشی خوب مفصل ہوں، اور مسائل کی تشریح یوں کی جائے، کہ شبہات از خود رفع ہو جائیں، مناظرانہ رد و قدح کی حتی الامکان نوبت ہی نہ آنے پائے ارادہ کرنے کو تو کر لیا گیا لیکن اس نظریہ پر عمل کوئی آسان چیز ہے؟ اس کے لئے سب سے اہم ضرورت انگریزی کے ایک خاصہ بڑے کتب خانہ کی ہے، جس میں۔

(۱) توریت ہو، انجیل ہو، ان کی مختلف شرحیں اور حواشی ہوں عقاید یہود و نصاریٰ سے متعلق مفصل اور دوسرے مذاہب و ادیان سے متعلق مجمل لیکن مستند معلومات کا ذخیرہ ہو۔ کلام مجید میں ان سب کا ذکر آیا ہے۔ جدید شارح کے لئے لازمی ہے کہ ان سب کے حوالے مخالفین ہی کی مسلمہ کتابوں سے تلاش کرے، تو بجائے معتقد و متاثر ہونے کے موجودہ مخالفین کو قرآن پاک کی مخالفت کا اور زیادہ موقع ہاتھ آجاتا ہے مثلاً یہود کا یہ عقیدہ کلام مجید میں نقل ہوا ہے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، بجز چند روز کے ہمیں آتش دوزخ چھوئے گی بھی نہیں۔ آج ایک یہودی جھٹ اس عقیدہ ہی سے انکار کر سکتا ہے۔ مترجم کی نظر جب تک اصل عقائد یہود اور ان کے ماخذ پر نہ ہو، وہ بے بس رہے گا۔ توریت و انجیل کے نسخے تو خیر، البتہ ان کی شروح و تفاسیر بڑی بڑی ضخیم ہیں۔ اور اسی لحاظ سے گراں قیمت بھی۔

۲۔ اہل کتاب کی کتب مقدسہ سے قطع نظر، ان اقوام کی تاریخ پر بھی عبور ہونا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل کے ذکر میں آتا ہے۔ ﴿اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ بنی اسرائیل کی یہ افضلیت دوسری اقوام عالم پر کس لحاظ سے تھی حکومت کے لحاظ سے وسعت فتوحات کے لحاظ سے جاہ و ثروت کے لحاظ سے، یا دینداری کے لحاظ سے؟ اس قسم کے سوالات کا تشفی بخش جواب اسی وقت دیا جا سکتا ہے، جب مفسر کی نظر تاریخ اسرائیل پر بھی ہو، اور تاریخ اقوام معاصرین پر بھی تاریخ اسرائیل نیز امم سابقہ پر انگریزی میں بکثرت تصانیف موجود ہیں۔

۳۔ تاریخ ہی سی اہم چیز، عہد قدیم کا جغرافیہ بھی ہے۔ کلام پاک میں مختلف مقامات کے نام بکثرت آئے ہیں، جب تک ان مقامات و ممالک کے متعلق صحیح و مستند جغرافی معلومات نہ حاصل ہوں، آیات قرآنی کی تشریح، انگریزی مذاق والوں کے لئے تشنہ رہے گی، مصر، عرب، شام، فلسطین، عراق (بابل) کم از کم اتنے مقامات کا تو تفصیلی جغرافیہ نظر میں ہونا ہی چاہئے۔ ورنہ یہ پتہ چل سکے گا کہ بنی اسرائیل کے لئے فرق بحر کہاں واقع ہوا تھا، اور نہ یہ کھل سکے گا کہ سبت شکنی کے مجرم یہود، کس مقام پر آباد تھے، اور اسی قبیل کے بیسیوں دوسرے مسائل۔

یہودی و مسیحی عقائد۔ نیز ان اقوام کی مفصل تاریخ و جغرافیہ، معاشرت اور اندرونی حالات پر کتب جوامع انگریزی میں نہایت مفصل موجود ہیں مثلاً (**Jewish Encyclopaedia**) جیوش انسائیکلوپیڈیا، جو علماء یہود کی لکھی ہوئی یہودیات و اسرائیلیات پر ایک جامع کتاب ۱۲ ضخیم مجلدات میں ہے۔ یا انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، متعدد جلدوں میں، یا ڈکشنری آف دی بائبل چار جلدوں میں، وقس علیٰ ہذا۔ اور ان کے علاوہ عام جوامع، مثلاً انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جو نہایت ضخیم ۲۸-۲۹ جلدوں میں ہے۔

۴۔ ان سب کے علاوہ قرآن و اسلام پر مخالفین نے "علم و تحقیق" کے نام سے جو کچھ لکھا ہے، اس سب کے پیش نظر رہنے کی بھی ضرورت ہے خصوصاً مرشفیلڈ، نولڈیکی، مارگولیس، میور وغیرہم کی تصانیف۔

۵۔ انگریز مستشرقین نے عربی صرف و نحو اور عربی لغت پر انگریزی میں جو کتابیں لکھی ہیں ان کا ذخیرہ بھی سامنے ہونا ضروری ہے۔ عربی صرف و نحو پر انگریزی میں متعدد اور ضخیم کتابیں ہیں۔ ہاول کی عربی انگریزی گرامر، ۷ جلدوں میں ہے، رائٹ کی عربی گرامر دو جلدوں میں۔ وقس علیٰ ہذا۔ عربی سے انگریزی کا لغت، مستند و مفصل صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ لین کا (**Lexicon**) مد القاموس کے نام سے ہے جو گویا تاج العروس کا انگریزی خلاصہ ہے طویل و عریض ۸ ضخیم مجلدات میں ہے۔ اور اب کتب فروشوں کے ہاں ملتا بھی نہیں۔ ایک انگریزی لغت صرف الفاظ قرآن پر ہے، وہ متوسط ضخامت کا ایک جلد میں ہے لیکن اب ملنا بھی اس کا دشوار ہے۔

اتنے بڑے کتبخانہ کی فراہمی کھلی ہوئی بات ہے کہ مفت ہوجانی ممکن نہیں تخمینی رقم سنیکڑوں سے گذرکر ہزاروں تک پہنچتی ہے عقل اس گنج قارون کا نام سن کر سرگریباں لیکن دل یہ کہہ رہا ہے، کہ جس نے ارادہ وہمت میں یہ قوت دیدی کیا وہ اس کے انتظام پر بھی قادر نہیں۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (وہ انسان کو ایسے ایسے ذرایع سے دیتا ہے، جوانسان کے خیال میں بھی نہیں ہوتے!) آخراسی کا تو ارشاد ہے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے ابتک صرف اتنا ہوا ہے کہ ایک باہمت اللہ کے بندے نے لیمن کا لغت ایک پبلک لائبریری سے نکلوا کر چند ماہ کے لئے مستعار بھیجدیا ہے۔ اور کتابوں کی فراہمی کے لئے بھی لکھنو کے ایک کرم فرمانے وعدہ فرمایا ہے لیکن انکے وعدہ کے ایفار کو کچھ ایسے تاخیر طلب مراحل سے ہوکر گزرنا ہے، کہ تریاق کو عراق سے لانے والی ضرب المثل یاد پڑجاتی ہے۔ ع۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!

حلقہ احباب میں کسی سے بھی خطاب خاص کی ہمت مطلق نہیں۔ اس خطاب عام کے لئے بالله العظیم دل بھچکچا رہا ہے، اتنا بھی جو لکھا جا رہا ہے، بڑے تامل وتذبذب کے بعد، دو ایک مخلصین کی محض تعمیل ارشاد میں۔ بندوں سے امداد کی درخواست، جب ذوالقرنین جیسے سازوسامان والے کو کرنی پڑی، اور کہنا پڑا کہ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ (میری مدد ہاتھ پیرسے کرو) تو ایک بے برگ ونواسگ دنیا، احباب کرام سے استغنار کا دعویٰ کسی درجہ میں بھی کس منہ سے کرسکتا ہے؟ تاہم بزرگوں کی ایک بات کان میں پڑی ہوی ہے اسے سب حسن ظن رکھنے والے دوستوں تک پہونچا دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کارخیر میں شرکت کی پہلی شرط طیب خاطر وانشرح قلب ہے طبیعت میں گرانی اور دل پر بار اگرکسی طرح کا بھی محسوس ہو، تو ہرگز قصد شرکت نہ فرمایا جائے۔ اور اس کا تو گمان بھی نہ لانا چاہئے کہ سچ میں کوئی باقاعدہ فہرست چندے کی کھلے گی، یا نام بنام چندہ دینے والوں کا اعلان کیا جائیگا، یا عطیات کے حساب کتاب کا

رجسٹر رکھنے اور بہی کھاتے کھولنے کی مزید مشغولیت مول لی جائے گی۔

جھجک کی سب سے بڑی وجہ خود اپنے اندر کی کمزوریاں ہیں۔ کام سالہا سال کا ہے۔ زندگی اور صحت کا بھروسہ پل بھر کا نہیں چہ جائیکہ سالہا سال کے کام کے لئے! پھر بشری ارادہ میں ضعف و اضمحلال خدا جانے کتنے مختلف و متعدد اسباب سے پیدا ہوتا رہتا ہے۔ آیندہ کی پیش بینی کون کر سکتا ہے۔ کسے خبر کل کیا کیا حوادث اور کیسے کیسے اتفاقات پیش آجائیں۔ اگر خدا نخواستہ کوئی سوء اتفاق پیش آگیا، تو اس وقت کی ندامت کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے! شرکت کی اجازت اس لئے بھی صرف اُن حضرات کے لئے ہے جن کا قلب ہر صورت حال کے لئے بخوشی راضی ہو۔

اپریل اور مے کے دو مہینے علالت کی نذر ہوئے، متعدد امراض جمع ہو گئے تھے، جن میں سب سے زیادہ خطرناک ضغطۂ قلب تھا، نیا کام اس دوران میں بالکل رکا رہا، علالت کا اثر اب تک بھی ہے، اور کام بہت سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔ پارہ اول نظر ثانی کے بعد ٹائپ ہو چکا ہے، اور ملک کے مختلف اہل الرائے حضرات کے پاس مشورہ و اصلاح کے لئے گیا ہوا ہے۔ مثلاً مولوی نواب علی صاحب ایم اے (صاحب "صحف سماوی" و "سیرۃ رسول اللہ" وغیرہ) سابق پروفیسر بڑودہ کالج، حال وزیر تعلیمات، ریاست جوناگڈھ۔ پارۂ اول کو بعض علماء اہل سنت سے مشورہ کے لئے اردو میں بھی منتقل کر دیا گیا ہے، اور اس کی نقلیں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہٗ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مناظر حسن صاحب گیلانی وغیرہم کی خدمت میں روانہ ہو رہی ہیں۔

تبدیل جلود

از

مولنا عبداللہ العمادی

۱

بعض وقت سیدھی سی بات میں اختلاق اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے قرآن کریم میں ایک مقام پر انسان کی کھالوں پر عذاب ہونے کا تذکرہ ہے۔ صورت یوں بتائی ہے کہ خدا کی نشانیوں کا جو انکار کرتے ہیں وہ عنقریب آتش دوزخ میں داخل کئے جائیں گے۔ وہاں جب آگ کی وجہ سے ان کی کھالیں پک کر گل جائیں گی تو خدا کے حکم سے دوسری کھالیں تبدیل ہو جائیں گی۔ غرض یہ ہے کہ عذاب میں مبتلا رہیں اور اس کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

یہ مضمون سورہ نساء میں مذکور ہے اور بظاہر ایک سلجھی ہوی بات ہے لیکن وقت آفرینی و عجائب پسندی کی بنیاد پر جو شاخیں نکلیں جیسے جیسے شگوفے پھوٹے اور تفسیروں میں جس نہج پر اس قسم کی روایتیں پھلیں پھولیں اُن کے نظارے عجیب۔ مثلاً:۔

(الف) دوزخیوں کی جب ایک کھال پک کر گل جائے گی تو دوسری کھلڑی جو چڑھیگی اُس کا رنگ سفید کاغذ جیسا ہوگا۔ ۱

(ب) کھال چالیس گز کی ہوگی۔ دانت ستر گز کے اور شکم اتنا فراخ ہوگا کہ ایک پہاڑ اُس میں

۱ قال ابن جریر حدثنا ابن حمید قال حدثنا جریر عن للاعمش عن ثویر عن ابن عمر قال اذا احترقت جلودہم بدلناہم جلوداً بیضاء امثال القراطیس۔

سما جائے۔[1]

(ج) دن بھر میں ستر ستر مرتبہ کھال گل جایا کرے گی اور نئی کھال چڑھا کرے گی۔[2]

(د) روزانہ ستر ہزار کھالیں آگ سے جل جایا کریں گی۔ ہر کھال چالیس گز کی موٹی ہوگی۔[3]

(ھ) دن میں سو سو مرتبہ نئی کھالیں بدلی جائیں گی۔[4]

(و) آگ ان کھالوں کو روزانہ ستر ستر ہزار مرتبہ کھا جایا کرے گی۔ اور ہر مرتبہ از سر نو کھال جمے گی۔[5]

(ز) اور جسم اتنا لانبا چوڑا کر دیا جائے گا۔ کہ ایک تیز رفتار سوار کے لئے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں تین دن کی مسافت ہوگی۔[6]

(ح) دانت کوہ اُحد جتنے بڑے ہوں گے۔ اور جسم کا موٹاپا تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا۔[7]

(ط) نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ دوزخیوں کے گوشت ہی سے بنے گی۔[8]

(ی) کھال جو بدلی جائے گی وہ اصل میں ذات کی تبدیلی ہوگی۔[9]

(۲)

ان روایتوں پر خود مفسرین نے اعتراض کئے ہیں اور بات بنانے کے لئے پھر جواب دینے کی کوشش

---

[1] عن المثنیٰ عن اسحاق عن ابن ابی جعفر عن ابیہ عن الربیع قال الخ۔
[2] عن المثنیٰ عن سوید بن نصر عن ابن المبارک قال بلغنی عن الحسن الخ۔
[3] عن القاسم عن الحسن عن ابی عبیدۃ الحداد عن ہشام بن حسان عن الحسن۔
[4] زعم ابو السعود العمادی ان ہذہ الآیۃ قرأت عند عمرؓ فقال معاذ بن جبل عندی تفسیرہا یبدل فی ساعۃ مائۃ مرۃ۔
[5] قال الحسن تاکلہم النار کل یوم سبعین مرۃ (ابو السعود)۔
[6] من مزاعم ابی السعود عن ابی ہریرۃ۔
[7] ابو السعود عن ابی ہریرۃ۔
[8] قال الذی انہ تعالیٰ یبدل الجلود من لحم الکافر فیخرج من لحمہ جلداً آخر (رازی)
[9] قال النیسابوری جزم صاحب الکشاف بان المراد من ہذا التبدیل ہو تغیر الذات فلہذا فسر التبدیل بالابدال (زمخشری و نیسابوری)۔

بھی کی ہے۔ علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

ما معنی قوله جل ثناؤه کلما نضجت جلودهم بدلنا جلودًا غیرها وهل یجوز ان یبدلوا جلودًا غیر جلودهم التی کانت لهم فی الدنیا فیعذبوا فیها؟ فان جاز ذالك فاجزان یبدلوا اجسامًا وارواحًا غیر اجسامهم وارواحهم التی کانت لهم فی الدنیا فتعذب وان اجزت ذالك لزمك ان یکون المعذبون فی الاخرة بالنار غیر الذین اوعدهم الله العقاب علی کفرهم به ومعصیتهم ایاه و ان یکون الکفار قد ارتفع عنهم العذاب۔ [1]

اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "جب ان (منکروں) کی کھالیں پک کر گل اٹھیں گی تو ہم ان کے علاوہ دوسری کھالیں بدل دیں گے" کیا یہ جائز ہے کہ ان کھالوں کے علاوہ جو دنیا میں رہی تھیں دوسری کھالیں بدل جائیں اور ان میں عذاب ہو؟ یہ اگر جائز ہے تو جہاں نئی کھالوں پر عذاب ہونے کا جواز تسلیم ہوا ہے۔ یہ بھی جائز مان لو کہ دنیا میں جو روحیں اور جسم تھے وہ بھی بدل جائیں گے اور تبدیل شدہ (نئے) اجسام وارواح پر عذاب ہوگا۔ یہ بات اگر جائز ٹھیری تو تم کو لازمی طور پر ماننا پڑیگا کہ آخرت میں آگ کا عذاب جن لوگوں پر ہوگا وہ ان لوگوں کے علاوہ ہوں گے جن کے انکار و نافرمانی پر خدا نے انھیں عذاب کی دھمکی دی تھی کافروں سے عذاب اٹھ جائے گا۔ [1]

پھر لکھتے ہیں:۔

اماجلود اهل الکفر من اهل النار فانها لا تحترق لان فی احتراقها الی

دوزخی کافروں کی کھالیں جل نہ جائیں گی اس لئے کہ جل جانے کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ فنا ہو جائینگی۔

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۵ صفحہ ۸۴

حال اعادتها فناؤها وفي فنائها راحتها قالوا وقد اخبر الله تعالى ذكره عنها انهم لا يموتون وَيخفف عنهم من عذابها. قالوا وجلود الكفار احد اجسامهم ولو جاز ان يحترق منها شيء فيفنى ثم يعاد بعد الفناء في النار جاز ذلك في جميع اجزائها واذا جاز ذلك وجب ان يكون جائزاً عليهم الفناء ثم الاعادة والموت ثم الاحياء وقد اخبر الله عنهم لا يموتون قالوا وفي خبره عنهم انهم لا يموتون دليل واضح انه لا يموت شيء من اجزاء اجسامهم والجلود احد تلك الاجزاء۔ [1]

اور ظاہر ہے کہ فنا ہونے میں ان کے لئے راحت و آسائش ہے اللہ تعالیٰ اس باب میں خبر دے چکا ہے کہ دوزخی نہ تو مریں گے اور نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی کافروں کی کھالیں ان کے جسم ہی کی ایک جز ہیں جسم کا کوئی جز اگر جل کر فنا ہو جائے اور پھر فنا ہونے کے بعد آگ ہی میں اس کا اعادہ بھی ہو تو ایک جز میں اس کیفیت کو جائز ماننے سے یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہی کیفیت تمام اجزا کے لئے بھی جائز ہے یعنی ہر جزو بدن اور پورے جسم کا یہی حال ہو سکتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دوزخیوں کے جسم کا فنا ہو جانا۔ پھر از سر نو پیدا ہونا۔ مرنا اور پھر زندہ ہو جانا تجویز ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ خبر دے چکا ہے کہ دوزخیوں کو موت نہ آئے گی اور یہ ایک کھلی ہوئی دلیل اس دعوے کی ہے کہ ان کے جسم کے کسی جز پر موت لاحق نہ ہوگی۔ اور یہ مانی ہوئی بات ہے۔ کہ کھال جسم کا ایک جز ہے [1]

یہ اعتراضات معترضین کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں اور جواب بھی خود اپنی طرف سے نہیں دیا ہے مفسرین کے تین جواب نقل کر دیے ہیں مگر لہجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں کسی پر اطمینان نہیں ہے [2]۔ ان جوابوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۵ صفحہ ۸۵۔

[2] جواب کی ابتدا "قیل" سے کی ہے۔ جو تضعیف و تمریض کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی استدلال کے وثوق و اعتماد میں ضعف و کمزوری دخیل ہے۔

الف۔ دوزخ کا عذاب دراصل انسان کے لئے ہے۔ گوشت و پوست کے لئے نہیں ہے۔ جلنے کو جلد (کھلڑی) بھی جلے گی لیکن مدعا خود انسان کا جلنا ہے جو گوشت و پوست سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہے۔ بار بار نئی کھلڑی اس لئے پیدا ہوگی کہ اس کے جلنے سے انسان کو تکلیف پہنچتی رہے اور سلسلۂ عذاب منقطع نہ ہونے پائے رنج و راحت کا احساس نفس کو ہوتا ہے۔ گوشت و پوست کو نہیں ہوتا گوشت و پوست کا عذاب اصل میں عذاب نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے جس کی واقعیت میں کسی فہمیدہ شخص کو کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا۔

ب۔ گوشت و پوست میں بھی آسایش و تکلیف کے محسوس کرنے کا مادہ موجود ہے جسم کے کسی عضو میں درد ہوتا ہے تو سارے بدن پر اُس کا اثر پڑتا ہے۔ دوزخیوں کے گوشت و پوست کے جل جانے اور پھر نئے گوشت و پوست کے پیدا کرنے کا یہی منشا ہے۔

ج۔ دوزخیوں کے لئے نئی نئی کھلڑی بدلنے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ واقع میں نیا گوشت و پوست ہر گھڑی پیدا ہوتا رہے گا۔ بلکہ جیسا کہ قرآن کریم نے ایک اور مقام پر بیان کیا ہے کہ :-

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۔ (سورۂ ابراہیم ۱۴۔ رکوع ۷۔ آیت ۵۱)	تم اس روز گنہگاروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھو گے۔ ان کے کُرتے گندھک کے ہوں گے۔ آگ ان کے مونہوں کو ڈھانک لے گی۔ غرض یہ ہے کہ جس نے جو کمائی کی ہے اللہ اس کی جزا دے۔ درحقیقت اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

یہاں بھی اس کے مطابق دوزخیوں کے کُرتے جو گندھک کے ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ اشتعال پذیر ہوں گے جب جب جل چکیں گے تو دوسرے کرتے بدل دئے جائیں گے یعنی کھال کی تبدیلی سے تبدیل لباس مراد ہے۔

—— ۳ ——

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ۔ (۱) اگر احساس کا مادّہ محض انسان کے نفس میں ہے ۔گوشت و پوست میں نہیں ہے ۔اور نفس ہی پر عذاب کرنے کے لئے گوشت و پوست کو بھی جلایا جائے گا۔ تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ براہ راست نفس پر عذاب ہوتا اور وہ اجزائے جسم جن میں احساس ہی نہیں ہے ۔اور اس لئے اگر عذاب بھی ہو تو ان پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اس لپیٹ میں نہ آتے ۔جب کسی چیز میں عذاب کی حس ہی نہیں تو خواہ مخواہ کو اُسے چھیڑنے یا ستانے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔

۲۔ خالی گوشت و پوست میں بھی اگر احساس ہے تو گوشت کا وہ پارچہ اور کھلڑی کا وہ جز جو بدن سے جُدا ہو چکا ہو یہ احساس اس میں کیوں نہیں ہے۔

۳۔ تبدیل جلد سے اگر تبدیل لباس مراد ہے اور پہلے لباس ہی کے جلنے کے بعد اہل دوزخ کو نیا لباس تبدیل کرایا جائے گا۔ تو اس کے لئے آیت میں لفظ "نضجت" کا استعمال جس کے معنی پکنے اور پک کر گل جانے کے ہیں ۔کیوں کر جائز ہوسکتا ہے ۔عربی زبان میں جب یہ محاورہ ہی نہیں ہے تو قرآن کریم کی بلاغت اس کو کب روا رکھنے لگی تھی؟

اس موقع پر امام رازی نے بھی دو اعتراض پید کئے ہیں۔

الف خدا میں جب اس قدر قدرت ہے کہ دوزخیوں کو ہمیشہ آگ میں زندہ رکھ سکتا ہے ۔تو کیا وہ اُن کے جسم کے باقی رکھنے پر قادر نہ تھا کہ عذاب بھی ہوا کرتا اجزائے جسم بھی فنا نہ ہوتے اور نئے گوشت و پوست کے چڑھانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی ؟

ب ۔جس گوشت و پوست نے گناہ کئے تھے ۔جب وہ آگ میں جل چکا تو نئے گوشت و پوست کو جو بالکل بے گناہ ہیں ۔پیدا کرکے آگ میں جلانا صریح بے انصافی ہے۔

پہلے اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

انه تعالیٰ لا یُسئال عما یفعل بَلْ	خدا جو چاہے کرے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہم تو یہ
نقول انه تعالیٰ قادرٌ علےان یوصل	بھی کہہ سکتے ہیں کہ دوزخیوں کے جسم کو بغیر اس کے کہ آگ
الی ابدانھم الاماً عظیمةً من غیر	میں ڈالنا پڑے۔ خدا سخت سے سخت عذاب دے سکتا ہے۔
ادخال النار مع انهٗ ادخلھم النارَ	مگر اس پر بھی اس نے آگ میں ڈالا۔ [1]

دوسرے اعتراض کے حسب ذیل جواب دیے ہیں۔

الف۔ نضج اور نضیج یہ دونوں دو چیزیں ہیں۔ اس لئے ذات کے اعتبار سے جسم تو وہی رہیگا جو دنیا میں تھا۔ البتہ صفت بدلی ہوگی۔

ب۔ عذاب اصل میں انسان پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ کھال انسان کی ماہیت میں داخل نہیں ہے بلکہ اس سے ملی ہوئی ایک زائد چیز ہے۔ نئی کھال انسان تک عذاب پہونچنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔ اس لئے حقیقت میں عذاب اسی کو ہوا جس نے گناہ کئے تھے۔

ج۔ کھال سے مراد گندھک کے کرتے ہیں۔

د۔ اس سے حقیقت مراد نہیں ہے بلکہ استعارہ مقصود ہے۔

ھ۔ دوزخیوں کے جسم پر نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ انھیں کے گوشت سے بنی ہوگی اور ظاہر ہے کہ ارتکاب گناہ میں یہ گوشت بھی شریک رہ چکا ہے۔

ہنوز یہ شبہہ باقی رہتا ہے کہ (۱) پہلے شبہہ خدا سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا لیکن کیا اس کی تمام باتیں حکمت پر مبنی نہیں۔ کیا ایک نیا شبہہ پیدا کر دینے سے پہلے شبہہ کی اہمیت کم ہوجاتی ہے۔ اور کیا خود امام صاحب نے ایک موقع پر یہ نہیں لکھا ہے کہ آتش دوزخ سے وہ آگ مراد نہیں ہے جس میں کیمیاوی مادے ہوا کرتے ہیں۔

[1] یہ اور اس سے قبل کے دونوں اعتراض اور بعد کے پانچوں جواب تفسیر کبیر میں بڑی تفصیل سے مذکور ہیں ملاحظہ ہو جلد ۳ صفحہ ۲۴۷ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ۔

۲۔ تبدیلی خواہ جسم میں ہوئی ہو یا اس کی صفت میں۔ سوال تو یہ ہے۔ کہ مجرم خود انسان تھا۔ اور وہی صاحب ارادہ بھی ہے گوشت و پوست میں یہ مادہ کہاں کہ اپنے ارادہ سے کوئی کام کر سکیں۔ انسان کی طبیعت نے جب اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہا ان سے کام لیا اور وہ انسانی اغراض کے حاصل ہونے میں محض آلہ ہی آلہ تھے۔ اس صورت میں عذاب کا مستحق اگر ہے تو انسان کا نفس ہے۔ کھال نے کیا گناہ کیا تھا کہ اس کو بار بار جلایا جائے۔ یہ عذاب اگر محض اس بنا پر ہے کہ جرم کے وقت کھال بھی جسم انسانی کے شریک حال تھی۔ تو اس ضابطہ کی رو سے اس حصۂ زمین کو بھی جس پر جرم ہوا ہو اور اس کپڑے کو بھی جو حالت جرم میں مجرم کے جسم پر رہا ہو عذاب دینا چاہئے۔

۳۔ استعارہ کی توجیہ قرین قیاس تو ہے۔ مگر اس کا ثبوت درکار ہے۔

۴۔ مفسر سُدّی کی یہ رائے کہ "دوزخیوں کے جسم پر نئی کھال جو پیدا ہوگی وہ انہیں کے گوشت سے بنی ہوگی۔ اس لئے یہ اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ نئی کھال پر جو کسی حالت میں شریک گناہ نہ تھی۔ کیوں عذاب ہوا۔" ایک ایسی رائے ہے جو اسی وقت قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔ جب یہ بھی ثابت ہو جائے کہ سورۂ اعراف میں سوئی کے ناکے سے اونٹ کے گذر جانے کی قرآن نے جو شرط کی ہے وہ خدا کے نزدیک محال ہو تو ہو۔ مگر واقع میں محال نہیں ہے جسم خواہ کتنا ہی لانبا چوڑا کیوں نہ ہو تاہم اس کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ گوشت سے اگر ہمیشہ کھال بنا کی اور ایک کے جل جانے کے بعد دوسری پیدا ہوتی رہی تو ایک نہ ایک دن ایسا بھی آئے گا، کہ سارا جسم خود بخود فنا ہو جائے گا۔ اور عذاب جاوید کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔

۵۔ طبی تحقیقات نے ثابت کر رکھا ہے کہ اجزائے بدن تحلیل ہوا کرتے ہیں۔ پُرانے اجزا کی جگہ نئے اجزا لیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جبکہ وہ جسم جس کو لیکر انسان پیدا ہوا تھا ہمہ تن بدل چکا ہوتا ہے۔ فرض کرو کسی شخص نے ابتدائی زندگی میں کوئی ایسا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں دوزخ نصیب ہو۔ اور آگ میں جلنا پڑے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اجزائے جسم جن کے ذریعہ سے ارتکاب گناہ کا کیا

مرتکب ہوا تھا. جب وہ حالت زندگی ہی میں تحلیل ہو چکے تھے اور پیرانہ سری کے عالم میں نئے اجزا نے جن کو ابتدائی عمر کی غلط کاریوں سے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا پُرانے اجزا کی جگہ لے لی تھی۔ تو آخر کس جرم کی پاداش میں ان کو جلایا جائے گا۔

عراق عرب کے مشہور مفسر شہاب آلوسی کی رائے اس موقع پر سُننے کے قابل ہے۔

فرماتے ہیں:۔

عندی ان ھذا السوال مما لا یکاد یسئاله عاقل فضلاً عن فاضل و ذالک لان عصیان الجلد وطاعته وتالمه وتلذذه غیر معقول لانه من حیث ذاته لا فرق بینه وبین سائر الجمادات من جهة عدم الادراک والشعور وھو اشبه الاشیاء بالالة فید قاتل النفس ظلماً مثلاً آلة له کالسیف الذی قتل به ولا فرق بینهما الا بان الید حاملة للروح والسیف لیس کذالک وھذا لا یصلح وحده سبباً لاعادة الید بذاتها واحراقها دون اعادة السیف و احراقه لان ذالک الحمل غیر اختیاری

میرے نزدیک یہ سوال ایسا نہیں ہے جسے کوئی صاحب فضل و کمال تو کیا کوئی معمولی عقل کا آدمی بھی کر سکے سبب یہ ہے کہ کھال کی نافرمانی۔ اطاعت۔ الم پذیری اور لذت یاب ہونا یہ سب نامعقول باتیں ہیں اس لئے کہ ذاتی حیثیت سے اس میں اور دوسرے جمادات میں کوئی فرق نہیں ہے احساس و ادراک و شعور نہ اُن میں ہے اور نہ اس میں۔ آلے سے وہ بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ مثلاً جس شخص نے کسی کو بے گناہ قتل کیا ہو اس کا ہاتھ بھی آلۂ قتل ہے اور اسی تلوار کے مشابہ جس سے مقتول کی اس نے جان لی تھی ان دونوں میں بجز اس کے اور کوئی فرق نہیں ہے کہ ہاتھ میں جان ہے اور تلوار میں نہیں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر ہاتھ کو پھر پیدا کر کے جلایا جائے۔ اور تلوار اس سے مستثنیٰ رہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ بے اختیاری

فالحق ان العذاب علی النفس الحساسة بای بدن حلّت وفی ای جسد کانت وکذا یقال فی النعیم۔ ؎

کی بات تھی۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ عذاب اس نفس پر ہوگا جس میں حس ہے۔ خواہ وہ کسی بدن میں جائے اور کسی جسم میں رہے یہی حالت بہشت کی نعمتوں کی بھی ہے۔ ؎

اس کے بعد متعدد حدیثیں تائید میں روایت کی ہیں۔ اور پھر لکھتے ہیں۔

ولولا ما علم من الدین بالضرورة من المعاد الجسمانی بحیث صار انکاره کفرًا لم یبعد عقلاً القول بالتنعیم والعذاب الروحانیین فقط ولما توقف الامر علی اثبات الاجسام فلا ولا یتوهم من هذا انی اقول باستحالة اعادة المعدوم معاذ الله تعالیٰ ولکنی اقول بعدم الحاجة الی اعادته وان امکنت۔ والنصوص فی هذا الباب متعارضة فمنها ما یدل علی اعادة الاجسام بعینها بعد اعدامها ومنها ما یدل علی خلق مثلها وفناء الاولیٰ ولا اری بأسًا بعد القول بالمعاد الجسمانی فی اعتقاد ای الامرین

مذہب کے رو سے اگر بدیہی طور پر یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ جسم کے لئے معاد لازمی ہے اور اس کا انکار حد کفر تک پہونچتا ہے تو عقل کے رو سے یہ بات کوئی دور نہ تھی کہ راحت وعذاب دونوں روحانی ہوں گے اس لئے کہ بالفعل جسم کا ثبوت دینے پر معاملہ موقوف ہے۔ یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ جو چیز معدوم ہو چکی ہو اُس کے اعادہ کو میں محال کہہ رہا ہوں معاذ اللہ لیکن میں یالبتہ کہتا ہوں کہ وہ جسم جو معدوم ہو چکا ہو اس کا واپس لانا خواہ ممکن ہو مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حدیثیں بھی اس باب میں ایک دوسرے کے معارض ہیں بعض سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے معدوم ہو جانے پر بعینہٖ اُسی جسم کا اعادہ ہوگا اور بعض کا یہ مفہوم ہے۔ کہ پہلا جسم تو فنا ہو چکا ہے مگر ویسا ہی دوسرا جسم پیدا ہو جائے گا جب معاد جسمانی ہی کو ماننا ہے تو کچھ

؎ تفسیر روح المعانی سورۂ نساء

مضایقہ نہیں کہ ان میں سے جس بات کو چاہیں مان لیں[۱]۔

(۵)

اس موقع پر ناظرین آیت زیر بحث کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿سورہ ۴ رکوع ۸ آیت ۵۹﴾

جن لوگوں نے ہماری نشانیوں سے انکار کیا ہم اُن کو آگ میں (لے جا) داخل کریں گے جب انکی کھالیں گل جائیں گی تو ہم اس غرض سے کہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ گلی ہوئی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے۔ بیشک اللہ (بڑا) زبردست صاحب تدبیر ہے

آیت کا مطلب بیان کرنے سے پہلے دو باتیں بطور اصول کے سن لینی چاہئیں:۔

الف۔ قرآن کریم نے عذاب آخرت کی جو تشریحیں کی ہیں اُس کی صورتیں زیادہ تر انسان کی اخلاقی کمزوریوں سے وابستہ ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں۔

سر قوله تعالى كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ اى الجحيم في باطنكم فاطلبوها بعلم اليقين لترونها قبل ان تدركوها بعين اليقين[۲]

اللہ تعالی کے اس قول کا کہ "ہرگز نہیں اگر علم الیقین ہوتا تو دوزخ کو تم دیکھ لئے ہوتے" راز یہ ہے کہ دوزخ خود تمہارے دل میں موجود ہے۔ لہذا اس کو علم یقین کے ذریعہ سے دیکھ لو قبل اس کے کہ یقین کی آنکھ سے اُس کو دیکھو گے[۲]

ب۔ بہشت و دوزخ کے متعلق قرآن کریم میں جس قدر واقعات مذکور ہیں اُن سب میں مجاز کا پہلو ہے۔ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

[۱] عذاب روحانی ہوگا یا جسمانی اور اعادۂ معدوم جائز ہے یا نہیں یہ ایک جداگانہ بحث ہے اور کسی مستقل عنوان کے تحت میں اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ [۲] جواہر القرآن۔

ان اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اخبرنا بما
وعدنا بہ فی الدار الآخرۃ من النعیم
والعذاب واخبرنا بما یوکل و
یشرب وینکح ویفرش وغیر ذالک
فلولا معرفتنا بما یشبہ ذالک فی الدنیا
لم نفهم ما وعدنا بہ ونحن نعلم
مع ذالک ان تلک الحقایق لیست
مثل ھذہ حتیٰ قال ابن عباس ؓ
لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء

خدا نے آخرت میں جس راحت وعذاب کا ہم سے وعدہ
کیا ہے۔ اس کی خبر اور نیز ان چیزوں کی خبر دی جو
کھائی پی صحبت کی۔ اور بچھائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ
لہذا جن چیزوں کا وعدہ ہوا ہے۔ اگر دنیا میں بھی انہیں
سے ملتی جلتی ہوئی چیزوں کا ہم کو علم نہوتا تو ہم ان
وعدوں کو سمجھ سکتے ہی نہ تھے۔ باایں ہمہ ہم یہ بھی جانتے
ہیں کہ یہ واقعات (جو بہشت و دوزخ کے متعلق قرآن
کریم میں مذکور ہیں) ایسے ہی نہیں ہیں (جیسے دنیا میں
نظر آتے ہیں) حتیٰ کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ

"بہشت میں جو چیزیں ہیں ان سے دنیا میں کوئی چیز بھی نہیں ہے اگر ہے تو صرف نام ہے" [۱]

یہ اصولی ایضاح کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور اب اس کے بعد آیت زیر بحث کی تفسیر کے لئے امام رازی کے اس فقرہ کو درج کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے جو ان کی رائے میں واقع ہو یا نہو مگر ممکن ضرور ہے لکھتے ہیں:۔

یمکن ان یقال ھذا استعارۃ عن
الدوام وعدم الانقطاع کما یقال
لمن یراد وصفہ بالدوام کلما انتهی
فقد ابتدا من اولہ فکذا قولہ
کلما نضجت جلودھم بدلناھم

کہہ سکتے ہیں کہ آیت میں عذاب کے ہمیشہ رہنے اور منقطع
نہ ہونے کی جانب اشارہ ہے جس طرح اس شخص کی
نسبت جس کی مداومت کی تعریف مقصود ہوتی ہے
کہتے ہیں کہ "جب وہ ختم کر چکتا ہے تو پھر شروع کر دیتا
ہے اور جب آخر تک پہونچتا ہے تو پھر اول سے ابتدا

[۱] رسالہ فی شرح حدیث النزول ۔

جلودا غيرها۔ يعني كلما ظنوا انهم نضجوا واحترقوا وانتهوا الى الهلاك اعطيناهم قوة جديدة من الحياة بحيث ظنوا انهم الآن حدثوا ووجدوا فيكون المقصود بيان دوام العذاب وعدم انقطاعه[1]

کرتا ہے" اسی مضمون کی یہ آیت بھی ہے کہ "ان کی یعنی دوزخیوں کی کھالیں جب گل جائیں گی تو ہم بجائے ان کے دوسری کھالیں بدل دیں گے" یعنی جب وہ یہ سمجھیں گے کہ اب تو کھال پک کر جل چکی اور ہلاکت کا موقع آگیا (کیونکہ وہ اسی کو غنیمت سمجھیں گے کہ ان سے گوشت جل جائے کہیں اس عذاب کی زندگی سے نجات ملے) تو ہم از سر نو انہیں زندگی کی ایسی طاقت عطا کریں گے کہ ان کو گمان ہوگا کہ ہم ابھی پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا آیت کی غرض یہ ہوگی کہ عذاب جاوید کا تذکرہ کیا جائے اور اس کے مسلسل قائم رہنے کی توضیح ہو۔

علامہ نظام الدین الحسن بن محمد بن الحسین القمی النیسا بوری فرماتے ہیں۔

المراد الدوام وعدم الانقطاع ولا نضج ولا احتراق۔[2]

نہ کھال کا پک کر گلجانا مقصود ہے اور نہ جلنا مراد ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سلسلہ عذاب ہمیشہ رہیگا اور منقطع نہ ہوگا۔

(٦١)

شیخ اکبر ابن عربی اندلسی نے ایک اور ہی معنی بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں۔

ان الذين كفروا بآياتنا اي حجبوا عن تجليات صفاتنا وافعالنا اذ مطلع الآية كونه متجليا بالعلم والحكمة والملك في آل ابراهيم سوف نصليهم" نار شوق الكمال لاقتضاء

"جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے تجلیات صفات و تجلیات افعال سے حجاب میں رہے۔ یہ مطلب اس لئے ہے کہ اس آیت سے پہلے کی آیت میں "آتینا آل ابراہیم الکتاب والحکمۃ و آتیناہم ملکاً عظیماً" وارد ہے یعنی آل ابراہیم کو اللہ

---

۱ تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۰۔ ۲ تفسیر نیسا پوری جلد ۵ صفحہ ۱۰،

غرائزهم وطبايعهم بحسب استعدادهم ذالك مع رسوخ الحجاب و لذ ومه اونارقهر من تجليات صفات قهره تناسب احوالهم او نار شره نفوسهم وحدة شوقها وطلبها لما ضريت بها من كمالات صفاتها وشهواتها مع حرمانها عنها۔

نے کتاب وحکمت وملک عظیم سے سرافراز فرمایا' لہذا مطلع آیت یہ ہو کہ آل ابراہیم پر اللہ نے علم و حکمت وملک کی تجلی نازل فرمائی' اس تجلی الٰہی کے بعد بھی جن لوگوں نے کفر کیا "عنقریب ہم انھیں آگ میں ڈالیں گے" یہ آگ کئی طرح کی ہوگی۔ (۱) شوق کمال کی آگ باعتبار طبیعت و استعداد فطرت، کہ آیات کے انکار سے حجاب میں پڑے ہیں' پردہ حائل ہے، اور اب دل میں آگ لگی ہے کہ یہ کمی پوری ہوجائے

(۲) آتش قہر جو صفات قہر الٰہی کی [illegible] (۳) آتش حرص وطمع نفسانی کی حدت شوق و طلب میں دل جل رہا ہے، محروم پڑے ہیں۔ اور اس محرومی کے دور کرنے کے لئے بے تاب ہورہے ہیں۔

كلما نضجت جلودهم رفعت حجبهم الجسمانية بانسلاخهم منها ودبدلناهم حجبا غيرها جديدة۔ "ليذوقوا العذاب" نيران الحرمان ان الله كان عزيزا" قويا يقهرهم ويذلهم بذل صفات نفوسهم ويحرقهم بنيران توقانها الى كمالاتهم مع حرمانهم ابدا "حكيما"

"جب جب ان کی جلدیں پک کے گل سڑ گئیں" یعنی جہاں ان کے جسمانی حجاب اُٹھے اور وہ اُس سے باہر نکلنے کو ہوئے کہ دوسرے نئے نئے حجاب "ہم نے بدل دیئے تاکہ آتش حرمان کا "عذاب چکھیں" "اللہ عزیز ہے" یعنی قوی ہے جو اُن کے صفات نفسانی کو ذلیل کرکے خود انھیں مقہور و ذلیل بناتا ہے حصول کمال کا بڑا شوق ہے۔ مگر ہمیشہ کے لئے اس کمال سے محروم ہوگئے اللہ اسی آگ میں انھیں جلاتا ہے۔

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِشارَات

ربیع الاول اور ربیع الثانی کے دونوں مہینے مجھ پر سخت جسمانی تکلیفوں کے ساتھ گذرے۔ ربیع الاول کا پرچہ طبیعت پر جبر کرکے حسب دستور مرتب کیا۔ مگر بیماری کی محنت نے دل اور دماغ پر ایسا برا اثر کیا کہ ربیع الثانی کے پرچے میں اشارات اور نقد و نظر کے سوا اور کچھ نہ لکھ سکا۔ جو مضامین مسلسل شایع ہو رہے تھے ان کا سلسلہ مجبوراً توڑنا پڑا۔ اور حل طلب مسائل جو آئے ہوئے تھے ان پر بھی کچھ نہ لکھا جا سکا۔ میں جانتا ہوں کہ اس سے "ترجمان القرآن" کے ناظرین کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ مگر مجھے امید ہے کہ میری مجبوریوں کی طرف نظر کرتے ہوئے وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں امکانی حد تک کوشش کرتا ہوں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر مرتب کروں، اور مفید مضامین فراہم کروں۔ مگر افسوس ہے کہ چند مخلص احباب کے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ ہندوستان کے اہل علم جو اعلیٰ معیار کے مضامین لکھ سکتے ہیں، کوئی توجہ نہیں فرماتے۔ اور دست سوال دراز کرنے کی مجھے عادت نہیں۔ لہٰذا خود ہی جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتا ہوں، اور جب تک دل و دماغ کی قوتیں ساتھ دیں گی، کیے جاؤں گا۔ جس خدا نے مجھ جیسے ایک عاجز اور حقیر بندے کو اس خدمت پر لگایا ہے اُسی سے امید ہے کہ یا تو مجھے تنہا خدمت بجا لانے کی قوت عطا کرے گا یا میرے لئے چند مددگار پیدا کر دے گا۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

بعض احباب کا تقاضا ہے کہ "ترجمان القرآن" کو ابواب میں تقسیم کر دیا جائے اور مستقل عنوانات کے تحت

مضامین درج کئے جایا کریں۔ مجھے خود بھی ابتدا سے اس ضرورت کا احساس تھا۔ مگر مضامین کی قلت اس طریق ترتیب کو اختیار کرنے میں مانع تھی۔ گو یہ مشکل اب بھی باقی ہے مگر اس کی وجہ سے رسالے کی اصلاح و ترقی میں مزید تعویق مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لہذا اس مہینے سے نئی ترتیب کی ابتدا کی جاتی ہے۔ اب اس رسالے کے مستقل ابواب حسب ذیل ہونگے

اشارات۔

مقالات۔

تنزیل و تاویل اس باب میں تفسیری مباحث درج کئے جائیں گے۔

حاملان قرآن یہ باب مفسرین کے احوال اور قرآن مجید کی خدمت کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کے بیان پر مشتمل ہوگا۔

رسائل و مسائل مراسلہ نگاروں کے شکوک و شبہات اور ان کے جوابات اس باب میں درج کئے جائیں گے

تقریظ و انتقاد۔ اس باب میں خاص خاص کتابوں پر مفصل تبصرے ہونگے۔

مطبوعات۔ یہ باب مختصر تبصروں کے لئے مختص ہوگا۔

اس سلسلہ میں اگر ناظرین "ترجمان القرآن" کسی اور چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو اپنے خیالات سے مجھے مطلع فرمائیں۔ اصلاح و ترقی کی ہر مناسب تجویز شکریہ کے ساتھ قبول کی جائیگی۔

جب سے ان صفحات میں حدیث کی بحث چھڑی ہے، میرے پاس پیہم خطوط آرہے ہیں جن میں طرح طرح کے شبہات پیش کئے جاتے ہیں معترضین کی کثرت اور ان شبہات پر غور کرنے سے میں جن نتائج پر پہنچا ہوں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کئے دیتا ہوں۔

پہلی خرابی جس کا ہماری نئی نسلوں کو گمراہ کرنے میں بڑا حصہ ہے، ہمارے علما اور واعظین کی بے احتیاطی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ حضرات زمانے کے رنگ کو نہیں سمجھتے۔ نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید تعلیم اور جدید تہذیب نے

خیالات اور طبائع میں جو عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا ہے، اس کی اہمیت اور معنویت کو انھوں نے صرف یہی نہیں کہ محسوس نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ایک حقارت آمیز بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اب تک وہی باتیں لکھتے اور کہتے چلے جا رہے ہیں جو اب سے سو برس پہلے کے لوگوں کو متاثر کر سکتی تھیں، مگر آج کل کے دماغوں پر اثر ڈالنے کے بجائے ان کو الٹا آمادۂ بغاوت کر دیتی ہیں۔ اسلام اور اس کے اصول و قوانین، قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات، سنت رسولؐ اور اس کی ہدایات میں آج جتنے شبہات پیدا ہوئے ہیں، ان کا بیشتر حصہ اصل ماخذ سے نہیں بلکہ انہی غلط تحریروں اور تقریروں سے پیدا ہوا ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر ہو یا سیرت رسول اکرم کا بیان، یا تعلیمات اسلام کی تشریح، ہر چیز میں آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا بیشتر حصہ ضعیف اور موضوع روایات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور جو تھوڑی بہت صحیح روایتیں بیان کی بھی جاتی ہیں، ان کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے، جس سے صاف اور سیدھی سی بات بھی ایک چیستان بن کر رہ جاتی ہے۔ عوام کی عجائب پسندی اور توہم پرستی کو آسودہ کرنے کے لئے یہ طریقہ خواہ کتنا ہی کارگر ہو، لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والے ایک مولوی کی زبان سے موضوع اور ضعیف روایتوں کو سن کر صحیح سمجھنے لگتے ہیں، اور آیات قرآنی و احادیث نبوی کے انہی معانی کو مستند و معتبر قرار دیتے ہیں جو مولوی صاحب نے بیان کئے ہیں، پھر انہی معلومات کی بنیاد پر وہ قرآن و حدیث کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ اگر نئی روشنی کا اثر دماغ پر زیادہ پڑ چکا ہے تو کوئی شے ان کو اس نتیجہ تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی کہ اسلام بھی مذاہب باطلہ کی طرح خرافات اور توہمات کا مجموعہ ہے۔ اور اگر نئی روشنی کے ساتھ ایمان کا تھوڑا بہت نور بھی دل میں باقی ہوتا ہے تو نفس اسلام کے خلاف تو کوئی فتویٰ صادر کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، البتہ قرآن اور حدیث اور فقہ اور عقائد، اور عبادات و معاملات کے متعلق طرح طرح کے شبہات ابھرتے ہیں، اور ایک ایسی بے چینی قلب و روح میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے اثر سے ایمان اور عمل دونوں پر شدید اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔

دوسری خرابی جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلی خرابی کے مقابلہ میں کچھ کم نہیں ہے۔ خود اس گروہ میں موجود ہے جو اپنے آپ کو "تعلیمیافتہ" کہتا اور سمجھتا ہے۔ ان حضرات کو عقلیت کا بڑا دعویٰ ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں جو روش انہوں نے اختیار کی ہے وہ سراسر عقل کے خلاف ہے، اور اتنے متناقض اصول اس میں جمع ہو گئے ہیں جن کے مجموعہ کو عقلیت سے موسوم کرنا عقلیت کو بے عقلیت کا ہم معنی بنا دینا ہے۔ عقلیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں کوئی رائے تحقیق کے بغیر قائم نہ کیجائے اور تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ انسان دوسروں کی رائے اور دوسروں کے بیان پر اعتماد کرنے کے بجائے خود اپنی کوشش سے حقیقت کا سراغ لگائے اور جس بات کی حقیقت وہ معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صحیح و معتبر ذرایع معلومات فراہم کرکے ان سے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ پھر ایک صاحب عقل محقق کی شان یہ ہے کہ وہ وہم و گمان اور شک و شبہ پر اپنی رائے کی بنا نہیں رکھتا، بلکہ ہمیشہ رائے قائم کرنے کے لئے ایسی معلومات تلاش کرتا ہے جن پر وہ وثوق کے ساتھ اعتماد کر سکتا ہو لیکن ہمارے نام نہاد عقلیین کا حال یہ ہے کہ مذہب کے متعلق جو مستند ذرائع معلومات موجود ہیں ان کو ہاتھ نہیں لگاتے حقیقت کی چھان بین میں وقت اور محنت صرف کرنے پر تیار نہیں۔ چند سنی سنائی باتوں اور چند کتابوں کے سرسری مطالعہ سے جو سطحی معلومات ان کو حاصل ہو جاتی ہیں انہی پر اعتماد کرکے رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس رائے کو بلاتکلف شائع کر دیتے ہیں، تاکہ خود جن شبہات میں مبتلا ہوے ہیں ان میں دوسرے بھی گرفتار ہو جائیں۔

مذہب کے مسائل میں ان حضرات کے طرز عمل، خیالات، اور اقوال کا جو حال ہے اس پر اگر وہ خود غور کریں تو انھیں آپ ہی اپنی غیر معقولیت کا احساس ہو جائے۔ انھوں نے خود ہی دین کے علم اور دین کے معاملات کو ایک الگ گروہ کے لئے چھوڑ کر اسلام میں پادریت اور برہمنیت کی طرح "مولویت" Priesthood کی بنا ڈالی۔ انھوں نے خود ہی اپنی دنیا کا دائرہ دین کے دائرے سے الگ کر لیا، اور آپ ہی دنیا کے علوم

اور معاملات میں منہمک ہو کر دین کے علم اور اس کے معاملات سے بے تعلق ہو گئے۔ یہ تفریق اسلام میں نہ تھی۔ اسلام نے تو دین کے علم کو دنیوی علوم کے لئے رہنما، اور دینی اعمال کو دنیوی معاملات کے لئے مصلح قرار دیا تھا۔ اسلام کا تو اصل مقصد یہی تھا کہ قرآن کی شمع ہدایت تمہارے ہاتھ میں ہو اور اس کو لئے ہوئے تم خدا کی خدائی میں ہر طرف علم صحیح کی جستجو کرو۔ قرآن کا قانون اور رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہو اور اسی کے سانچے میں تمہاری زندگی کے سارے معاملات ڈھل جائیں مگر تم نے قرآن اور سنت رسول کو تو ایک ایسے گروہ کے حوالہ کیا جس کو دنیوی علوم اور دنیوی معاملات سے کچھ سروکار نہ تھا، اور خود اس نور ہدایت اور اس قانون کے بغیر علم و عمل کے میدانوں میں سفر شروع کر دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو دین اور دنیا کی اس غیر فطری تفریق کا ہونا چاہئے تھا۔ تمہارے افکار اور اعمال اسلامی فکر و عمل سے بہت دور ہٹ گئے۔ تمہارے دماغوں پر غیر اسلامی تخیلات اور تمہاری زندگی کے معاملات پر غیر اسلامی قوانین غالب آگئے۔ تمہارا قافلہ "کعبہ" کی سمت کو چھوڑ کر "ترکستان" کی طرف نکل گیا اور بہت دور نکل گیا۔ ایک طرف تم ہو کہ علم و عمل کی راہوں میں گرم سفر ہو، مگر تمہارے پاس کتاب اللہ و سنت رسول کی شمع ہدایت نہیں ہے۔ دوسری طرف تمہارے علما ہیں کہ اس شمع ہدایت کو سنبھالے ہوئے ہیں، مگر وہ نہ تو علم و عمل کی منزلوں میں تمہاری رہنمائی کر رہے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ ان منازل کی رسم و راہ سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اب جو خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں ان کا سارا الزام تم "مولوی" کے سر رکھتے ہو۔ حالانکہ "مولوی" سے زیادہ تم خود قابل الزام ہو۔ تم ہی نے "مولوی" کو مذہب کا ٹھیکا دیا۔ تم ہی نے قرآن پڑھنا اور سمجھنا چھوڑ دیا۔ تم ہی نے سنت رسول سے اپنا رشتہ منقطع کیا۔ تم ہی نے اسلام کے اصول اور قوانین کے علم کو اپنی تعلیم کی اسکیم سے خارج کیا۔ مولوی غریب نے تم سے کب اس کا مطالبہ کیا تھا؟ وہ بیچارہ تو ابتدا سے یہی کہہ رہا ہے کہ دنیوی علوم سیکھتے ہو تو ضرور سیکھو مگر خدا را دین کے علم کو نہ چھوڑو۔

دین اور دنیا کی تفریق کے جو لازمی نتائج تھے وہ جب سامنے آئے تو ہمارے نئے تعلیم یافتہ گروہ میں ایک

بے چینی پیدا ہوگئی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ اس بے چینی کے اصل سبب کو سمجھتے اور اس کا صحیح علاج کرتے، انہوں نے اسباب کی غلط تشخیص کی اور غلط علاج شروع کردیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی اس کوتاہی کو محسوس کرتے جو علوم دین سے بے بہرہ ہونے کی بدولت پیدا ہوئی تھی اور اس کی تلافی کے لئے سعی کرتے کہ اسی چیز پر اُن کے مرض کا علاج منحصر تھا لیکن اس صحیح راستہ کو چھوڑ کر انہوں نے بالکل غلط راستوں میں اپنی قوتیں صرف کرنی شروع کردیں۔ وہ قرآن کو صحیح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے مگر قرآن کی تفسیر و تاویل کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور عجیب و غریب نکتہ آفرینیاں کرتے ہیں جن کا قرآن کے علم سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے حدیث کے علوم سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کو بالکل نہ سمجھا۔ احادیث کو پرکھنے اور ان سے مسائل اخذ کرنے کے طریقوں کو جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ فقہ کے مآخذ اور اس کے اصول کو معلوم کرنے میں تھوڑا سا بھی وقت صرف نہ کیا۔ مگر حال یہ ہے کہ ہر شخص ان مسائل پر رائے زنی کرنے کے لئے مستعد ہے کوئی صاحب فقہ پر تبرآزمائی کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جب تک مسائل فقہ کا کوئی دوسرا بہتر مجموعہ تیار نہ ہوجائے، پرانے مجموعہ کو منسوخ کردینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق ضابطۂ دیوانی و فوجداری کو منسوخ کردے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا ضابطہ نہ بنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی لغویات وہی شخص کرسکتا ہے جو ان قوانین کی اہمیت کو قطعاً نہیں سمجھتا۔ اسی طرح کچھ دوسرے حضرات اٹھتے ہیں اور احادیث پر کلام شروع کردیتے ہیں۔ کوئی صاحب ہر اس حدیث کو بے تکلف موضوع اور ضعیف قرار دے بیٹھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ کسی حدیث پر وضع یا ضعف کا حکم لگانے کے لئے جن امور کی تحقیق ضروری ہے، ان سے وہ واقف تک نہیں۔ کوئی دوسرے صاحب احادیث کے غلط سلط ترجمے پڑھ کر ان سے عجیب عجیب مسائل کا استنباط کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی اسپرٹ اور اس کے بنیادی اصول تک کو نہیں سمجھا۔ کوئی اور صاحب نہایت بے فکری کے ساتھ فتویٰ صادر کردیتے ہیں کہ اسلام کے نظام دینی سے سنت رسول اور آثار صحابہ کو یک سر خارج کردیا جائے حالانکہ اگر وہ اس دین کے نظام پر تھوڑا سا بھی غور کرتے۔ تو ان پر واضح ہوجاتا کہ داعی اسلام اور ان کے اولین تربیت یافتہ لوگوں کی سیرت اگر اسلام

سے خارج کر دی جائے تو اسلام بحیثیت ایک مذہب اور بحیثیت ایک تہذیب کے قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ یہ سب اجتہاد بلا علم کے نتائج ہیں اور اگر اس کی روک تھام نہ ہوئی تو جو نقصان دین اور دنیا کے الگ ہونے سے مسلمانوں کو پہنچ چکا ہے، اس سے ہزار گنا زیادہ شدید نقصان اس غیر معقول طریقے سے دین اور دنیا کی بے اعتدالی سے پہنچا دے گی۔

ابھی چند روز ہوئے میرے پاس پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ آیا ہے جس کا عنوان ضرورت حدیث ہے لکھنے والے خود انجمن کے سکرٹری صاحب ہیں۔ احادیث پر اصولاً ایمان رکھتے ہیں حتی کہ آقائے نامدار کے کسی قول سے انکار کرنے والے کو "ملعون" کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ لیکن فرماتے یہ ہیں کہ:

> ارباب غرض اور پیٹ پجاری اجرت پر کام کرنے والے بیہودہ گوؤں کی ہزلیات (جنہوں نے اسلام کو بدنام کرنے میں غلط باتیں ہمارے بزرگوں کی طرف منسوب کر کے اسلام کو بدنام کیا ہے) ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے، اور ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر سے ایسی روایات اور ایسے واقعات فوراً نکال دیے جائیں۔ بالخصوص صحیحین کی روایات کے سلسلہ میں جو ہیں ہر جگہ بدنام کرنے کا باعث ہے، علمائے اہل حدیث فوراً ایک الگ ضمیمہ شائع کریں۔

اس کے بعد مصنف نے ان احادیث کو پیش کیا ہے جو ان کے نزدیک اسلام کو بدنام کرنے والی ہیں اور شکایت کی ہے کہ "ہم مجبوراً مخالفین کے سامنے ان روایات کی وجہ سے لاجواب ہو کر شرمندہ ہوتے ہیں"۔ لطف یہ ہے کہ جو احادیث انہوں نے نقل کی ہیں ان میں سے اکثر صحیح ہیں۔ مگر چونکہ وہ ان احادیث کو نہیں سمجھتے، اور ان علوم کو بیکار سمجھ کر انہوں نے حاصل ہی نہیں کیا جن سے وہ ان کو سمجھ سکتے تھے، اور اس عدم علم کی وجہ سے وہ معترضین کے جواب دینے سے قاصر رہے اور اس قصور نے ان کو شرمندہ کیا۔ اس لئے انہوں نے اپنے قصور کی تلافی کرنے کے بجائے آسان ترین راستہ یہ اختیار فرمایا کہ ان حدیثوں کو "ہزلیات" قرار دیں ان کے راویوں کو جن کی پوری پوری

زندگیاں دین کی خدمت میں صرف ہوئی تھیں "ارباب غرض" "پیٹ پجاری" "اجرت پر کام کرنے والے" "بیہودہ گو" "اسلام کو بدنام کرنے والے" اور ایسی ہی دوسری گالیوں سے یاد کریں، اور مطالبہ فرمائیں کہ ہر اس حدیث کو اسلامی لٹریچر سے خارج کر دیا جائے جس کو کوئی ناواقف مسلمان نہ سمجھ سکتا ہو، اور جس پر دشمنان اسلام کے اعتراضات سن کر اسے اپنی ناواقفیت کے باعث شرمندہ اور لاجواب ہونا پڑے۔ یہ ان حضرات کی منطق ہے اور یہ اس معقولیت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے جس پر یہ حضرات فخر فرماتے ہیں۔

یہاں موقع نہیں کہ ان تمام احادیث پر کلام کیا جاسکے جن کو صاحب موصوف نے پیش فرمایا ہے مگر نمونہ کے طور پر میں صرف ایک حدیث پر بحث کروں گا جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے تعلیمیافتہ حضرات دشمنان اسلام کے کیسے کیسے لغو اعتراضات سے مرعوب ہو کر خود اپنے قلعہ پر پلٹ پڑتے ہیں اور جھنجھلا کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں۔ حدیث کو جن الفاظ میں انہوں نے نقل کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

"حضور کا فرمانا کہ اذان سن کر شیطان گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے"

اس حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

اذا نودی للصّلوٰۃ ادبر الشیطان	جب نماز کے لئے ندا کی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا
لہ ضراط حتیٰ لا یسمع التاذین فاذا	ہے۔ اور اس کے گوز صادر ہوتے ہیں کہ اذان نہ سنے
قضی النداء اقبل حتیٰ اذا ثوب	پھر جب اذان ختم ہوتی ہے تو پلٹ آتا ہے پھر جب نماز
للصلوٰۃ ادبر حتیٰ اذا قضی التثویب	کے لئے تکبیر اقامت کہی جاتی ہے تو پھر بھاگتا ہے اور جب
اقبل حتیٰ یخطر بین المرء و نفسہ	تکبیر ختم ہو جاتی ہے تو واپس آجاتا ہے کہ خطرے ڈالے
یقول اذکر کذا لما لم یکن یذکر	آدمی اور اس کے نفس کے درمیان کہتا ہے کہ فلاں
حتیٰ یظل الرجل لا یدری کم صلی	بات یاد کر فلاں بات یاد کر۔ ایسی ایسی باتیں یاد دلاتا ہے

جن کا اس کو نماز سے پہلے خیال تک نہ تھا۔ حتیٰ کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔

حدیث کی روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر وضع یا ضعف کا حکم لگایا جا سکے

اس کو امام بخاری نے خفیف سے لفظی تغیر کے ساتھ تین مختلف ابواب میں تین طریقوں سے روایت کیا ہے۔ کتاب الصلوٰۃ باب فضل التاذین میں عبداللہ بن یوسف۔ مالک۔ ابوالزناد۔ اعرج اور ابوہریرہ اس کے راوی ہیں۔ باب تفکر الرجل الشئ فی الصلاۃ میں یحییٰ بن بکیر۔ لیث۔ جعفر بن ربیعہ۔ اعرج اور ابوہریرہ نے اس کو روایت کیا ہے۔ اور کتاب بدء الخلق۔ باب صفت الابلیس وجنودہ میں محمد بن یوسف۔ اوزاعی۔ یحییٰ بن ابی کثیر۔ ابوسلمہ اور ابوہریرہ کے نام اس کے اسناد میں نظر آتے ہیں۔ نسائی نے بھی باب فضل التاذین میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔ سلسلہ اسناد میں قتیبہ اور مالک آئے ہیں۔ مسلم نے بھی باب فضل الاذان میں اس مضمون کی پانچ روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے بعض میں لہ ضراط کی جگہ لہ حصاص آیا ہے جس کی تفسیر اصمعی نے شدت فرار سے کی ہے۔ ایک اور حدیث جو مسلم نے جابر سے نقل کی ہے یہ ہے کہ شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو روحا تک بھاگتا چلا جاتا ہے۔ روحا ایک مقام ہے مدینہ سے کئی میل کے فاصلہ پر۔

اب رہا متن حدیث تو اس میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کی صداقت پر ہر نماز پڑھنے والا گواہی دے سکتا ہے۔ اذان اور تکبیر کی آواز سن کر فی الواقع انسان خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس وقت کوئی خطرہ اس کے قلب میں نہیں آتا۔ مگر نماز شروع کرتے ہی طرح طرح کے وسوسے آنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کیجہ کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ مقصود صرف یہ بتانا تھا کہ اذان کی آواز سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اس میں فرار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے کہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ روحا تک بھاگتا چلا جاتا ہے یعنی میلوں تک نہیں ٹھیرتا۔ کہیں وہی مفہوم "لہ حصاص" کے لفظ سے ادا فرمایا ہے اور کہیں "لہ ضراط" کہہ کر شدت کے ساتھ کراہت کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اردو میں کہیں کہ شیطان دم دبا کر بھاگ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض استعارہ ہوگا۔

اب اگر کوئی شخص اس مجازی کلام کو حقیقت پر محمول کرے اور یہ فرض کرلے کہ شیطان واقعی ایک دُم رکھتا ہے اور بھاگتے وقت اس کو ٹانگوں میں دبا لیتا ہے تو یہ قائل کے بیان کا نہیں، سامع کی عقل کا قصور ہوگا۔ اسی طرح شیطان کے گوز کرتے ہوئے بھاگنے سے بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ شیطان واقعی پیٹ رکھتا ہے اور اس میں غذا ہضم ہوتی ہے، اور اس سے ریاح خارج ہوتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ یکسر کودن آدمی ہے۔ بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسی باتوں پر اعتراض کرنے والے تو محض فتنہ پرداز ہیں ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے جو انھیں سیدھی سی بات کو بھی سیدھی طرح نہیں سمجھنے دیتی۔ مگر افسوس ان مسلمانوں پر ہے جو ایسے اعتراضات کو سن کر لاجواب اور شرمندہ ہوتے ہیں۔

غور کیجئے کہ صاحب مضمون نے یہ تحقیق کرنے کی کوئی تکلیف گوارا نہ کی کہ حدیث کن طریقوں سے نقل ہوئی ہے؟ سلسلۂ اسناد مسلسل ہے یا منقطع؟ راوی ضعیف ہیں یا ثقہ؟ کن کن ائمہ نے اس کو لیا ہے؟ یہ سب سوالات جن پر حدیث کی صحت یا عدم صحت کا حکم منحصر ہے، ان کے نزدیک محض بے معنی ہیں! انہوں نے تو بس یہ دیکھ لیا کہ حدیث میں شیطان کے گوز صادر کرنے کا ذکر ہے، اور چونکہ یہ ان کے نزدیک شرمناک بات تھی جس پر مخالفین کے سامنے ان کو مجبوراً لاجواب ہوکر شرمندہ ہونا پڑتا تھا، اس لئے بلا تکلف انہوں نے فرض کر لیا کہ اس کو ضرور کسی "پیٹ پجاری" "بیہودہ گو" نے "اسلام کو بدنام کرنے کے لئے" "گھڑ لیا ہوگا"! اور اب اسلام کو بدنامی سے بچانے کے لئے لازم ہے کہ یہ حدیث فوراً اسلامی لٹریچر سے خارج کر دی جائے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اگر صاحب مضمون کو اصول روایت کے لحاظ سے حدیث پر نقد کرنے کی فرصت نہ تھی، تو کیا اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ بخاری شریف میں اصل حدیث نکال کر اس کے پورے الفاظ پڑھ لیتے، اس کے مفہوم و مدعا کو سمجھتے اور عقل سے کام لے کر غور کرتے کہ اس میں شرمناک بات کونسی ہے؟ جو لوگ اسلام کے اصلی مآخذ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال سکتے ان کو یہ حق آخر کہاں سے حاصل ہو گیا ہے کہ اسلام کے وکیل بن کر کھڑے ہوں اور اپنے غریب موکل کی مسل میں سے جتنے ورق چاہیں پھاڑ پھینکیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۵)

ایمان

۵ - ایمان بالیوم الآخر

دنیا اور اسلام کے انجام پر دو مذہبوں کی رائیں آپ سن چکے ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دونوں مذہب نہ عقلاً صحیح ہیں، نہ ان فطری سوالات کا پورا پورا اور دل کو مطمئن کرنے والا جواب دیتے ہیں جو دنیا میں زوال و فنا کے آثار کو دیکھ کر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور نہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ایک صحیح اور مضبوط اخلاقی نظام کے لئے پشت پناہ بن سکیں۔ اب تیسرے مذہب کا بیان سنیے۔

حیات اُخروی کا عقیدہ تیسرا مذہب کہتا ہے کہ:۔

(۱) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہوجانے کے بعد اس میں فساد رونما ہوجاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائیگا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبعی اس نظام کے قوانین طبعی سے مختلف ہوں گے۔

(۲) اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوگی جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائیگا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملیگی۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا، اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیے تھے، ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے، حق اور انصاف

کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائیگا، اچھے اعمال کی اچھی جزا ملیگی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائیگی۔

۴۔ انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی، اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے۔ وہ اپنے حقیقی نتائج اور حقیقی ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔ لہٰذا انسان کو اپنے اعمال و افعال کے محض اُن نا تمام اور بسا اوقات دھوکہ دینے والے نتائج ہی پر نظر نہ رکھنی چاہیے جو اس دنیوی زندگی میں مترتب ہوتے ہیں بلکہ ان مکمل، پائیدار اور حقیقی نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہئے جو اس دوسری زندگی میں مترتب ہوں گے، اور نتائج کے اس مکمل سلسلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے افعال کی قدریں متعین کرنی چاہئیں۔

یہ وہ مذہب ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور قرآن مجید اسی مذہب کا پرزور وکیل ہے مگر قبل اس کے کہ ہم اس مذہب کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت پر کلام کریں دیکھنا چاہئے کہ اس مذہب کے دلائل کیا ہیں؟ اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

عقلی تحقیق کا صحیح طریقہ

یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسی تجربہ کی حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص جو چند لمحہ قبل تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا، اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہو گئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متحرک مادے کو نمو اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا معدوم ہو گئی؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہوگا یا نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے ہم اس سوال کا نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ اس چیز کو فی نفسہ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے

ہیں۔ اس بنا پر یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ اس سوال کا سائنس یعنی حکمت عملی یا تجربی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائنس اگر اس پر اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتا، تو نفیاً بھی کوئی حکم لگانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے" لیکن اگر وہ خالص لاادریت کے مقام سے ہٹ کر یہ کہے کہ "چونکہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا" تو یقیناً معقولیت کی حدود سے تجاوز کر جائیگا۔

حواس کے بعد ہمارے پاس علم کا دوسرا ذریعہ "تفکر" ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے آپ کو محسوسات کے دائرے میں مقید رکھنے سے انکار کرتا رہا ہے، اور اس کی بشری فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ وہ غور و فکر کی قوتوں سے کام لے کر ان پوشیدہ حقیقتوں کو معلوم کرے جو محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اسی فکری جستجو کا نام "تفکر" ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔

ایک یہ کہ تم دنیا اور خود اپنے نفس کے آثار و شواہد سے آنکھیں بند کر کے، یا ایک بڑی حد تک بے پروا ہو کر خالص عقلی مقدمات سے نتائج اخذ کرنا شروع کرو، اور آخر تک عقل کے گھوڑے دوڑاتے چلے جاؤ۔ یہ خالص فلسفے کا میدان ہے، اور تمام گمراہیوں کی جولانگاہ یہی اندھیری منزل ہے۔ یہیں سے وہ فلسفیانہ مذاہب نکلے ہیں جن میں الجھ کر انسان تخیل کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے۔ یہیں سے خدا اور ملائکہ اور نظام عالم اور حیات بعد الموت کے متعلق وہ مختلف اور متضاد عقیدے نکلے ہیں جو محض اندھیرے میں ٹٹولنے اور وہم و گمان اور ظن و تخمین پر چلنے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا طریقۂ فکر یہ ہے کہ تم آنکھیں کھول کر کائنات میں اور خود اپنے نفس میں ان آثار کا مشاہدہ کرو جو منزل حقیقت کے مشعل بردار ہیں، اور ان چراغوں کو لے کر عقل سلیم و فکر صحیح کی مدد سے ان حقیقتوں تک پہنچو، جو ان آثار کی تہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس دوسرے طریقے میں سائنس اور فلسفہ دونوں ملکر چلتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت تک پہنچنے کا یقینی ذریعہ یہ بھی نہیں ہے لیکن آسمانی ہدایت سے قطع نظر کر کے انسان کے پاس حقیقت رسی کا واحد ذریعہ یہی ہے، اور اس ذریعہ سے حقیقت تک یا اس کے قریب تک پہنچ جانا ممکن ہے بشرطیکہ انسان کی قوت مشاہدہ تیز ہو اس کی ادراکی

قوتیں لطیف اور نازک ہوں، اور اس میں غور و فکر کی کافی صلاحیت موجود ہو۔ حکمت نظری میں انسان کی ترقی کا مدار اسی مشاہدہ اور تفکر کی آمیزش پر ہے۔ آج جن نظریات پر حکمت کی بنیاد قائم ہے اور جن اصولوں پر ایمان لائے بغیر سائنس کا کوئی طالب علم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، ان میں سے کوئی بھی محض تجربے اور مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے۔ ہر نظریے اور ہر اصول کی بنیاد اس قیاس عقلی پر قائم ہے جس کے لئے مشاہدات و تجربات کو مواد قیاس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون فطرت، قانون جذب و کشش، سلسلۂ علت و معلول، نظریۂ اضافیت، قانون نشو و ارتقاء، قانون انتخاب طبیعی، اور ایسے ہی دوسرے اصول و قوانین جن پر بڑے بڑے اہل حکمت ایمان لائے ہیں، سب کے سب آثار و مظاہر کے مشاہدات پر غور و فکر اور عقلی قیاس آرائی کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ آج تک کسی نے بھی ان قوانین اور ان اصول کا حسی مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ پھر جو نتائج ایک حکیم اپنے مشاہدے اور قیاس سے مستنبط کرتا ہے ان پر اسے اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی عامی کو کسی شے کے حسی مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کے باوجود کوئی بڑے سے بڑا حکیم بھی کسی منکر کو ان نتائج کے ان لینے پر مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص آثار و مظاہر کا اس خاص نظر سے مشاہدہ نہ کرے جس سے حکیم نے مشاہدہ کیا ہے، اور اسی غور و فکر سے کام نہ لے جس سے حکیم نے کام لیا ہے، وہ ان نتائج پر کسی طرح نہیں پہنچ سکتا۔ ایک عامی کے لئے حکمت میں قدم رکھنے اور ترقی کرنے کی بس یہی صورت ممکن ہے کہ وہ جس حکیم کی دانائی و بصیرت پر اعتقاد رکھتا ہو، اس کے اخذ کردہ نتائج پر ایمان بالغیب لے آئے، بغیر اس کے کہ وہ خود اپنے مشاہدہ اور اپنے غور و فکر سے ان نتائج تک پہنچا ہو۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ امور ما ورائے طبیعت کے باب میں قرآن مجید کے بیان اور استدلال کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو سمجھ لینا ضروری ہے اور بہت سی غلط فہمیاں اسی کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب ہم کو حیات اخروی کے متعلق قرآن مجید کے بیان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

حیات اخروی پر منکرین کا اعتراض حیات اخروی کا اعتقاد جب قرآن مجید نے پیش کیا تو اس کے خلاف اس وقت کے منکرین نے جو اعتراض کیا تھا وہ وہی تھا جو آج کے منکرین کرتے ہیں۔ اور درحقیقت اس پر بھی ایک اعتراض

ممکن بھی ہے یعنی یہ کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ایک بعید از عقل و قیاس بات ہے ہم کس طرح مان لیں کہ جو مردے زمین میں گل سڑ گئے، جن کے جسم خاک میں مل گئے، جن کے اجزاء جسم ہوا، زمین اور پانی میں منتشر ہو گئے ان کو پھر زندگی میسر ہو گی؟

وَقَالُوٓا أَءِذَا ضَلَلۡنَا فِى ٱلۡأَرۡضِ أَءِنَّا لَفِى خَلۡقٍ جَدِيدٍ (۳۲ : ۱۰)

اور انھوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا ہوں گے؟

وَقَالُوٓا أَءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَءِنَّا لَمَبۡعُوثُونَ خَلۡقًا جَدِيدًا (۱۷ : ۵)

اور انھوں نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی، اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟

أَءِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَٰلِكَ رَجۡعُۢ بَعِيدٌ (۵۰ : ۱)

کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اٹھیں گے یہ واپسی تو بعید از عقل و قیاس ہے۔

مَن يُحۡىِ ٱلۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيمٌ (۳۶ : ۵)۔

کون ہے جو ہڈیوں کو زندہ کرے گا درانحالیکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔

قرآن مجید کا طرز استدلال اس شبہ کے مقابلہ میں قرآن مجید نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے تو وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الٰہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

سَنُرِيهِمۡ ءَايَٰتِنَا فِى ٱلۡأَفَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمۡ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ (۴۱ : ۶)۔

ہم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔

أَوَلَمۡ يَنظُرُوا فِى مَلَكُوتِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ (۷ : ۲۳)۔

کیا وہ آسمانوں اور زمین کے انتظام پر غور نہیں کرتے؟

وَفِىٓ أَنفُسِكُمۡ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ (۵۱ : ۱)

اور خود تمہارے اندر جو نشانیاں ہیں کیا ان کو بھی تم نہیں دیکھتے؟

ن من اٰیۃٍ فی السّمٰوٰتِ وَالارْضِ — آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ

ن علیھا وھم عنھا معرضون ۔ (۱۲:۱۰۲) — اس طرح گذر جاتے ہیں کہ ان پر غور ہی نہیں کرتے۔

یہ اشارہ ہے اس طرف کہ تم کو اتنی قوت تو نہیں دی گئی ہے کہ جو چیز تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے

تم برأی العین مشاہدہ کرسکو، یا کسی تجربہ سے اس کی حقیقت معلوم کرسکو۔ البتہ اگر تم آنکھیں کھول کر ان

دیکھو جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو، اور

ے نفس کی پیدایش پر نظر کرو، اور ان سب محسوسات و مشاہدات پر غور و فکر کرکے حقیقت تک پہنچنے کی

کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔

ت اخروی کا امکان پھر وہ انہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب کی

دیہی ہیں، اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات کو تم بعید از عقل و قیاس سمجھ رہے ہو، وہ چاہے تمہاری

قیاس سے دور ہو، مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔

اَلّذی رَفَعَ السّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ — وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے

ھَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ — بغیر بلند کر رکھا ہے جو تم کو نظر آسکیں۔ پھر وہ عرش پر جلوہ

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی — فرما ہوا، اور سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان کیا۔ ان میں

الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَاءِ — سے ہر ایک، ایک مدت مقررہ تک کے لئے حرکت کر رہا ہے

تُوْقِنُوْنَ ۔ (۱۳:۱۱) — وہی تمام عالم کا انتظام کرتا ہے اور وہ اپنی نشانیاں

ر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین لاؤ۔

تُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاءُ بَنٰھَا ۔ (۲: — کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ خدا

نے تو (ایسی بڑی چیز) کو بنایا ہے؟

یہ اجرامِ سماوی کے آثار سے استشہاد ہے کہ جس خدا نے اتنا بڑا نظامِ کائنات پیدا کیا ہے،

جس نے بڑے بڑے سیاروں کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا، یہ اپنے مقررہ اوقات سے پل بھر کے لئے ہٹ سکتا ہے۔ اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسے غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے جن کے ادراک سے تم عاجز ہو، اُس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کرکے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے، کیسی بڑی خام خیالی ہے؟

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (۱۷:۱۱)	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے؟

آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین احول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے:۔

سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۲۹:۲)	زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی ہے اور پھر اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (۳۶:۳)	اور ان کے لئے ایک نشانی تو مردہ زمین ہی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا ہے یہ لوگ کھاتے ہیں
فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْىِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْىِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۳۰:۵)	پھر اللہ کی رحمت کے آثار دیکھ کہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے یقیناً وہ ضرور مُردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ	اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سُونی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ

إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۴۱:۵)۔	جھبک اٹھی اور لہلہانے لگی۔ تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مُردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنَاهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَٰلِكَ النُّشُورُ (۳۵:۲)۔	اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے، پھر وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں پھر ہم ان بادلوں کو ایسی بستی کی طرف لے جاتے ہیں جو بے آب و گیاہ پڑی ہے، پھر اس مردہ پڑی ہوئی زمین کو بارش کے ذریعہ سے زندہ کر دیتے ہیں بس ایسا ہی جی اٹھنا قیامت میں بھی ہوگا۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے ذرا خود اپنے نفس پر تو غور کرو کہ خود تمہارے اندر ہی خدا کے احیاء موتی پر قادر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ (۷۶:۱)	بلا شبہ انسان پر زمانہ کا ایک ایسا وقت بھی گذر ا ہے جب کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔
كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲:۳)۔	تم مردہ تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو مردہ کر دیگا پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔
إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ (۲۲:۱)۔	اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔
قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ (۳۶:۵)	اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو جائیں گی۔ کہدے کہ ان کو وہی زندہ کریگا جس نے انہیں پہلی بار زندگی بخشی تھی۔

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷: ۵)۔

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو پھر وہ پوچھیں کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۔ (۱:۲۳)

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا ہے ہم نے ہی اس ست کو نطفہ بنا کر ایک حفاظت کی جگہ میں رکھا پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کو مضغۂ گوشت کی صورت دی پھر مضغہ کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اس کو ایک دوسری چیز بنا کھڑا کیا پس مبارک ہے اللہ جو بہترین خالق ہے پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو پھر یقیناً تم قیامت کے روز اٹھائے جاؤ گے۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۔ (۲:۷۵)۔

کیا انسان منی کا محض ایک قطرہ نہ تھا جو رحم مادر میں ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو انسانی شکل دی اور اس کی ساخت کو استوار کیا، پھر اس کی دو صنفیں کر دیں اور مرد و عورت کے جوڑے بنائے۔ کیا وہی خدا اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کرے۔

ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ واحساس سے قریب تر شواہد کو پیش کرنے کے بعد قرآن مجید

ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل عقل عام (Common Sense) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیار کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہوجانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیونکر عاجز ہوسکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا سکتا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ ان کو جوڑ دینے پر قادر نہیں ہے؟ اسی مثال پر قیاس کرلو کہ صانع عالم جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہوسکتا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (۲۹:۲)	کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے؟ پھر اسی طرح وہ اس کا اعادہ بھی کریگا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے یقیناً زیادہ آسان ہے۔
وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔ (۳۰:۳) ۔	اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔
أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۵۰:۱)	کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز رہے تھے؟ (نہیں، ان کو پہلی آفرینش سے انکار نہیں ہے) مگر ان کو ایک نئی آفرینش میں شک ہے۔

اب صرف یہ شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ جن مُردوں کے اجزائے جسم فنا ہوگئے ان کو پھر کیونکر پہلا جسم عطا کیا جاسکتا ہے، کوئی پانی میں ڈوب کر مرا اور اسکی بوٹی بوٹی مچھلیوں اور آبی جانوروں کی غذا بن گئی، کوئی جل کر مرا یا مرکر جلا دیا گیا، اور اس کا سارا جسم راکھ اور دھوئیں میں منتقل ہوگیا کوئی زمین میں دفن ہوا اور خاک میں مل گیا۔ اب کیونکر ممکن ہے کہ اس کا پہلا جسم عود کرے اور اس میں پھر وہی پہلی روح پھونکی جائے؟ ۔

اس شبہ کو لوگوں نے یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ روح کو جسمانی زندگی عطا کرنے کے لئے لازم نہیں ہے کہ وہی پہلا جسم اس کو واپس دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ روح وہی ہو اور اس کو پہلے جسم کے مشابہ کوئی دوسرا جسم عطا کر دیا جائے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خدا وہی جسم عطا کرنے پر قادر ہے۔ پہلے جسم کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے ہیں، منتشر حالت میں اس کا ہر ہر جز کہیں نہ کہیں موجود ہے، خواہ ہوا میں ہو، خواہ پانی میں ہو، خواہ مٹی میں ہو، خواہ نباتات یا حیوانات کے اجسام میں ہو، خواہ معدنیات کے اجرام میں ہو۔ خدا کا علم اتنا حاوی ہے کہ وہ ہر ہر جز کے مقام کو جانتا ہے اور اس کی قدرت اتنی کامل ہے کہ وہ ان منتشر اجزاء کو پھر جمع کر کے پہلی صورت پر بنا سکتا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۵۰:۱)

ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان میں سے کیا چیز گھٹاتی ہے اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶:۶)

اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو سب معلوم ہے، ایک پتہ بھی اگر جھڑتا ہو تو وہ اس کو جانتا ہے، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے، اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں ہے جو واضح کر کے دکھا دینے والی ایک کتاب میں موجود نہ ہو۔

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا مقصد اس استبعاد کو دور کرنا ہے جس کی بنا پر لوگ حیات اخروی سے انکار کرتے ہیں۔ انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ منکرین کو کسی تجربہ یا مشاہدہ یا علم یقینی کے کسی اور ذریعہ سے قطعاً و ایجاباً یہ معلوم ہو گیا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں بلکہ انکار صرف اس بنا پر ہے کہ مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا ان کی عقل میں نہیں سماتا، انھوں نے اس نظارہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ ان کو تو یہ دیکھنے کی عادت رہی ہے کہ

جو مرا سو پھر نہ پلٹا۔ لہذا اب جب یہ کہا جاتا ہے کہ جو مر چکے ہیں وہ پھر پلٹیں گے تو اس خلاف عادت بات کو وہ محال، غیر ممکن، اور بعید از عقل و قیاس سمجھتے ہیں لیکن غور و فکر کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھیے۔ یہ سارا استبعاد دور ہو جاتا ہے اور جو بات پہلے ناممکن نظر آتی تھی وہ عین ممکن نظر آنے لگتی ہے جن باتوں کو آپ ممکن بلکہ واقعی سمجھتے ہیں ان کے متعلق آپ کا ایسا سمجھنا محض اس وجہ سے ہے کہ آپ کو ان کے وقوع کا مشاہدہ کرنے کی عادت رہی ہے۔ ایک بیج کا زمین میں جا کر پھوٹنا اور ایک تناور درخت کی شکل میں نمودار ہونا، ایک قطرہ کا رحم میں پہنچنا اور وہاں سے ایک انسان کی شکل میں برآمد ہونا، دو ہواؤں کے مجموعے سے پانی بننا اور اس کا ایک ترتیب کے ساتھ بار بار پانی سے بھاپ اور بھاپ سے پانی بنتے رہنا، عالم کی اس وسیع فضا میں کروڑہا کرور سیاروں کا گیندوں کی طرح دوڑنا اور کسی مادی رشتے کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ ایسا مربوط ہونا کہ اُن کی حرکات اور گردشوں کے نظم میں ذرہ برابر فرق نہ آئے، یہ سب باتیں دیکھنے کے آپ خوگر رہے ہیں اس لئے انکو معمولی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہی چیزیں آپ کے سامنے پیش نہ ہوتیں اور اس کے بجائے کسی اور نظام سے آپ مانوس ہوتے، تو انہی سب باتوں کو آپ انتہا سے زیادہ بعید از عقل و قیاس سمجھتے، اور شدت کے ساتھ ان کے امکان سے انکار کرتے۔ فرض کیجیے کہ کرہ مریخ میں درخت نہ اُگتے ہوں اور وہاں کے لوگوں سے بیان کیا جائے کہ ایک ماشہ بھر کا بیج زمین میں دفن ہو کر درخت بنتا ہے، اور اپنے ابتدائی جرم سے کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ گنا بڑا ہو جاتا ہے، اور پھر اس میں سے ویسے ہی ہزاروں بیج پیدا ہوتے ہیں، تو یہ بات مریخ والوں کی نگاہ میں اتنی ہی حیرت انگیز ہوگی جتنی آپ کے نزدیک مرنے کے بعد پھر جی اٹھنے کی داستان حیرت انگیز ہے۔ وہ بھی اسی طرح کہیں گے کہ یہ تو ناممکن ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ عدم امکان کا فتویٰ علم کی بنا پر نہیں جہل کی بنا پر ہوگا۔ عقل کی رسائی کا نتیجہ نہیں نارسائی کا نتیجہ ہوگا۔ بس ایسا ہی حال آپ کے استبعاد کا ہے۔ اگر آپ اپنے استعجاب یا استبعاد کی حقیقت کو سمجھ لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کسی چیز کا آپ کی عقل و قیاس سے دور ہونا درحقیقت اس چیز کے غیر ممکن یا محال ہونے کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ جو چیزیں آج خود انسان ایجاد کر رہا ہے وہ آج سے سو برس

پہلے خود انسان کے نزدیک بعید از عقل و قیاس تھیں۔ مگر واقعات سے ثابت ہو گیا کہ ناممکن نہ تھیں، اسی طرح جن چیزوں کو آج انسان مستبعد سمجھ رہا ہے، وہ آج سے سو دو سو برس بعد خود انسان کے ہاتھوں وجود میں آئیں گی اور واقعات ثابت کر دیں گے کہ وہ ناممکن نہیں ہیں۔ پھر جب انسان کی عقل اور اس سے بعید یا قریب ہونے کی حقیقت یہ ہو تو کسی چیز کو محض اس بنا پر ناممکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس محدود عقل میں نہیں سماتی۔

کسی مخفی اور ماورا رحواس چیز کو ثابت کرنے کے لئے پہلا قدم یہی ہے کہ اس کا امکان ثابت کیا جائے چنانچہ قرآن مجید نے اپنے استدلال سے حیات اخروی کے استبعاد کو دور کر کے اس کو ممکن ثابت کر دیا اب دوسرا قدم یہ ہے کہ اس کی ضرورت ثابت کی جائے تاکہ عقل یہ تسلیم کرے کہ ایسی ایک چیز ضرور ہونی چاہئے اور اس کے عدم سے اس کا وجود اولیٰ ہے۔ (باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۶)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

(بسلسلۂ اشاعت ربیع الاول ۱۳۵۳ھ)

سرگذشت اناجیل بہرحال اناجیل اربعہ اور بقیہ کتب عہد جدید کسی کی بھی اصلی تصنیف ہوں اور کسی زمانہ میں بھی تصنیف ہوئی ہوں، الہامی ہوں خواہ مصنفین کی ذاتی تصانیف، اُن کے مذہبی تقدس کے تسلیم ہونے اور اُن کے قابل اعتماد ہونے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس بات کا کافی طور پر اطمینان کر لیا جائے کہ انکا اصلی اور ابتدائی وجود آج اپنی سچی صورت میں ہمارے سامنے باقی بھی ہے یا نہیں اور جو کتابیں آج ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی ہیں یا نہیں۔ اس امر کی تحقیقات کے لئے ضرورت ہے کہ :-

(۱) قدیم نسخوں کو ٹٹولا جائے، اُنکی قدامت کا حال دریافت کیا جائے پھر اُن سے موجودہ مروجہ نسخوں کا مقابلہ کیا جائے۔

(۲) تراجم کی صحت یا عدم صحت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔

(۳) بعض مصنفین قدیم نے اناجیل کے بعض مضامین کو اپنی تصانیف میں جگہ دی ہے جس سے عیسائی علماء اناجیل مروجہ کی قدامت وصحت پر دلیل لاتے ہیں۔ چنانچہ اس دعوی پر بھی تحقیقی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

قدیم نسخے اس بات پر سبھی علماء کا اتفاق ہے کہ انجیل کے جتنے اصلی نسخے تھے سب ضائع ہو چکے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔ چنانچہ متی کی انجیل (باب ۲۷ آیہ ۴۶) میں جو فقرہ عیسیٰ علیہ السلام کی زبان کا نکلا ہوا

درج ہے کہ "ایلی ایلی لما سبقتانی" (یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے کیوں مجھے چھوڑ دیا) وہ عبرانی زبان میں ہے۔ اسی سلسلہ کے مضمون نمبر ۲ میں بتلایا جا چکا ہے کہ بکثرت عیسائی علما تسلیم کرتے ہیں کہ متی کی انجیل عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ مگر آج وہ عبرانی نسخہ اس دنیا سے مفقود ہے اور اس کو غائب ہوئے بارہ سو برس سے زاید گذر چکے۔ اب یونانی زبان کے ترجمے ہی عہد جدید کی اصلی کتابیں سمجھی جاتی ہیں مگر ان قدیم یونانی نسخوں میں سے جو کہ تعداد میں بہت ہی کم ہیں کوئی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں بیان کیا جاتا اور ان کے چوتھی صدی کا ہونے میں بھی بہت کچھ اختلاف ہے۔ فرنیسس کرافورڈ برکٹ فاضل علوم دینیات و پروفیسر الہیات متعینہ کیمبرج یونیورسٹی انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا مطبوعہ سنہ ۱۹۲۹ء کی جلد ۳ میں زیر عنوان "بائبل" تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"بہت عرصہ ہوا کہ عہد جدید کے اصلی قلمی نسخے ضائع ہو چکے ہیں باستثنا چند منتشر اجزا کے جو سب کے سب شمالی مصر سے دستیاب ہوئے۔ یہی حشر عیسائیوں کی بقیہ دیگر قدیم قلمی کتابوں کا بھی ہوا جب چوتھی صدی عیسوی میں حکومت عیسائی ہو گئی اور چرچ قائم ہوا تو نسخوں کی باقاعدہ نقلیں شروع ہو گئیں جنہیں کوڈیکس کہتے ہیں۔ چوتھی صدی کے اس قسم کے صرف دو کوڈیکس اب باقی ہیں اور ان میں جو کچھ درج ہے اسی کو اس زمانہ میں پوری بائبل سمجھا جاتا تھا۔

ہارن صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :-

یونانی نسخے بہت کم ہیں جن میں عہد عتیق اور عہد جدید دونوں کی کتابیں موجود ہوں۔ اکثر میں صرف ۴ انجیلیں ہی پائی جاتی ہیں اور بعض نسخوں میں صرف حواریوں کے اعمال اور بعض میں اعمال اور پولوس کے نامے اور چند نسخوں میں صرف مشاہدات یوحنا۔ سب نسخے بالخصوص وہ جو زیادہ قدیم ہیں زمانہ کے دست مضرت سے یا غفلت سے ناقص ہو گئے ہیں۔ ان نسخوں میں پہلے کے لکھے ہوئے کو مٹا کر اس کی تصحیح کی ہے بعض جگہ خوب نہیں مٹایا کیونکہ اصلی لکھا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اصلی لکھے ہوئے کو بعد کی تصحیح پر ترجیح

دی جاتی ہے پہلے لکھے ہوئے کو کہیں تو اسطرح مٹایا ہے کہ الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے کہیں چاقو سے چھیلا ہے کہیں اسفنج سے پونچھ دیا گیا ہے اور اس جگہ دوسرے الفاظ لکھدیئے گئے ہیں اسطرح کا مٹانا چند حروف یا الفاظ تک محدود نہیں بلکہ کوڈیکس بیزی اور دیگر کتب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسطرح پوری کتابیں کی کتابیں صاف کرکے اُن پر دوسری کتابیں لکھدی گئی ہیں ۔ جہاں بسبب زمانہ دراز کے کوئی تحریر اوڑجاتی اُس کو اسی طرح رہنے دیتے اور بغیر زیادہ مٹانے کے اُسی پر دوسری تحریر لکھدیتے + + ++ ++ مدت تک یہ خیال رہا کہ یہ روش گیارہویں بارہویں تیرہویں اور چودھویں صدی تک رہی اور یونان میں بالتخصیص جاری رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ وحشت اور جہالت کی یہ قباحت زیادہ عرصہ تک قائم رہی اور رومیوں میں بھی پھیلی رہی ۔"

فن طباعت کی ایجاد سے قبل اور کاغذ کے وجود میں آنے اور ارزاں ہونے سے پیشتر کتابوں کی اشاعت میں جو دقتیں پیش آتی تھیں اُنکا ذکر اسی سلسلہ کے مضمون نمبر ا میں آچکا ہے ۔ اسی مضمون میں سرگذشت توریت کے زیر عنوان توریت کی جو آٹھ تباہیاں بیان کی گئی ہیں ۔ ان میں سے آخری پانچ بربادیوں میں جو کہ ولادت مسیح کے بعد واقع ہوئیں اناجیل اور بقیہ کتب عہد جدید بھی شامل ہیں ۔ حفاظ کے وجود کا نہ ہونا جو یہودیوں کی خامی کا باعث تھا ۔ عیسائیوں کی بھی خامی کا باعث رہا ۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ بعض پادریوں کے علاوہ کسی کو اپنے پاس انجیل رکھنے کی اجازت نہ تھی ۔ عوام الناس کو اس زمانہ میں انجیل پڑھنے تک کی ممانعت تھی ۔ سنہ ۱۵۲۲ء میں شہر لیپزک میں ایک کتب فروش جس کا نام ہرگاٹ تھا صرف اس جرم پر قتل کر دیا گیا کہ اس نے ایک انجیل فروخت کی تھی ۔ اسی جرم میں ایک دوسرے کتب فروش کی آنکھیں نکالی گئیں تھیں ۔ مارٹن لوتھر کے زمانہ سے انجیلوں کو شہرت ہوئی ہے مگر طباعت کی ایجاد کے بعد بھی کچھ عرصہ تک انجیلیں بہت گراں رہیں ہندی تواریخ کلیسا کے صفحہ ۲۲۲ پر لکھا ہے کہ فرانس میں جو انجیل کہ پانچسو (۵۰۰) روپیہ میں فروخت ہوتی تھی وہ ایجاد

طباعت کے بعد بھی وہاں ایک سو میں سے کم ہی دستیاب نہ ہوتی تھی۔ پھر ایک عیسائی تصنیف مرآت الصدق (صفحہ ۴۰ - ۴۹) کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کے واقعات بھی پیش آتے رہے ہیں۔ پراٹسٹنٹ عیسائیوں نے رومن کیتھولک عیسائیوں کی عداوت میں وہ تمام کتب خانے غارت کردیے جن کا ذکر جی۔ بیل رورد کرتا ہے۔ اُن کتابوں کو غرق کیا۔ اُن کے اوراق سے اپنے شمعدان اور جوتے صاف کئے۔ دوکانداروں اور صابون بیچنے والوں کے ہاتھ اونہیں فروخت کیا کہ وہ اُن سے پڑیاں بنائیں۔ سمندر پار کے جلد سازوں کے ہاتھ اُن کتابوں کو فروخت کیا اور وہ بھی کچھ سَو پچاس کی تعداد میں نہیں بلکہ جہاز کے جہاز لاد کر۔ مذہبی کتابیں عداوت باہمی کی بنا پر اس کثیر تعداد میں برباد ہوئیں کہ غیر اقوام کے لوگوں کو تعجب آتا تھا۔ اس نوع کے واقعات کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصلی کتابیں برباد ہوگئیں اور نقلی اور جعلی کتابوں نے اُن کی جگہ لے لی۔ ممکن ہے کہ ان جعلی کتابوں میں سب جھوٹ ہو یا کچھ سچ ہو اور کچھ جھوٹ۔ دونوں صورتوں میں وہ محققین کی نگاہ سے گرگئیں اور آج یورپ میں عیسائی جماعتوں ہی کے لوگ ان پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور انھیں ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔

قدیم عیسائی محققین نے اپنے زمانہ کے اُن قلمی نسخوں کو جو اصلی نسخوں کی نقلیں بیان کئے جاتے تھے کوشش بلیغ سے عبارات کا مقابلہ کرکے متعدد اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر گریس باخ (گریس بک) کے وضع کردہ قوانین کے مطابق عہد جدید کے یونانی نسخے تین اقسام میں تقسیم کئے گئے ہیں:۔

(۱) پہلی قسم الیگزنڈرین ہے جس کو مصری نسخہ بھی کہتے ہیں۔ اس قسم میں وہ تمام قلمی نسخے داخل ہیں جن کی مشہور عبارتیں الیگزنڈریہ (اسکندریہ) کے مورخین و مصنفین کی اُن عبارات سے مطابقت رکھتی ہیں جو اُن لوگوں نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔ ان مصنفین میں اوریجن اور کلیمنٹ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں مصنفین کے بعد مصریوں اور یونانیوں نے اسی نسخہ کو اختیار کرلیا۔

(۲) دوسری قسم آکسی ڈنٹل یا ویسٹرن یعنی مغربی نسخہ کی قرار دی جاتی ہے۔ اس قسم کے نسخے افریقہ اٹلی اور مغربی یورپ میں مروج ہوگئے۔

۳۔ تیسری قسم بازنطائین یا اورینٹل یعنی مشرقی نسخہ کی ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان محققین کے ہاتھ ایک ایسا نسخہ آگیا جو متذکرہ بالا دونوں نسخوں سے مختلف تھا۔ یہ نسخہ قسطنطنیہ میں مقبول ہوگیا قسطنطنیہ کو اُس زمانہ میں بازنطائین کہتے تھے اور وہ پوپ کا پائے تخت تھا۔ چنانچہ قرب وجوار کے صوبے اور ممالک اور وہ تمام لوگ جو قسطنطنیہ کے پوپ کے روحانی تسلط کے مطیع تھے بازنطائین نسخہ کے بھی مطیع ہوگئے اس نسخہ کی عبارتیں یونانی ولگٹ کے نسخہ سے بہت مطابقت رکھتی ہیں بسٹر ہیکلس نے بازنطائین نسخہ کو قدیم وجدید کی تفریق سے بھی منقسم کیا ہے مگر کوئی قاعدہ مقرر نہیں جس کی روسے ہم قدیم وجدید میں تمیز کرسکیں۔

متذکرہ بالا تین اقسام پر مسٹر ہیکلس نے ایک چوتھی قسم کا اضافہ کیا ہے جسے وہ اڈیسن نسخہ ہیکیٹو یا پرانا سُریانی زبان کا ترجمہ عہد جدید قرار دیتے ہیں۔ اس نسخہ میں متذکرہ بالا تینوں نسخوں سے بہت اختلاف ہے

بعض پادریوں نے زمانہ کے اعتبار سے ان نسخوں کی ترتیب کی ہے مثلاً پروفیسر ہگ نے اور بعض نے دیگر اعتبارات سے انہیں تقسیم کیا ہے مقصد ان تقسیمات وتحقیقات کا یہ تھا کہ اصلی اور غیر اصلی نسخوں میں امتیاز پیدا ہوسکے اور صحیح عبارات کو غلط عبارات سے تمیز کیا جاسکے مگر اس میں ناکامی رہی اور پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ ہارن صاحب بالآخر تنگ آکر لکھتے ہیں کہ اب کسی نسخہ میں مصنف کی ساری عبارت درج نہیں بلکہ تمام جہان کے نسخوں میں وہ پھیلی ہوی ہے بینٹلی صاحب لکھتے ہیں کہ مصنفوں کے اصلی نوشتے اب موجود نہیں ہیں اس لئے ان کے تمام اصلی الفاظ کسی ایک نقل میں نہیں ملتے لیکن جملہ نقول کے مقابلہ سے دریافت ہوتے ہیں۔ پادری فانڈر صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"اب ورتانخا لیکہ اصل نسخہ موجود نہ رہا اور قدیم کتابوں کا شاید ایک بھی اصل نسخہ ابتک باقی نہ رہا ہو، پس ان غلطیوں کے تصحیح کرنے کی کوئی اور راہ اور تدبیر نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی سب نقلیں نزدیک و دور سے جمع کریں اور عالم وفاضل زباندان اُن سب کو مقابلہ کرکے اس راہ سے تصحیح کریں اور جتنے نسخے زیادہ ہوں تصحیح

بھی اتنی ہی آسان ہو گی!!

(اختتام دینی مباحثہ)

ہم یہ کہتے ہیں کہ مقابلہ کے لئے نسخے خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں جب اصلی نسخہ کا وجود ہی مفقود ہے تو یہ ظنی تصحیحات کیونکر معتبر ہو سکتی ہیں۔

کوڈیکس اب ذرا اُن قدیم قلمی نسخوں پر بھی نظر ڈال لینے کی ضرورت ہے جنہیں کوڈیکس کہتے ہیں۔ اور جن کی قدامت کے زعم پر پادری عوام کے سامنے اناجیل مروجہ کی صحت و صداقت کا بڑے زور و شور سے دعویٰ کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل حالات بیشتر ہارن صاحب کے انٹروڈکشن سے ماخوذ ہیں:-

(۱) کوڈیکس الیکزنڈرین یعنی نسخہ سکندریہ۔ اس نسخہ کو ۱۶۲۸ء میں قسطنطنیہ کے لاٹ پادری نے چارلس اول شاہ انگلستان کو نذر کیا۔ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ عیسائی علماء مصححین انجیل نے قدامت کے لحاظ سے اسی نسخہ کو اول درجہ میں رکھا ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے تین جلدوں میں عہد عتیق کی چھوٹی بڑی ساری کتابیں شامل ہیں اور چوتھی جلد میں عہد جدید کی کتابیں۔ اس جلد میں کلیمنٹ کا نامہ اول بنام کارنتھینز اور زبور سلیمان بھی درج ہیں جنہیں عیسائی اب جعلی قرار دیتے ہیں۔ عہد جدید کی کتابوں میں سے متی کی انجیل ابتدا سے باب ۲۵ آیہ ۶ تک اور یوحنا کی انجیل باب ۶ آیہ ۵۰ سے باب ۸ آیہ ۵۲ تک اور نامۂ دوم قرنتیوں کو باب ۴ آیہ ۱۳ سے باب ۱۲ آیہ ۷ تک غائب ہے۔ زبور سے پہلے اتھانی سیش کا ایک نامہ بنام مارسلینس زائد ہے اور اس کے بعد ایک فہرست ان زبوروں کی بھی درج ہے جو رات دن کے ہر گھنٹہ کی نماز میں استعمال کی جائیں۔ چند گیت بھی اس فہرست میں درج ہیں جن میں سے گیارہواں گیت حضرت مریم کی تعریف میں ہے بعض عیسائی عالموں نے اس نسخہ کی بہت تعریف کی ہے اور بعض نے انتہا درجہ کی مذمت۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ نسخہ کسنے لکھا کب لکھا اور کہاں لکھا گیا۔ گریب آور اسکا نیر اسے اختتام صدی چہارم سے قبل بتلاتے ہیں۔ وِستین پانچویں صدی کا، ڈاکٹر سیملر ساتویں صدی کا، سکیس آٹھویں صدی کا، اور اُدِن

دسویں صدی کا بتلاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دسویں صدی صدی عیسوی میں یورپ انتہا درجہ کی تاریکی اور جہالت میں غرق تھا اور نفسانیت جھوٹ دغا فریب اور جعل سازی کی گرم بازاری تھی۔

۲- کوڈیکس واٹیکن یعنی پوپ کے محل (روم) دار النسخہ۔ عیسائی علماء کے نزدیک اس کا دوسرا نمبر ہے رومی ترجمہ سیپٹو اجنٹ (مطبوعہ ۱۵۹۰ء) میں اس نسخہ کا متن ہے اور رومی نسخہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ۔ یہ نسخہ ۳۸۷ء سے قبل یعنی چوتھی صدی کے آخر کا لکھا ہوا ہے۔ پروفیسر ہگ کا خیال ہے کہ یہ چوتھی صدی کی ابتدا کا ہے لیٹ مارش پانچویں صدی کے آخر کا بتلاتے ہیں مونت فاکن اور بلین کاین پانچویں یا چھٹی صدی کا کہتے ہیں۔ اور دیوین صاحب زور دیتے ہیں کہ شیر یہ ساتویں صدی عیسوی کا ہے مونت فاکن تو اس امر پر بھی بہت زور دیتے ہیں کہ ایک بھی یونانی نسخہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل کا لکھا ہوا نہیں ہے، نہ کوڈیکس الیگزنڈرین اور نہ کوڈیکس واٹیکن۔ اور یہ دونوں نسخے عیسائیوں کے نزدیک موجودہ تمام نسخوں میں قدیم ترین ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانہ میں اس زمانہ کے اہل کتاب کے پاس توریت وانجیل کے جو نسخے تھے وہ بھی اب غائب ہیں اور قرآن شریف میں توریت وانجیل کے جو حوالجات آئے ہیں ان کا ان کتابوں پر صادق آنا لازمی نہیں جو آجکل توریت وانجیل کے نام سے مشہور ہیں۔ اس پہلو پر تفصیلی بحث انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔

کوڈیکس واٹیکن کے حصہ عہد عتیق سے کتاب پیدائش کے چھیالیس ابواب (از باب اول تا باب چھیالیس) اور زبور کے بتیس ۳۲ ابواب (از باب ۱۰۵ تا ۱۳۷) غائب ہیں۔ عہد جدید میں عبرانیوں کے باب ۹ آیہ ۱۴ سے آخر نامہ تک اور دو نامے بنام تمتاؤس اور نامجات بنام طیطس اور فلیمان اور مشاہدات یوحنا کی پوری کتاب غائب ہے مگر پندرہویں صدی میں کسی نے مشاہدات اور آخر نامہ عبرانیاں لکھکر کوڈیکس میں

شامل کر دیا ہے۔ اس نسخہ میں کاٹ چھانٹ بہت ہے۔ بہت جگہ چھپایا گیا ہے۔ پھر درست کیا گیا ہے۔ یہ کوڈیکس جس لاطینی ترجمہ (یعنی سیپٹو اجنٹ) کی نقل ہے اُس کے متعلق وارڈ صاحب اپنی کتاب اغلاطنامہ مطبوعہ ۱۸۴۱ء کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں کہ مشرق کے ملحدوں نے اس میں تحریفیں کی ہیں۔ ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"یہ بات ضرور یاد رکھی جائے کہ کوئی ترجمہ مثل ترجمہ لاطینی کے خراب نہیں کیا گیا۔ اس کے نقل کرنے والوں نے بہت ناجائز خودسری سے عہد جدید کی ایک کتاب میں دوسری کتاب کے فقرے داخل کر دیے اور حاشیہ کی عبارت کو متن میں درج کر دیا ہے۔"

باوجود اس اہمیت کے جو مذکورہ بالا دونوں کوڈیکسوں کو دی جاتی ہے تعجب ہے کہ ان دونوں میں اس درجہ اختلاف ہے کہ ایک نام کی دو کتابوں میں ایسا اختلاف کہیں نظر نہیں آتا۔ ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ جہان میں کسی کتاب کے دو نسخے ایسے مختلف نہیں جیسے کہ کوڈکس الیگزنڈرین اور کوڈیکس واٹیکن ہیں پادری فانڈر صاحب اور دیگر عیسائی محققین کو بھی یہ شکایت ہے۔ جب اہم ترین نسخوں کا یہ حال ہے تو کم تر نسخوں کے ذکر سے کاغذ کو رنگین کرنا لا حاصل ہے تاہم اطمینان مزید کے لئے چند دیگر کوڈیکسوں پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے۔

۲۔ کوڈکس سینا ٹکس یعنی نسخہ سینا۔ اس نسخہ کی آج کل خوب دھوم مچ رہی ہے اور انگلستان نے اسے جدید اہمیت دے رکھی ہے اس کی داستان بھی عجیب ہے۔ جرمنی کا ایک مشہور عالم ڈاکٹر ٹشنڈرف ۱۸۴۴ء میں موئٹ سینائی یعنی کوہ طور کی ایک مشہور عیسوی خانقاہ سینٹ کیتھرین کے کتب خانہ کی سیر کر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ خدام خانقاہ آگ روشن کرنے کے لئے قلمی اوراق کا ڈھیر ایک ٹوکرے میں لائے ہیں۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر چند اوراق ٹوکرے سے نکال کر دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ تو بائیبل کے یونانی نسخہ سبعینیہ کی کوئی پرانی نقل ہے۔ بیتاب ہو گیا کیونکہ نسخہائے قدیم کا وہ دلدادہ تھا۔ فوراً راہبوں سے درخواست کرکے چالیس اوراق ٹوکری میں سے اُس نے اور نکال لئے اس کے انداز بیتابانہ کو دیکھ کر راہب سمجھ گئے کہ ٹوکرے میں اوراق کا یہ ڈھیر جو

آگ میں جھونکے جانے کے لئے آیا ہے غالباً کوئی قیمتی چیز ہے اور کیا عجب کہ کسی موقعہ پر افزونی دولت کا باعث ہو۔ انہوں نے اس ٹوکرے کو اٹھا کر حفاظت سے رکھ لیا اور ڈاکٹر کی مزید درخواست پر اسے مزید اوراق دینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر نے جرمنی پہنچ کر اوراق بقیہ کے حصول و تحفظ کی کوشش شروع کر دی۔ پندرہ برس کی مسلسل کوشش کے بعد وہ زار روس کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا اور ۱۸۵۹ء میں وہ پھر اس خانقاہ میں آیا۔ اس مرتبہ شاہی سفیر کی حیثیت سے آیا۔ بڑی کوشش اور بڑی مشکل سے کامل نسخہ کی تلاش کر کے راہبوں کو رضامند کیا اور نسخہ اپنے ہمراہ لیکر روس کے پایۂ تخت میں آیا۔ یہ نسخہ وہاں کے شاہی کتب خانہ میں رہا۔ مگر سال گذشتہ بالشوکس نے اس نسخہ کو ایک لاکھ پونڈ قیمت پر حکومت انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا اس قیمت کا نصف حکومت اپنے پاس سے ادا کریگی اور نصف رعایا سے چندہ لیا جائیگا۔ برٹش میوزیم میں اب یہ نسخہ آگیا ہے اور چونکہ لوگوں سے ابھی روپیہ وصول کرنا باقی ہے اس لئے اس کی قدامت اور تعریف کے اشتہارات کا آج کل زور ہے۔ ٹائمس آف انڈیا کا بیان ہے کہ اس کوڈکس میں عہد عتیق کی کتابوں کا بڑا حصہ ہے جو کہ یونانی زبان میں ہے نہ کہ عبرانی میں لیکن عہد جدید کی پوری کتابیں ہیں جنھیں انجیل برنباس اور "دی شیپرڈ آف ہرمس" بھی شامل ہیں۔ اسی ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت مورخہ ۱۶ ؍ فروری ۱۹۳۴ء کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے بعض حلقوں میں اس کوڈکس پر آوازے بھی کسے جا رہے ہیں اور بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے اور کانسٹینٹائن سائمونائیڈز کا تیار کیا ہوا جعل اور اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ کتاب ہے۔ یہ شخص یونان کا رہنے والا اور انیسویں صدی کا مشہور جعلساز تھا۔ اس کا پیشہ ہی جعلسازی تھا۔ صورت سے اس کے وجاہت ٹپکتی تھی۔ ماتھا اس کا بہت چوڑا تھا۔ قدیم قلمی تحریروں کے متعلق معلومات میں اور ان کی نقل کرنے کے فن میں دنیا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ ہزاروں قلمی نسخے اس کے قبضہ میں تھے جو اس نے مختلف عیسائی خانقاہوں سے حاصل کئے تھے۔ ان قلمی نسخوں کے ذریعہ وہ لوگوں کو دھوکا دیتا تھا اور انھیں اپنا گرویدہ بنا کر اپنے ہاتھ کی جعلی تحریروں کو بڑی بڑی قیمتوں پر ان کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ ایک موقع پر وہ لینز

میں گرفتار بھی ہوا تھا۔ اور برلن میں اوس پر مقدمہ چلا تھا مگر جرم ثابت نہ ہو سکا اور عدالت مجبور ہو گئی کہ اسے چھوڑ دے۔ اس کے بعد اُس نے بڑے پیمانہ پر سیاحت شروع کر دی اور بڑے بڑے کتب خانوں کی اس نے سیریں کیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقعہ پر وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ کوڈیکس سینائیٹیکس میری ہی کاریگری کا نمونہ ہے۔

۴۔ کوڈیکس ایمبروسینیس۔ ساتویں صدی کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ انداز عبارت شہادت دیتا ہے کہ زمانہ مابعد کے کسی شخص نے اس میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

۵۔ کوڈیکس افرکی یا کوڈیکس رجی آس۔ یہ نسخہ مصر میں لکھا گیا۔ عہد جدید کے بہت سے مقامات کی عبارت اُڑی ہوئی ہے بشپ مارش کی تحقیقات کی رو سے ساتویں صدی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ کوڈیکس بیزی۔ اس میں چار انجیلیں اور اعمال کی کتاب ہے۔ چھیاسٹھ (۶۶) ورق اس میں بہت پھٹے ہوئے اور خراب ہیں۔ دس ورق کسی نے بعد میں لکھکر لگائے ہیں۔ متی کے پہلے باب کی بیس آیتیں غائب ہیں۔ زمانۂ تحریر میں اختلاف ہے۔ بعض دوسری صدی بعض پانچویں بعض چھٹی اور بعض ساتویں کا لکھا ہوا نسخہ بیان کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر گریساخ اسے بارہویں صدی کا لکھا ہوا بیان کرتے ہیں۔ اس نسخہ میں وقتاً فوقتاً اصلاحیں ہوتی رہی ہیں جن پر تفصیلی بحث گریساخ نے کی ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں یہ نسخہ موجود ہے۔

(۷) کوڈیکس کارس وارنس۔ بارہویں صدی کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ عہد جدید کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ باستثنائے مشاہدات یوحنا جس نسخہ سے اسے نقل کیا گیا ہے اس کے حاشیہ پر جو عبارت بطور شرح کے لکھی تھی وہ اس نقل میں متن کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے۔

اس سے زائد کوڈیکسوں اور پرانے قلمی نسخوں کے حالات دریافت طلب ہوں تو ڈاکٹر گریساخ اور میکالس کی کتابوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

اختلافات مابعد | قدیم نسخوں کی جب یہ کیفیت ہے تو لقول ؟ بعد کہ اختلافات سے محفوظ رہنا کیونکر تھا میں

میں آسکتا ہے۔ جرمنی کے مشہور ڈاکٹر مِل نے عہد جدید کے چند نسخے جمع کر کے مقابلہ کیا تو عبارت میں تیس ہزار اختلافات نکلے۔ جان جمیس ولیسطین نے مختلف ممالک میں پھر کر بہت بڑی تعداد میں نسخوں کا مقابلہ کیا تو دس لاکھ اختلافات پائے۔ ان میں سے بکثرت اختلافات تو ایسے ہیں جنھیں قراءت اور کتابت کا اختلاف کہہ سکتے ہیں لیکن ایسے اختلافات بھی کچھ کم نہیں ہیں جن سے معنی میں بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ان اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ بقول ہارن صاحب کے وجوہ اختلافات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ان نسخوں میں غلطیوں کا ہونا جن سے نقلیں کی جاتی تھیں۔

۲۔ ناقلوں کی غفلت، غلطیاں اور جہالت، ناسمجھی کی بنا پر کبھی اصلی نسخے کے علامات و اشارات کو نہ سمجھنا، کبھی متن اور حاشیہ پر کی شرح میں امتیاز نہ کرنا اور انہیں خلط ملط کر دینا۔

۳۔ کبھی بظاہر اختلافی عبارت کو تطبیق دینے کی غرض سے کبھی کسی اعتراض کے دفع کرنے کی نیت سے، کبھی اپنے نزدیک اصلاح کی ضرورت سمجھکر کبھی عبارت میں حسن مزید پیدا کرنے کی کوشش میں اپنی طرف سے نقلوں میں تصرف کرنا اور عبارت کو تبدیل کر دینا۔

۴۔ کبھی اپنے مذہبی فرقے کی تائید میں جھوٹ سے مدد لینے کو ثواب سمجھکر عبارات کو تبدیل کر دینا اور اپنے مطلب کا بنا لینا۔

ترجموں کی کیفیت ترجموں کی صحت و عدم صحت پر جداگانہ عنوان کے تحت میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جتنی خرابیاں بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب ترجموں ہی سے متعلق ہیں۔ اصلی زبان میں تو بائبل کا وجود ہی نہیں رہا۔ یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے اصل کے نہ ہونے اور ترجموں پر دین کا دار و مدار ہو جانے ہی کا نتیجہ ہے۔ تاہم اگر ترجمہ در ترجمہ کی غلطیوں کی بھی فہرست پیش کرنے کا قصد کیا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔

مصنفین قدیم کی شہادت علماء عیسوی کا دعوی ہے کہ مصنفین قدیم مثلاً کلیمنس وغیرہ اپنی تصانیف میں اناجیل کے بعض فقرات درج کرتے ہیں جس سے اناجیل مروجہ کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم سر دست کلیمنس کی تصر

ایک مثال کو لے کر دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ کیونکہ اس ایک مثال سے بقیہ مثالوں پر بھی روشنی پڑے گی بوجہ اس کے کہ وہ ساری مثالیں تقریباً یکساں ہیں۔

کلیمنس کو روم کا اسقف بیان کرتے ہیں۔ اُس نے ایک خط قرنتیوں کے نام لکھا تھا جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "جو مسیح کو پیار کرتا ہے اس کو چاہئے کہ اُس کے حکم پر عمل کرے"۔ مسٹر جونس کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کلیمنس نے یوحنا باب ۱۴ آیہ ۱۵ کے حوالہ سے یہ فقرہ لکھا ہے۔ اول تو یہاں مطابقت پوری نہیں۔ دوسرے حوالہ کا کوئی قرینہ نہیں۔ اگر قدرے مطابقت معنی کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعی کلیمنس نے قرنتیوں کے نام کوئی خط بھیجا بھی تھا یا یہ سب فرضی واقعہ ہے۔ اگر بھیجا تھا تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ خط اپنی اصلی صورت میں آج بھی موجود ہے اور یہ فقرہ اُس میں بعد کا الحاق نہیں۔ جب اناجیل تک میں الحاق ہو گیا تو ایک معمولی اسقف کے خط میں الحاق کا ہو جانا کونسی بڑی بات ہے۔ بعد اُس کے یہ دیکھنا چاہئے کہ خط کی تاریخ کیا ہے۔ اس کی تاریخ کے متعلق اختلاف ہے۔ سنہ ۶۴ء بھی بیان کیا جاتا ہے اور سنہ ء اور سنہ ۹۱ء بھی اور سنہ ۹۵ء بھی۔ بہر حال کلیمنس کے خط کے سال تحریر نے سنہ ۹۵ء سے تجاوز نہیں کیا۔ اور تفسیر ہارن صاحب کی، و نیز مسٹر جونس ہی کا یہ قول ہے کہ یوحنا نے اپنی انجیل سنہ ۹۸ء میں لکھی۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلیمنس کے خط لکھتے وقت یوحنا کی انجیل کا وجود ہی کہاں تھا کہ اُس کے حوالہ سے کوئی عبارت اس خط میں لکھی جاتی۔ چنانچہ اسی بنا پر بشپ پترس صاف اقرار کرتے ہیں کہ کلیمنس نے یہ فقرہ انجیل سے نہیں لکھا۔ اگر تحریر خط کے زمانہ میں اس انجیل کا وجود ہونا بھی تب بھی اس نوع کی مطابقت سے یہ لازم نہ آتا کہ وہ فقرہ انجیل سے لیا گیا ہے۔ صاحب اکسیہومو لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اخلاق مندرجہ عہد جدید جن پر عیسائی بڑا فخر کرتے ہیں لفظاً لفظاً کنفیوشس کی کتاب اخلاق سے جو قریب چھ سو برس قبل مسیح تصنیف ہوئی منقول ہیں۔ مثلاً اخلاق ۲۴ کے ذیل میں یوں مرقوم ہے کہ "دوسرے سے وہ کر جو تم چاہتے ہو کہ وہ تم سے کرے اور نہ کر وہ جو تم نہیں چاہتے کہ وہ تم سے کرے اور تم کو صرف اسی خلق کی حاجت ہے اور یہ سب خلقوں کی اصل ہے"۔ اب یہی مضمون متی باب ۲۲ آیہ ۳۹ و ۴۰ میں بھی درج ہے

جو عیسائیوں میں نہایت عالی اور گولڈن رول اور اصول زرین سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ انجیل کا یہ مضمون کنفیوشس سے ماخوذ ہے تو عیسائیوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ انجیلوں میں اور بھی بہت سے مضامین ہیں جن کے مقابلہ میں ہم معنی مضامین اُن کتابوں سے پیش کئے جاسکتے ہیں جو ولادت مسیح کے قبل سے اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اگر یہ کہدیا جائے کہ انجیلوں کے یہ سارے مضامین ان کتابوں سے ماخوذ ہیں تو عیسائی حضرات کو بڑی مشکل کا سامنا پیش آئے گا۔ کیونکہ وہ خود اسی نوع کے دلائل پیش کرنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ توارد یا مطابقت مضامین سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک مصنف دوسرے مصنف کے ان تحریر کردہ مضامین سے آگاہ تک ہو۔

اس بارہ میں عیسائی علماء کے جملہ استدلالات اسی نوع کے ہیں چنانچہ ان سب کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے۔ (باقی)

اعجاز القرآن

یہ ایک بہت ہی نایاب رسالہ ہے علی بن عیسیٰ الرمانی اس کا مصنف ہے (المتوفی ۳۸۴ھ) اب تک اس کے ایک ہی نسخہ کا پتہ چلا تھا جو قسطنطنیہ کے کتب خانہ میں تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب احراری پی ایچ ڈی نے اپنے قیام جرمنی کے زمانے میں بڑی دقتوں سے اپنے ایک پروفیسر کے ذریعہ اس کا فوٹو منگوایا اور اب مقام شکر ہے کہ مکتبہ جامعہ نے یہ قیمتی کتاب شایع کردی ہے اور گویا اسے زمانے کی دستبرد سے محفوظ کرلیا ہے۔ کتاب عربی میں ہے اور اس میں قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز کے متعلق عجیب و غریب نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ مکتبہ نے اسے نہایت اہتمام سے بہترین کاغذ پر ٹائپ میں شایع کیا ہے قیمت صرف ۸ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

قرآن کی دولت

از جناب مولانا عبداللہ العمادی

در آشیان ما پر و بال ہما رسید
ہر جا رسید سایۂ دولت زما رسید

(۱)

قرآن کریم ایک لازوال خزینہ ہے ایک لافنا گنجینہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خزانہ عامرہ سے ہم کیونکر فائدہ اٹھائیں کیا صورت ہو کہ یہ گنج شائگاں ہمارے حق میں رائگاں نہ رہے؟ اس سوال کا جواب ہم کو دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قرآن کریم خود اس کے جواب کا اعلان کر چکا ہے۔ سورۂ ص میں ہے۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيَاتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورہ ۳۸، رکوع ۳ آیت ۲۸)

برکت والی کتاب ہم نے تمہاری طرف اس غرض سے اتاری ہے کہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر و تفکر کریں اور جو عقل رکھتے ہیں اس سے نصیحت پکڑیں۔

سورۂ زمر میں ہے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (سورہ ۳۹۔ رکوع ۳۔ آیت ۳۹)

ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں سب ہی طرح کی مثالیں دی ہیں کہ شاید لوگ نصیحت پکڑیں۔ ایسا فصیح قرآن جس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں شاید یہ لوگ اس سے متقی بنیں۔

کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نزول قرآن کی غرض یہی تھی کہ لوگ اس کو پڑھیں، اس کی تعلیمات کا

مفہوم سمجھیں۔ اُن میں غور کریں نصیحت پزیر ہوں۔ اور تقوی سے جو تہذیب اخلاق وتزکیۂ نفس کا انتہائی درجہ ہے۔ اپنے آپ کو اپنی قوم کو اپنی قومی معاشرت کو آراستہ بنائیں؟

تمکو بارہا تعجب ہوا ہوگا کہ مسلمان پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ قرآن کا تقدس واحترام اس زمانہ میں بھی مسلمانوں پر حکمراں تھا اور آج بھی ہے۔ نمازیوں سے جب بھی مسجدیں آباد تھیں اور اب بھی کم وبیش ویران نہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی دینی ودنیوی ترقیات کو۔

آنچہ از مبدءِ فیاض رسد آن من است

کا دعوٰی تھا، اور آج کل کے"

پراگندہ روزی پراگندہ دل

مسلمان تصویر تنزل بنے ہوئے۔

نیا فتم کہ فروشند بخت در بازار

کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔

لیکن اس تعجب کیساتھ تم نے کبھی اس پہلو پر بھی غور کیا کہ بے شبہ اسلام کا مدار صرف قرآن پر ہے اور قرآن دین ودنیا کی ترقی کا سب سے بڑا حامی ہے مگر جب اس کی تعلیمات سے ہم آگاہ ہی نہیں اور قوم کو اس کا نمونہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ تو یہ غرض حاصل ہو تو کیونکر ہو۔

(۳)

صحابہ وتابعین کی ملکی اخلاقی وعلمی فتوحات کا یہ سبب نہ تھا کہ وہ ہم سے زیادہ طاقتور تھے بلکہ اصلی سبب یہ تھا کہ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۔

(سچے مسلمان تو بس وہی ہیں کہ جب خدا کا نام لیا گیا تو ان کے دل دہل گئے اور جب آیات الٰہی

ان کو پڑھ کر سنائے گئے تو اُن کے ایمان اور بڑھا دے وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (سُورۃ الانفال رکوع ۱۔ آیت ۲)۔

یہی چیز تھی جس نے اُن کی قوت ایمانی وسیع کر رکھی تھی اور مغفرت و رزق کریم (عزت و آبرو کی روزی) نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ خدا کی تمام نعمتیں جب ہمارے ہی لئے ہیں تو ہم ان کے حاصل کرنے کے لئے جد و جہد سے بےفکر کیوں رہیں۔

ہم میں اور اُن بزرگوں میں تمام باتیں بظاہر تشابہ ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآن کریم کے حقیقی مفہوم سے آگاہ تھے اور اس کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے اور ہم نہ اس کی حقیقت ہی سے آگاہ ہیں اور نہ اس پر عمل ہی کرتے۔

شقیق بن سلمہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کی ہے کہ:۔

کان الرجل منا اذا تعلم عشر آیات	ہم لوگ جب قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تو جب تک
لم یجاوزھن حتی یعرف معانیھن	اُن کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو لیتے اور اُن پر عمل نہ کرتے
والعمل بھن [1]	آگے نہیں بڑھتے تھے۔ [1]

ابو عبد الرحمن متعدد صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ

تعلمنا القرآن والعمل جمیعاً [2]	ہم لوگوں نے قرآن اور اُس پر عمل کرتے رہنے کی تعلیم سب کی سب ایک ہی ساتھ حاصل کی [2]۔

اس تصریح کو دیکھو اور پھر اپنی حالت کا اندازہ کرو۔

"کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانے کو" قرآن کریم سے جو بیگانگی ہم کو اب ہے اور جس تنزل میں ہم آج مبتلا ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے مشکل یقین آسکتا ہے کہ ہم میں بھی کبھی تمدن رہا ہوگا۔ اور اُس تمدن کی بنیاد قرآن نے ڈالی ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس قطرے کی ہم ایک ننھی سی جان دیکھ رہے ہیں ایک زمانے میں وہی "طوفان در بغل" تھا اور اسی نے دریا میں روانی پیدا کی تھی"۔

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۱ صفحہ ۲۶ (طبع میمنیہ مصر) [2] ابن جریر صفحہ ۲۷

—۳—

اسلام نے جس تمدن سے زمانہ کو روشناس کیا تھا اس کی عمارت قرآن ہی کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان اپنے عہد تمدن میں قرآن کے حقائق و معارف پر زور دیں دنیا کو اس کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے انتہائی کوشش کے ساتھ اس کی تعلیمات کو پھیلائیں اور ان کے مفہوم کو عام کریں اس غرض کے لئے دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کریم کی بیشمار تفسیریں تالیف ہوئیں جن میں صرف ایک عربی زبان کو لو تو کئی تفسیریں نکلیں گی۔ ان میں بعض تفسیروں کی وسعت بیان نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

مثلاً:- کتاب الاستغناء	شیخ ابوبکر محمد بن علی بن احمد المتوفی ۴۰۹ھ نے ایک سو جلدوں میں یہ تفسیر تالیف کی تھی [۱]
کتاب التحریر والتحبیر	اس کی پچاس سے زائد جلدیں ہیں [۲]
تفسیر ابن الجوزی	ستائیس جلدوں میں ہے [۳]
تفسیر ابن النقیب	کچھ اوپر پچاس جلدوں میں ہے [۴]۔
تفسیر الادفوی	علامہ ادفوی روم کے نامور عالم تھے۔ یہ تفسیر انھوں نے ۱۲۰ جلدوں میں لکھی تھی۔ [۵]
تفسیر الاصبہانی	ابوسلم اصفہانی جن کی تفسیر کے اقتباسات جا بجا تفسیر کبیر میں درج ہیں اور امام رازی اکثر مقامات پر ان کے ثناخوان رہتے ہیں۔ اس تفسیر کے وہی مؤلف ہیں [۶] اس کی تیس (۳۰) جلدیں تھیں۔

---

[۱] کشف الظنون جلد ا صفحہ ۹۲۔ (طبع قسطنطنیہ)
[۲] کشف الظنون جلد ا صفحہ ۲۵۷؁
[۳] ۔۔ ۔۔ جلد ا ۔۔ ۳۰۴؁
[۴] کشف صفحہ ۳۰۵؁
[۵] ۔۔ صفحہ ۳۰۵۔
[۶] کشف صفحہ ۳۰۶؁

تفسیر سبط ابن الجوزی	تین جلدیں ہیں [1]
تفسیر القزوینی	تین سو جلدوں میں ہے [2]
کتاب الجامع فی التفسیر	تیس جلدوں میں ہے [3]۔
تفسیر حدائق ذات بہجۃ	پانسو جلدوں میں ہے [4]

اس کمال وسعت کو دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تفسیر قرآن کریم کی موسوعات یا دائرۃ المعارف (سائیکلوپیڈیا) نہ رہی ہوں گی۔ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں کہ کسی کتاب پر اتنی توجہ کی گئی ہو اور اس کے احکام وضوابط کی تحقیقات میں اس قدر شرحیں اور تفسیریں تالیف ہوئی ہوں۔ اور پھر بھی زمانہ کے حقیقت شناس حلقوں سے یہی آواز آرہی ہو کہ القرآن لاتفنی عجائبہ ولا تنقضی غرائبہ (قرآن کے عجائب و غرائب ختم ہونے ہی کو نہیں آتے)۔

——— ۳ ———

قرآن میں اخلاق بھی ہے اور فلسفۂ اخلاق بھی لیکن انداز بیان اس قدر دل آویز دلنشین ہے کہ ان علوم کو خواہ کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر طبع سلیم کا یہی اقتضا رہتا ہے کہ آیات قرآنی کان تک پہونچیں اور دماغ سے ہوتی ہوئی دل میں گھر کرلیں۔ ابتدائی صدیوں کے مفسروں اور ان کی تفسیروں کو دیکھو اُن میں نہ منطقی دلائل ہیں۔ نہ فلسفی اصطلاحات ہیں۔ نہ علوم ہیأت و ریاضت وطبیعت کے زور سے استدلال کو طاقتور بنانے کا شائبہ ہے۔ صاف صاف باتیں ہیں اور عملی پہلو لئے ہوے ہیں۔

---

[1] کشف صفحہ ۳۰۹۔

[2] کشف صفحہ ۳۱۴۔

[3] کشف صفحہ ۴۸۶۔

[4] کشف صفحہ ۴۲۱۔

شقیق بن سلمہ اور ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیؓ ابن ابی طالب نے اپنے عہد خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو امیر الحج بنا کر بھیجا تھا۔ ابن عباسؓ نے خطبۂ حج کو اس انداز سے بیان کیا اور سورۂ نور کی اس طرح تفسیر فرمائی کہ کفار ترک و روم اگر اسے سنتے تو مسلمان ہوجاتے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی ایک مرتبہ ایسی معنی خیز و موثر تفسیر کی کہ ایک شخص بے اختیار چلا اٹھا کہ لو سمع ھٰذا الدیلم لاسلمت (کفار دیلم اگر اس کو سنتے تو یقیناً مسلمان ہوجاتے)[1]

یہ صرف خیال ہی خیال نہ تھا بلکہ واقع میں نامسلمان قوموں کو جب کبھی تعلیمات قرآنی کے سننے اور سمجھنے کا اتفاق ہوتا پھر ان کے مسلمان ہوجانے میں کوئی تامل نہ رہ جاتا۔ تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ متاخرین نے افسوس ہے کہ یہ خصوصیت بالکل ترک کر دی۔

(۵)

آجکل کی تفسیروں میں تمھیں معانی و بیان کے دقائق بھی ملیں گے حکمت و فلسفہ کی نکتہ آفرینیاں بھی آئیں گی۔ ہر ایک بات میں پیچیدگی و مشکل پسندی و عجائب پرستی کا طومار بھرا ہوا ہوگا۔ مگر ان چیزوں میں جتنی زیادتی ہوتی گئی ہے۔ اتنی ہی اس خصوصیت میں کمی آتی گئی جس سے منشار قرآن وابستہ تھا۔

اس سے بھی زیادہ مقام تاسف یہ ہے کہ بڑی بڑی تفسیروں میں ایک ایک آیت کے لئے متعدد مطالب اور مختلف روایتیں مذکور ہیں جن میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کیونکہ اگلے وقتوں میں بزرگوں کا مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ آیات کے مفہوم میں جتنے اقوال منقول ہوں یا ہوسکتے ہوں ناظرین کے روبرو وہ تمام باتیں پیش کردی جائیں اور ہر ایک سخن شناس نظر کے لئے یہ موقع حاصل رہے کہ اصول تفسیر کی مدد سے ان اقوال میں سے جو حق ہے اس کو محکم اور جو باطل ہے اس کو زاہق بتا سکے۔ یہی نکتہ ہمارے پیش نظر ہے۔ راست راست بے کم و کاست ہزار نکتۂ باریکتر ز مو این جاست۔ اس کی تشریح کے لئے آیندہ اشاعتوں کا انتظار کیجئے اگرچہ یہ موہبت الٰہی آپ کے آپ اپنے وقت پر فیض پہونچانے والی ہے، انتظار کی ضرورت ہی نہیں۔ چو وعدہ بر رسد او خود بیاید خواہد داد بذوق خویش سر راہ انتظار مگیر

[1] ابن جریر جلد ۱ صفحہ ۲۷۔

کلام رسول کی اہمیت اور اس کا ثبوت کتاب و سنت سے

از

جناب مولانا عبداللہ صدیقی استاذ دینیات کلیہ جامعہ عثمانیہ

احادیث طیبہ کو بیکار ٹھیرانے اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے معانی نکالنے والوں نے حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ لاتکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن کے معنی غلط لئے ہیں کہ کوئی حدیث لکھو ہی نہیں بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ قرآن شریف میں احادیث نہ لکھو تاکہ قرآن و حدیث میں اشتباہ نہ رہے۔ ان کے یہ معنے احادیث و آیات ذیل کے خلاف ہیں، نیز اجماع عامۃ الصحابۃ و المسلمین کے بھی بالکل خلاف ہیں ورنہ احادیث کی اتنی جلیل القدر کتابیں تیار ہی نہ ہوتیں۔

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	جو کچھ تمکو رسول دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو (سورۃ الحشر ع ۱)
مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى	ہمارا پیغمبر اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا وہ جو کچھ کہتا ہے، وحی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔ النجم ع ۱۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔	تمہارے لئے رسول اللہ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ (الاحزاب ع ۲)۔
عَنْ اَبِيْ رَافِعٍ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ	ابی رافع سے مروی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ پاؤں میں تم میں سے کسی ایک کو کہ اپنی کرسی پر تکیہ دیے

منکما علی اریکته یاتیه امر من امری مما امرت به او نهیت عنه لا ادری ما وجدنا فی کتاب الله اتبعناه ۔

عن المقدام بن معد یکرب قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه وان ما حرم رسول الله کما حرم الله

عن ابن عمرو بن العاص رضی الله عنه قال کنت اکتب کل شیء سمعته من رسول الله صلی الله علیه وسلم فنهتنی قریش وقالوا اتکتب کل شیء ورسول الله صلی الله علیه وسلم بشر یتکلم فی الرضا والغضب فامسکت عن الکتابة حتی ذکرت ذالک لرسول الله صلی الله علیه وسلم فاوما باصبعه الی فیه وقال اکتب

بیٹھا ہے اس کے پاس میرے احکام سے کوئی حکم پہنچتا ہے خواہ میں نے حکم کیا ہے یا منع کیا ہے پھر وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا ہم تو جو کتاب اللہ میں پائیں گے اسی کی اتباع کریں گے۔ (رواہ احمد و ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ والبیہقی فی دلائل النبوۃ و مشکوٰۃ)

مقدام بن معد یکرب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں مجھے قرآن دیا گیا ہے اس کے ساتھ اور اتنا ہی۔ ایسا نہ ہو کہ ایک شکم سیر کرسی پر بیٹھا ہو اور کہتا ہو تم پر یہ قرآن ہی لازم ہے، اس میں جو حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو اور بیشک رسول اللہ کا حرام کیا ہوا بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔ (رواہ ابوداؤد و روی الدارمی نحوہ وکذا ابن ماجہ الی قولہ کما حرم اللہ)

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش کے لوگوں نے مجھے منع کیا اور کہا ہر شئے تم لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ خوشی ناخوشی کے وقت کلام کرتے ہیں تو میں نے لکھنے سے ہاتھ روک لیا یہاں تک کہ میں نے اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا پس آپ نے اپنے دہان مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے فرمایا۔ لکھ۔ قسم ہے اس خدا کی

فو الذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا حقا۔

جس کے ہاتھ میں میری جان ہے نہ اس سے نکلیگا کلام حق (اخرجہ ابو داؤد و تیسیر صـ ۹۲)

عن ابی ھریرة رضی اللہ عنہ قال شکی رجل من الانصار الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انی لاسمع منك الحدیث فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینك و اوما بیدہ الی الخط

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی اور کہا یا رسول اللہ میں آپ سے حدیث سنتا ہوں اور وہ مجھے پسند آتی ہے مگر مجھے یاد نہیں رہتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے ہاتھ سے مدد لے اور اپنے ہاتھ سے خط کی طرف اشارہ فرمایا۔ (اخرجہ الترمذی تیسیر صـ ۹۲)

وعن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ ماکان فی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر حدیثا منی الا ما کان من ابن عمرو فانہ کان یکتب ولا اکتب

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیث یاد رکھنے والا نہ تھا بجز عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے کہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (اخرجہ البخاری و الترمذی و تیسیر صـ ۹۳)

حاملان قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

از

مولوی محمد عثمان صاحب عمادی۔ بی۔ ایس سی علیگ

وقت آں شد کہ ی از ساغر خورشید زنم | بے از نور تبسم چو سحر تازہ کنیم
شمس حق افضل و علمش قمر مطلع صدق | نوبت سلطنت شمس و قمر تازہ کنیم

ذات منبع ایمان، صفات مظہر احسان، حق اور باطل کے درمیان مجسم فرقان، نمونہ من کان خلقہ القرآن۔ یہ مختصر صرف ان کے معارف قرآنی تک محدود ہے جو خود میں نے ان کی زبان سے سنی تھیں، علی مسمع منی و مرأی منہ۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حیات قتلیٰ

کلام اللہ میں ہے:۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ:۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انھیں مردہ نہ سمجھو وہ تو اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں اور انھیں روزی ملا کرتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ کافروں سے جہاد کرتے ہوئے جو لوگ شہید ہوں کیا ان کے ذیل میں وہ پاک ہستیاں شامل نہیں جو نفس کافر سے دن رات مجاہدہ کرتے رہے اور اسی میں جان دی۔

فرمایا:۔

۱۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے ابتلاے یوم اُحد کا تذکرہ فرمایا ہے کہ مومنین پر جو گذری وہ امتحان

کی ایک صورت تھی کہ مومن منافق سے اور صادق کاذب سے متمیز ہو جائے' یہاں فرمایا ہے کہ ان مومنین میں سے جو منہزم نہ ہوئے اور قتل ہوئے وہ جناب الٰہی میں زندہ ہیں اور رزق یابندہ ہیں۔ لہٰذا آیت کو صرف انھیں کی حیات بعد الممات سے تعلق ہے اور بس۔

۲۔ شہدار مذکورین فی ہٰذہ الایہ کی نسبت روایات میں اختلاف ہے۔ شہدائے احد و شہدائے بدر و شہدائے بیر معونہ کے لئے روایتیں وارد ہیں۔ اصول میں یہ ضابطہ مقرر ہے کہ "الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب" اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ مثلاً شہدائے احد کو جن حالات میں شہادت نصیب ہوئی دوسرے مجاہدین فی سبیل اللہ کو بھی اگر وہ حالات پیش آئیں تو شہادت کے بعد وہ بھی عند اللہ حیّ و مرزوق ہوں گے۔ غیر مقاتلین خواہ کسی درجہ کے ہوں یہ کرامت اُن کے لئے نہیں۔

۳۔ اس آیت کے بعد ہے:۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ	اللہ نے جو ان کو دیا اس سے اُن کو فرحت ہوگی وہ خوش
بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ	ہوں گے کہ جو لوگ ان کے پیچھے تھے اور ان سے ملحق نہ
اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔	ہوئے وہ بھی اسی روش پر چلیں نہ ان پر خوف حاوی ہوگا
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ	اور نہ وہ محزون ہونگے۔ اللہ کی نعمت اور فضل سے وہ خوش
وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔	ہونگے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں جانے دیتا۔
اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ	یہ وہ لوگ ہیں کہ زخم رسیدہ ہو چکے تھے پھر بھی اللہ و رسول
بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ	کا حکم مانا' ان میں سے جن لوگوں نے حسن عمل اور تقویٰ کی
اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ	شان دکھائی ان کے لئے بڑا اجر ہے۔
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ	یہ حسن عمل اور تقویٰ کی شان دکھانے والے ایسے تھے کہ جب
جَمَعُوْا لَكُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا	لوگوں نے انھیں خبر دی کہ تمہارے مخالف انبوہ در انبوہ ہیں

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ تمہیں ان سے ڈرنا چاہئے اس خبر نے بجائے ڈرانے کے ان کا ایمان بڑھا دیا اور وہ بول اٹھے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہترین قابل ہے۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ یہ کہنا تھا کہ ان پر اللہ کی نعمت اور فضل نے پلٹا کھایا سلامت رہے کوئی قتل، زخم، خوف انھیں چھو تک نہ گیا رضائے الٰہی کی پیروی کی اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔

یہ تمام آیتیں انھیں مقتولین مومنین سے متعلق ہیں جو غزوات میں قتل ہو چکے تھے، مجاہد بالنفس کی فضیلت میں کیا کلام ہے؟ مگر ان آیات کو اس سے سروکار نہیں، یہاں مقتولین کی جس حیات و رزق کا تذکرہ ہے وہ انھیں تک محدود ہے اور کلام اللہ نے "الذین" سے خود ان کی تخصیص کر دی ہے۔

غلبۂ نصاریٰ

سلطنت چین پر نصاریٰ کے ہجوم کا تذکرہ تھا، فرمایا:۔ نصاریٰ کو غلبۂ دوام ہوگا علت دریافت کی تو یہ آیت پڑھی:۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنے پاس اٹھانے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان سے تجھے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ان کو کافروں پر قیامت تک کے لئے فائق بنانے والا ہوں، اس کے بعد تمہاری بازگشت میرے پاس ہے۔ پھر میں تمہارے درمیان ان سب میں فیصلہ کر دونگا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

فرمایا یہ حکم عموم لفظ کی بنا پر ہے، مفسرین یہاں ناحق غلبۂ اسلام سے بحث کرتے ہیں بے شبہ اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو غلبہ اور نصرت کی بشارت دی ہے۔

فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظَاهِرِیْنَ۔	ہم نے مومنین کی ان کے دشمنوں کے خلاف تائید کی تو ان کا ظہور و غلبہ نمایاں ہوگیا۔
وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔	عزت اور غلبہ اللہ کے لئے ہے رسول اللہ کے لئے اور مومنین کے لئے ہے
وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْکَافِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا۔	اللہ تعالیٰ کفار کو مومنین پر ہرگز راہ نہ دے گا۔

قاضی شوکانی کی تالیف "دبل الغمامہ" اسی آیۃ کی تفسیر میں ہے، لیکن:۔

سوئے این بادیہ ہرگز نہ وزیداست نسیم ۔۔۔ سینہ بربرق کشائیم و جگر تازہ کنیم

آیت میں صرف اتباع عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے کہ وہ کفار پر غالب رہیں گے، یہ نہیں کہ مسلمانوں پر بھی ان کو ہمیشہ غلبہ رہے گا۔

پھر اس میں ایک اور نکتہ ہے، اور یہ ایسا نکتہ ہے کہ تمام تفاسیر کا برہم زن ہوگا:۔

ما برق جانے شمع بکاشانہ آوریم ۔۔۔ آتش بہ پاسبانی پروانہ آوریم

"اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ" سے جس طرح نصاریٰ مراد ہیں اسی طرح "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا" کے مصداق یہود ہیں کیونکہ یہاں کفر کے معنی صرف انکار کے ہیں اور منکرین عیسیٰ علیہ السلام کوئی اور نہ تھے، دعوت عیسوی کو فرصت ہی نہ ملی کہ یہود سے تجاوز کرتی۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے عیسیٰ جن لوگوں نے تیری پیروی کی اُن کو میں ان لوگوں پر تاقیامت فوقیت دونگا جو تجھ سے منکر ہوئے۔

ظاہر ہے کہ پیروی کرنے والے نصاریٰ تھے اور منکر یہود، رد و قبول عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت انھیں دونوں جماعتوں میں اختلاف تھا جس کے لئے ارشاد ہوا کہ "اے نصاریٰ و یہود، آخر کار تمہیں خدا ہی کے پاس جانا ہے، تمہارے درمیان جو اختلاف ہیں وہیں اُن کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

رباطِ خیل

اعداء اللہ سے جہاد کے لئے تاکید محل بحث تھی اور آیۂ "اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا" کی تشریح پیش ہو رہی تھی۔

فرمایا: بے شبہ اقامت تنفو اسلام کے لئے رباط خیل لازم ہے، لیکن اس آیت میں رباط خیل مراد نہیں بلکہ انتظار صلوٰۃ بعد صلاۃ مقصود ہے۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمن کی روایت میں تصریح کر دی گئی ہے کہ لَمْ يَكُنْ فِي زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزْوٌ يُرَابَطُ فِيْهِ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ ہی ایسا نہ تھا کہ اُس میں رباط خیل کی نوبت آتی یا ضرورت پڑتی"۔

آیت مبحوث عنہا یوں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اے ایمان والو صبر کرو، اپنے مخالفین کے مقابلہ میں استقلال طبع و ثبات قدم کا لحاظ رکھو کہ ایسا نہ ہو ان صفات کے وہ تم پر غالب آئیں اور تم ان سے ہٹیے رہ جاؤ اور رباط کرو یعنی ایک نماز ہو چکے تو دوسری نماز کے منتظر رہو اور اللہ کے ساتھ تقوی کو ملحوظ رکھو شاید تمہیں فلاح ہو۔

دیکھو امید فلاح کو چار چیزوں سے وابستہ کیا ہے:۔

(۱) صبر۔

۲۔ مصابرۃ

۳۔ انتظار صلاۃ بعد صلاۃ۔

۴۔ تقوی۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے:۔

اما انہ لم یکن فی زمن النبی ہوشیار رہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

غزو یرابطون فیہ ولکنھا نزلت فی قوم — کوئی ایسا غزوہ نہ تھا جس میں رباط خیل کی نوبت آتی!
یعمرون المساجد یصلون الصلوات — یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو مسجدیں آباد
فی مواقیتھا ثم یذکرون اللہ فیھا — رکھتے تھے ٹھیک وقت پر نمازیں پڑھتے تھے اور جب نماز
سے فارغ ہوتے تو پھر اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاتے۔

دوسری روایت میں خود آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں:۔

الا اُخبرکم بما یمحو اللہ بہ الخطایا — کیا میں اُس چیز کی خبر تمھیں نہ دوں جس سے اللہ گناہوں
ویرفع بہ الدرجات۔ — کو مٹاتا اور درجے بڑھاتا ہے؟

وہ چیزیں یہ ہیں:۔

اسباغ الوضوء علی المکارہ — (۱) مکروہات پیش آنے پر پوری طرح وضو کرنا۔
وکثرۃ الخطا الی المساجد — (۲) مسجدوں کی جانب بکثرت قدم اٹھانا۔
وانتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ — (۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا۔
فذلکم الرباط فذلکم الرباط — یہی رباط ہے یہی رباط ہے۔

اس تفسیر کے بعد سر سجود ہو گئے اور قلب خاشع سے آواز آئی۔

ومالی لا اعبد الذی فطرنی والیہ ترجعون۔ — مجھے کیا ہو گیا ہے میں کیوں نہ اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہو!
ءَاَتَّخِذُ مِن دونہٖ اٰلھۃً اِن یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُھُمْ وَلَا ھُمْ یُنْصِرُوْنَ۔ — کیا اُس کے علاوہ دوسروں کو معبود بناؤں جن کی بےبسی وبےکسی کا یہ عالم ہے کہ اگر اللہ مجھے ضرر پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کام آئے اور نہ خود ان کو نصرت نصیب نہ ہو۔

ایمانٌ بالنبوۃ

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا بہشت میں در آیا۔ اس کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنے کی کوئی شرط نہیں۔ بہشت مومنین صالحین ہی کے لئے ہے۔ جب لا الٰہ الا اللہ کہنا موجب دخول بہشت ہوا تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ایمان وصلاح یہی ہے کہ انسان لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق وبلاغ صدق پر نظر کرو۔ آپ نے توحید کی تو ہمیشہ تبلیغ کی مگر اپنی نبوۃ کو منوانے پر کبھی زور نہ دیا۔

اس ذیل میں سلسلہ کلام یہاں تک دراز ہوا کہ:-

(۱) دخول جنت کے لئے ایمان باللہ کافی ہے، ایمان بالنبوۃ کی ضرورت نہیں۔

(۲) نجات آخرت وفلاح عقبیٰ مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں، ان تمام اقوام کے لئے نجات ہے جو مومن باللہ ہوں۔ مومن بمحمد رسول اللہ ہوں یا نہوں، صلی اللہ علیہ محمد وبارک وسلم۔

گفتگو جب اس نوبت تک پہنچ گئی تو فرمایا:-

ایمان باللہ کے ساتھ ایمان برسول اللہ بھی لازم ہے۔ درجات ایمانی کا ذریعہ تکمیل یہی ہے، یہ نہ ہو تو ایمان ناقص ہو جاتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ پر ایمان لاؤ رسول اللہ پر
وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ	ایمان لاؤ اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر
الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ	نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو پہلے نازل ہوئی جس نے
وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اللہ کا اللہ کے فرشتوں کا اللہ کی کتابوں کا اللہ کے پیغمبروں
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا	کا اور آخرت کے دن کا انکار کیا تو حقیقت میں وہ اتنا

گمراہ ہوا کہ اس کی گمراہی دور تک پہنچ گئی۔

ان آیات سے واضح ہے کہ:-

۱۔ اللہ کے مخاطب وہی لوگ تھے جو اللہ پر ایمان لا چکے تھے، مگر یہ ایمان کامل نہ تھا اس لئے حکم ہوا کہ پھر سے اللہ پر ایمان لائیں، رسول اللہ پر ایمان لائیں کتاب اللہ پر ایمان لائیں۔

۲۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا اقرار کرے، اللہ کے فرشتوں کا اقرار کرے اللہ کی کتابوں کا اقرار کرے، یوم آخر کا اقرار کرے، ان میں سے کسی ایک کا بھی جس نے انکار کیا وہ گمراہ ہوا۔

۳۔ "ضلال بعید" کے معنی یہ ہیں کہ "هو اضلال عن الحق بحيث يعسر العود منه إلى سواء الطريق فهؤلاء لا يرتجى لهم ان يعودوا إلى الصراط المستقيم" یعنی حق سے اس طرح گمراہ ہونا کہ پھر راہ راست پر آنا دشوار ہو یہی ضلال بعید ہے، ایسے گمراہوں کے لئے امید نہیں کہ صراط مستقیم پر لوٹ سکیں۔

اللہ نے ایمان کے جو مدارج قائم کئے ان میں ایمان بر رسول اللہ بھی ہے، جو رسول اللہ پر ایمان نہ لائے وہ ایسا بے ایمان ہے کہ پھر اس کے لئے ہدایت کی امید ہی نہیں یہی ضلال بعید ہے اور اسی کی وعید ہے۔

رسائل و مسائل

کیا رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے؟

ایک صاحب نے ماہ شوال ۶۲ھ کے ترجمان القرآن میں "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" کے زیر عنوان "ایمان" کی بحث پڑھ کر ایک شبہ پیش کیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

اسلام کا مقصود بالذات توحید و عبادت الٰہی ہے۔ انبیا محض ذریعہ ہیں اور ان پر ایمان مقصود اصلی نہیں ہے۔ ہر شخص ایمان کے لئے اپنی وسعت علم اور فکر تک مکلف ہے، لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم توحید پر ایمان رکھے اور اپنے طریق پر عبادت الٰہی کرے مگر اپنے علم اور فکر سے کام لینے کے باوجود رسالت کے متعلق نیک نیتی سے شکوک رکھتا ہو ایسے شخص کو ناجی قرار نہ دینے کی معقول وجوہ کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں ذیل کی آیات توجہ کے قابل ہیں:۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ (۳:۷)۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ
الْفَاسِقُونَ ۔۔۔۔ لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ
يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ
وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ۔ (۳: ۱۲)۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ (۵۷: ۴)۔

آیت موخر الذکر کے متعلق یہ بھی بتائیے کہ "کفلین" سے کیا مراد ہے اور کفل تثنیہ کیوں ہے؟"

اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعتوں میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ اگر اس کو بنظر غائر ملاحظہ کیا جاتا تو غالباً یہ شبہ آپ سے آپ رفع ہو جاتا تاہم یہاں پھر ایک مرتبہ اس مسئلہ کو واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسید ہے کہ اس کے بعد کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔

آپ نے اپنے پہلے فقرے میں اسلام کا جو مقصد بیان فرمایا ہے وہ دراصل اسلام کے مقصد کا پورا پورا بیان نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے لیکن میں بخوف طوالت اس بحث میں نہ پڑونگا۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام کا جو ادھورا مقصد آپ نے متعین کیا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے بھی انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی ناگزیر ہے سب سے پہلا سوال جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ اسلام کا جو مقصد آپ قرار دیتے ہیں اس کے حصول کا یقینی ذریعہ کیا ہے؟ "توحید" جس چیز کا نام ہے وہ صرف خدا کو ایک کہنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ دراصل اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کا صحیح علم ہے اسی طرح "عبادت الٰہی" کا مفہوم بھی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی پرستش کی جائے، بلکہ صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت یہ ہے کہ انسان شرک کے تمام شائبوں سے بچ کر اپنی بندگی کو اس ذات پاک کے لئے خالص کردے۔ یہ دونوں چیزیں (یعنی علم و معرفت کی صحت اور عبادت کا خلوص) اسلام کی اصطلاح میں "ہدایت" کے جامع نام سے موسوم ہیں۔ اور قرآن کہتا ہے کہ ہدایت جس شئے کا نام ہے وہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے عطا ہو۔ قُلْ اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ (۳: ۸) اور خدا کی طرف سے ہدایت پانے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو کسی کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے ہدایت آئے۔ یا کسی ہدایت یافتہ آدمی کا اتباع کیا جائے۔ پہلا شخص اسلام کی اصطلاح میں رسول یا نبی ہے۔ اور دوسرے شخص کے لئے اصطلاحی نام "مومن" اور "مسلم" ہے

پس اگر کوئی شخص توحید کا صحیح علم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی عبادت خالص ہو چکی ہے، تو لامحالہ یا تو وہ خود نبی ہے یا کسی نبی کا متبع لیکن اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو اس کے پاس علم نہیں ہے محض "ظن" اور "خرص" ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۵۳: ۲۸)۔ اور جب اس کے پاس "علم" نہیں ہے تو اس کی عبادت بھی خالص نہیں ہو سکتی کیونکہ عبادت کا خلوص در اصل علم و معرفت کی صحت ہی پر مترتب ہوتا ہے۔

آپ کو یہ مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ قرآن کے اس دعوی پر عقلی دلیل پیش کی جائے۔ میں اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے حاضر ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی فطرت میں خدا کی معرفت اور اس کے لئے بندگی کے خلوص کی استعداد موجود ہے جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۳۰: ۳۰)۔ اور حدیث نبوی میں آیا ہے کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ لیکن اس فطری استعداد کے قوت سے فعل میں آنے کے لئے چند شرائط ہیں اور بادنیٰ تامل یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ شرائط ہر شخص میں پوری نہیں ہوتیں۔

پہلی شرط قوت مشاہدہ کی تیزی ہے تاکہ انسان آنکھیں کھول کر آفاق اور انفس میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھے اور صفات الٰہی کے ان نشانات کو پہچانے جو کائنات کے ہر ذرے اور خود انسان کے اپنے وجود میں پائے جاتے ہیں لیکن نوع انسانی کی ایک بڑی اکثریت اس قوت مشاہدہ سے محروم ہے وہ آثار و مظاہر کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے باطن کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ چنانچہ قرآن اس کی شکایت کرتا ہے کہ وَکَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۲: ۱۰۵) "آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ گزر جاتے ہیں اور التفات ہی نہیں کرتے"۔ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (۱۰: ۹۲) "لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں

سے غافل ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سرے سے مشاہدہ کی قوت ہی نہیں رکھتے ان کے لئے معرفت کا دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان میں غور و فکر کا مادّہ موجود ہو، اور وہ بھی صحیح و سلیم ہو، تاکہ انسان اپنے مشاہدات کو صحیح طریقے سے ترتیب دے کر ان سے صحیح نتائج اخذ کر سکے یہ شرط پہلی شرط سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔ اول تو غور و فکر کرنے والے افراد ہی نوع انسانی میں بہت کم ہیں اور جو ہیں اُن میں بھی صحیح الفکر افراد کم پائے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ اور وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ غور و فکر کا فقدان، اور صحت فکر کی کم یابی اُن موانع میں سے ہے جو انسان کو علم حق تک پہنچنے سے روکتے اور اسے ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ راہ راست کے نشانات ہر طرف موجود ہیں، مگر جو شخص ان نشانات کو سمجھتا ہی نہ ہو وہ کیونکر صحیح راستہ کو پا سکتا ہے یہی بات قرآن مجید میں کہی گئی ہے کہ ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں مگر ان کے لئے جو عقل رکھتے ہوں وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (۳۰:۴)۔ اور دیکھئے کہ یہی بات دوسرے موقع پر کتنے زور کے ساتھ کہی گئی ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۲۲:۷)	ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے ایک بڑی تعداد کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے جن کا حال یہ ہے کہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ، یہ وہی لوگ ہیں جو غفلت برتنے والے ہیں۔

تیسری شرط یہ ہے کہ انسان کی فطرت اتنی سلیم ہو کہ وہ سوسائٹی کے اثرات، باپ دادا کی تربیت

اور خاندانی و قومی روایات سے متاثر نہ ہو اور ان تمام پردوں کو چاک کرکے نورِ حقیقت کو صاف صاف دیکھ سکے۔ یہ شرط پہلی دونوں شرطوں سے بھی زیادہ کم یاب ہے۔ بڑے بڑے ذی علم، عاقل اور ذکی و فطین لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سوسائٹی اور خاندان کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جس ڈگر پر ماحول نے ان کو ڈال دیا ہے اسی پر چلے جا رہے ہیں، اور اسی کو حق سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید اس کو بھی گمراہی کا اہم سبب بتاتا ہے۔

قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۵: ۱۰۴)۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ انسان میں حق پسندی اور اس کے ساتھ قوتِ ارادی اتنی زبردست ہو کہ وہ خود اپنے نفس کی خواہشات اور رجحانات کا مقابلہ کر سکے، کیونکہ ہوائے نفس اول تو معرفتِ حق ہی میں مانع ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص حق کو پہچان بھی لے تو وہ اُس کو قلب و روح میں جاگزیں کرنے اور بندگی و عبادت کو خدا کے لیے خاص کر دینے میں قدم قدم پر مزاحمت کرتی ہے۔ چونکہ انسان کے نفس میں یہ ایسی زبردست قوت ہے جو اکثر اس کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے، اور بسا اوقات اس کو جانتے بوجھتے غلط راستوں پر بھٹکا دیتی ہے اس لئے معمولی آدمی تو درکنار بڑے بڑے لوگ بھی جو اپنے علم و فضل اور اپنی عقل و بصیرت اور فہم و فراست کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہوتے ہیں، اس رہزن کی شرارتوں سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی گمراہی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا ہے وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ (۲۸: ۵۰) اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی"۔ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (۴۵: ۲۳) تو کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشاتِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا باوجودیکہ وہ علم رکھتا تھا مگر (جب اس نے ایسا کیا تو) اللہ نے اسے بھٹکا دیا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفسِ شریر کی

رہزنی کے خطرے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی ہے کہ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۳۸ : ۲) "ہوائے نفس کی پیروی نہ کر وہ تجھے اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔"

آخری شرط یہ ہے کہ انسان کی وجدانی قوتیں بیدار ہوں اس کے ذہن کا سانچہ ایسا ہو کہ صحیح اور حق بات سوچنے اور سمجھنے کے لئے غور و فکر اور استدلال عقلی کا زیادہ محتاج نہ ہو، بلکہ فطرۃً وہ غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہو اور قیاس و استدلال کے بغیر محض حدس (Intuition) کی قوت کچی اور حق بات تک پہنچ جائے۔ یہ شرط سب سے زیادہ کڑی مگر معرفت کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے انسان کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی وسیع ہو، غور و فکر اور تعقل و تدبر کی قوت سے وہ کتنا ہی بہرہ مند ہو، اور تقلید غیر و بندگی نفس کی زنجیروں سے کیسا ہی آزاد ہو، لیکن جو حقیقتیں اس کے حواس سے ماوراء ہیں، اور جن کی پوری کنہ پر اس کی عقل اپنی طبیعت کے لحاظ سے حاوی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی، ان کا علم اور علم یقین اس کو محض آثار کے مشاہدے اور محض آزاد تفکر کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ان حقیقتوں کے قریب تک پہنچ سکتا ہے، مگر ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ عقل کے زور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید ایسا ہو، اغلب ہے کہ ایسا ہی ہو، یا حد سے حد یہ کہ ایسا ہونا چاہئے لیکن محض تعقل اس کو اتنی قوت بہم نہیں پہنچا سکتا کہ وہ جزم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ فی الواقع ایسا ہے اور یہی حقیقت اور صداقت ہے، اور اس کے سوا جو کچھ ہے قطعاً باطل اور غلط ہے۔ یہ جزم اور یقین اور ایمان کامل کی کیفیت صرف "حدس" سے پیدا ہوتی ہے۔ عرفان کی آخری منزل میں پہنچ کر قیاس و استدلال کام نہیں دیتا۔ وہاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ذہن میں ایک روشنی نمودار ہوتی ہے اور وہ ان کی آن میں حقیقت کا مشاہدہ کرا دیتی ہے، ایسا ہی مشاہدہ جیسا کہ ہم اپنی آنکھوں سے کسی مرئی چیز کا کرتے ہیں۔ اسی مشاہدہ پر جزم و یقین کی بنا قائم ہوتی ہے۔ اس وقت انسان کا اعتقاد گمان اور اندازے اور اٹکل جیسی کمزور اور متزلزل بنیادوں پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کرکے ایک

ایسی دیکھی بھالی بات پر ایمان لاتا ہے جس کی صداقت میں شک اور شبہ اور جانب مخالف کے امکان کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی کا نام معرفت کامل ہے اور جب تک معرفت کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، انسان نہ تو پورا پورا خدا شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کے لئے اس کی بندگی خالص ہو سکتی ہے لیکن حدس کی یہ روشنی جس پر معرفت کی تکمیل موقوف ہے، انسان کے اپنے بس کی نہیں۔ نہ وہ اس کی حقیقت سے واقف ہے، نہ اُس کو پیدا کرنے پر قادر ہے، اور نہ کسب و کوشش سے اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ محض خداداد ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں "نُورِ خداداد" اور "برہان رب" اور "ھدایت الٰہی" اور "تعلیم خداوندی" سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۲۴: ۵) "جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں"۔ اور حضرت یوسف کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّهٖ (۱۲: ۳) "اگر وہ اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا تو وہ بھی بھٹک جاتا" اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۶: ۲۰) لوگوں سے کہدو کہ مجھ کو میرے رب نے راہ راست کی طرف ہدایت بخشی ہے" اور حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۲۸: ۲) "اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اس کو قوت فیصلہ اور علم عطا کیا"۔

اب ان پانچوں شرطوں پر غور کیجئے۔ اگر آپ کو ان میں سے کسی شرط کی ضرورت سے انکار ہے تو وجہ انکار ارشاد ہو۔ اگر کسی شرط کے بغیر انسان صداقت اور حقیقت تک پہنچ سکتا ہو تو دلیل پیش فرمائی جائے، اور اگر حقیقت رسی کے لئے ان پانچوں شرطوں کا حاصل ہونا آپ کی رائے میں بھی لازم ہے، تو بتائیے کہ کتنے لاکھ نہیں کتنے کروڑ، بلکہ کتنے ارب انسانوں میں سے ایک میں یہ شرطیں اس کمال کے ساتھ پوری ہوتی ہیں کہ وہ خداوند جل وعلیٰ جیسی سرحد ادراک سے ورا را اور ارہستی کی معرفت کامل حاصل کر لے؟ اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جنس گراں کمیاب ہے، تو پھر فرمائیے کہ ان کروڑوں بندگان خدا کا کیا حشر ہو جو اس سے محروم ہیں یا اگر بہرہ مند بھی ہیں تو اس درجہ میں نہیں؟ کیا ہر شخص کو اس کے ناقص ذرائع کے ساتھ چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود اپنی اندھی آنکھوں

اور مفلوج پاؤوں کے ساتھ خود ہی راستہ ٹٹول کر چلے، جس چیز کو چاہے "نیک نیتی" کے ساتھ خدا سمجھے، اور جس طرح چاہے اس کی پوجا کرے؟ اگر آپ کا یہی خیال ہے تو آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر شخص کو اپنے مرض کا علاج آپ کرنا چاہیے۔ کسی طبیب اور ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اپنا راستہ آپ تلاش کرنا چاہیے۔ کسی سے راستہ پوچھنے اور کسی کو راستہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو علم خود ہی حاصل کرنا چاہئے۔ کسی استاد اور معلم کی حاجت نہیں۔ کیا اس دنیا کا نظام یونہی چل رہا ہے؟

انسان کے محدود ذہن میں اتنی سمائی نہیں ہے کہ تمام جہان کی قابلیتیں بیک وقت اس میں جمع ہو جائیں حتی کہ وہ اپنے ہر کام میں دوسروں کی مدد سے بے نیاز رہے۔ دوسری طرف انسان کی ضروریات اتنی وسیع اور گوناگوں ہیں، کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک خاص قسم کی قابلیت درکار ہے، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنے لئے مناسب حال قابلیتیں چاہتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مختلف لوگوں کو مختلف قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کو طب سے لگاؤ ہے اور وہ لوگوں کی طبی ضروریات کو پورا کرتے ہے کسی کو قانون سے لگاؤ ہے، کسی کو تجارت سے، کسی کو کاشتکاری سے، کسی کو صنعت وحرفت سے، کسی کو حکومت وسیاست سے یہ سب اپنے اپنے شعبے میں نوع انسانی کے محتاج الیہ ہیں، اور ہر شعبۂ زندگی کے مخصوص معاملات میں دوسرے تمام شعبوں کے لوگ اسی خاص شعبے کے آدمیوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو شخص اس نظام کو توڑ کر آپ ہی اپنا طبیب، اپنا وکیل، اپنا مزارع، اپنا بیوپاری اور اپنا صناع بننے کی کوشش کرے گا، وہ خواہ کتنی ہی "نیک نیتی" سے اس حماقت کا مرتکب ہو فطرت کے نظام کو توڑنے کا نتیجہ بہرحال ظاہر ہوگا اور وہ یقیناً ناکام زندگی بسر کرے گا۔

یہ نظام جس طرح زندگی کے تمام معاملات میں درست ہے اسی طرح، مذہب کے معاملہ میں بھی درست ہے یہاں بھی ہر شخص اس خاص قابلیت سے بہرہ مند نہیں ہے جو معبود کو پہچاننے اور اس کی صحیح طریقے سے عبادت کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ قابلیت بھی خاص خاص لوگوں کو عطا کی گئی ہے۔ انہوں نے معبود کو پہچانا ہے اور اس کی

نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں، اس کی عبادت و بندگی کا صحیح طریقہ دریافت کیا ہے، اور اس کو بھی بتا گئے ہیں عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ اس شعبے میں اسی شعبے کے ماہروں پر اعتماد کرے جیسی تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو قلب و روح میں جگہ دے، اور جو طریق عبادت و بندگی انہوں نے اپنے قول اور عمل سے پیش کیا ہے۔ اسی کا اتباع کرے۔ وہ بلاشبہ اس معاملہ میں بھی اپنی عقل کو استعمال کر سکتا ہے لیکن یہاں عقل کے استعمال کی صحیح صورت یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ناقص قوتوں اور اپنے محدود ذرائع پر اعتماد کر کے راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے اور جو راستہ اپنے نزدیک صحیح معلوم ہو اس پر چلنے لگے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے صحیح رہنما تلاش کرے اور جو لوگ مذہب کے میدان میں رہنمائی کے مدعی ہیں ان سب کی سیرت اور ان کی تعلیم پر اپنی حد تک ایک تحقیقی نظر ڈال کر معلوم کرے کہ ان میں سے کون زیادہ بہتر اور صحیح راہ دکھانے والا ہے کس کی ذات میں وہ پانچوں شرطیں بدرجۂ اتم پوری ہو گئی ہیں جو ہدایت یافتہ ہونے کے لئے ضروری ہیں؟ اور کس کی تعلیم سب سے زیادہ معقول اور کس کا طریقہ سب سے زیادہ قابل عمل ہے؟ اس امتحان پر جو شخص پورا اترے اس کی تعلیم کو مان لینا چاہئے اور اس کے اتباع کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس معقول طریقہ کو چھوڑ کر جو شخص غیر معقول طریقہ اختیار کرے گا، وہ خواہ کتنا ہی نیک نیت ہو وہ اپنی غلطی کے برے نتائج ضرور دیکھے گا۔ غلطی خواہ نیک نیتی سے کی جائے یا بدنیتی سے، اس کی ذمہ داری اور اس کے وبال سے انسان بچ نہیں سکتا، جو شخص بیمار ہو اور فن طب کے ماہر کو تلاش کرنے اور اس پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے ناقص علم پر اعتماد کر کے خود اپنا علاج کرنے لگے وہ اپنی اس غلطی کا نتیجہ ضرور بھگتے گا، خواہ یہ غلطی اس نے کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو۔ جو شخص قانون کے معاملہ میں ماہر قانون کو چھوڑ کر خود اپنی ناقص رائے پر عمل کرے گا وہ اپنی حماقت کے نتائج سے نہ بچ سکے گا، چاہے اس نے یہ حرکت انتہائی نیک نیتی کے ساتھ کی ہو، غلطی بہر حال غلطی ہے، اور ہر غلطی کے جو فطری نتائج مقرر ہیں وہ ہر حال میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ البتہ بدنیتی سے ایک جرم کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب میں ان آیات کی طرف توجہ کرتا ہوں جو آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش فرمائی ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس قاعدہ کلیہ کو سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ میں قرآن مجید سے استشہاد کرنے کے لئے ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر نکال لینا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے پورے قرآن پر نظر ڈالنی ضرور ہے تاکہ مسئلہ کے تمام اطراف سامنے آجائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کوئی مسلسل تصنیف نہیں ہے جس میں ترتیب کے ساتھ ہر ہر مسئلے کو ایک جگہ مفصل بیان کیا گیا ہو بلکہ مجموعہ ہے ان آیات کا جو ۲۳ سال کی طویل مدت میں موقع اور ضرورت کے لحاظ سے نجماً نجماً نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے جتنے مہمات مسائل ہیں وہ سب کسی ایک جگہ اپنی پوری پوری تفصیلات کے ساتھ بیان نہیں کر دئے گئے ہیں بلکہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف آیات میں موقع و محل کے لحاظ سے ان کے اطراف بیان کئے گئے ہیں۔ پس اگر آپ رسالت کے مسئلہ میں قرآن کی تعلیم ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پورے قرآن پر مجموعی نظر ڈالیے۔ ایک دو آیتوں کو چھانٹ کر سلسلہ سے الگ کر لینگے تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس قاعدہ کے مطابق جب آپ قرآن کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر شخص آپ اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے آزاد ہے اور ہر راستہ جس کو وہ نیک نیتی کے ساتھ درست سمجھتا ہے وہی حقیقت میں بھی صحیح ہے قرآن تو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت بنی آدم کو زمین پر اتارا تھا اسی وقت اس نے ان کو سیدھا راستہ بتانے کا کام خود اپنے ذمہ لے لیا تھا اور ان سے صاف کہدیا تھا کہ تمہارے لئے نجات کی صورت بس یہی ہے کہ میری بھیجی ہوئی ہدایت کا اتباع کرو۔ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۲:۴) پھر اس نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ یہ ہدایت ہر شخص کے پاس فرداً فرداً نہیں بھیجی جائے گی، بلکہ میں خود تم ہی میں سے کچھ لوگوں کو انتخاب کرکے ان پر اپنی ہدایت نازل کرونگا اور ان کو تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجونگا۔ جو شخص میرے رسول کو اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو سچے

دل سے مانیگا وہی ہدایت پائیگا: یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷ : ۴) اور جو رسولوں کو نہ مانیگا وہ اس کی سزا پائیگا۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸ : ۱) اور جب قیامت کے روز اس کو عذاب دیا جائیگا تو اس سے کہا جائیگا کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے اور انہوں نے تم کو خدا کی آیات نہیں سنائی تھیں اور اس دن کے انجام سے آگاہ نہیں کر دیا تھا؟ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَ یُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا (۳۹ : ۸)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ جو شخص اللہ کے رسولوں کو نہ مانے اس کے لئے اللہ کو ماننا ہرگز نافع نہیں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (۴ : ۲۱)

تحقیق جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ کی کوئی راہ اختیار کریں، وہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔

قرآن کے نزدیک مومن وہی ہے جو اللہ کے ساتھ اس کے رسول پر بھی ایمان لائے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (۲۴ : ۹)

مومن در اصل وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

[1] واضح رہے کہ رسول کی تکذیب یہی ہے کہ اس کے دعوئی رسالت کو ماننے سے انکار کیا جائے۔ یہ انکار خواہ نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے بہرحال انکار ہی، البتہ بدنیتی کی صورت میں انکار کی ذمہ داری زیادہ بڑھ جاتی ہے جو شخص غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے وہ گمراہ ہے اور جو شخص راستہ کو صحیح جانتے ہوئے غلط راستہ پر چلے وہ گمراہی کے ساتھ مغضوب بھی ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

اور جو شخص رسول کے ذریعہ سے ہدایت کا راستہ واضح ہو جانے کے بعد بھی اس کو اختیار کرنے سے انکار کرے وہ جہنم سے بچ نہیں سکتا۔ اس معاملہ میں نیک نیتی اور بدنیتی کا قطعاً کوئی سوال نہیں ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (۴:۱۱۵)	اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول سے جھگڑا کرے اور مومنوں کے رستے پر چلے اس کو ہم اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے اصول سے ہے، اور قرآن میں آپ کہیں ایسی کوئی بات نہیں پا سکتے جو اس کے خلاف ہو۔ آپ نے جن آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش فرمایا ہے وہ بظاہر آپ کو اس سے متناقض معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر آپ سورۂ آل عمران کو چھٹے رکوع سے لے کر بارھویں رکوع تک مسلسل پڑھیں تو تناقض کا شائبہ تک نہ رہے گا۔ چھٹے رکوع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا ..... ثُمَّ نَبْتَهِلْ	یہ علم حق تیرے رب کی طرف سے ہے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیو۔ پھر جو کوئی اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے جب کہ تیرے پاس علم آچکا ہے تو کہہ کہ آؤ..... پھر ہم مباہلہ کریں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو ایک کلمۂ سواء یعنی توحید کی طرف دعوت دو اور ان سے کہو کہ ابراہیمؑ جس کے بارے میں تم جھگڑتے ہو وہ یہودی یا نصرانی نہ تھا، اور اس کے ساتھ اصلی تعلق وہی لوگ رکھتے ہیں جو اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ تم کسی کی بات نہ مانو بجز اس کے جو تمہارے دین کی پیروی کرے وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ تمام پیغمبروں سے (اور بالتبع ان کی امتوں سے) عہد لیا گیا ہے کہ ہر نبی جو خدا کی طرف سے تمہاری کتابوں کی

تصدیق کرنے کے لئے آئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا اس عہد سے جو لوگ پھر جائیں وہ فاسق ہیں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر جو کچھ اترا ہے اس سب پر ایمان لاؤ یہی اسلام ہے اور جو شخص اس اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہو، اس کا وہ دین ہرگز مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ آخر میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ "ان میں سے تھوڑے ایمان لائے اور اکثر نافرمان ہیں"۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ایمان سے مراد رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ کیونکہ جو لوگ "اہل کتاب" ہیں وہ موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو یا دونوں کو اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو تو مانتے ہیں، اور خدا کے بھی قائل ہیں۔

آخری آیت جو سورۂ حدید سے آپ نے نقل فرمائی ہے، اس میں ان تمام لوگوں کو جو پچھلے انبیاء پر ایمان لا چکے ہیں، دو چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ خدا سے ڈریں اور تقویٰ اختیار کریں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے رسول یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، پھر فرمایا گیا کہ اگر تم یہ دونوں باتیں اختیار کروگے تو تم کو خدا کی رحمت سے دو حصے ملیں گے یعنی ایک حصہ انبیاء سابقین پر ایمان اور تقویٰ کے اجر میں اور دوسرا حصہ ایمان بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اجر میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ پچھلے انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی دی ہوئی تعلیم پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں ان کو بھی خدا کی رحمت کا ایک حصہ ملے گا۔ اس کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (۷: ۲۱) اور يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵: ۱۰)۔

لیکن ایک دوسرے موقع پر یہ بھی تو فرمایا ہے۔

اَفَمَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى (۱۳: ۱۳)۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کتاب تیرے اوپر اتاری گئی ہے وہ حق ہے اس شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔

اور یہ بھی تو ارشاد ہوا ہے کہ لوگ پچھلی کتابوں کا صحیح علم رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن خدا کی طرف سے آیا ہے اور برحق ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (۶: ۴)

لہٰذا ان دونوں مضمونوں کی آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو لوگ جہالت اور نابینائی کے باعث رسول عربی کی صداقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر انبیاء سابقین پر ایمان رکھتے ہیں اور تقویٰ و صلاح کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کو اللہ کی رحمت کا صرف اتنا حصہ ملیگا کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔ واللہ اَعْلَمُ بالصواب۔

تقریظ و انتقاد

تعلیمات قرآن

(۲)

نظام عالم کی مدت صفحہ ۶۲ پر یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲: ۱) اور تعرج الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰: ۱)۔ کی تفسیر کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھتے ہیں ۔

"نزول امر اور عروج امر سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز و انجام مراد ہے اور جملہ امور کے خاتمہ کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔ یعنی نظام عالم کے قیام کی مدت پچاس ہزار سال ہے جس کے بعد قیامت آجائے گی"۔

یہ تفسیر قریب قریب وہی ہے جو ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے؛ لیکن قرآن مجید سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دونوں آیتوں کے الفاظ میں کوئی خفیف سا اشارہ بھی اس جانب نہیں ہے کہ نظام عالم کی مدت قیام ۵۰ ہزار سال ہے۔ نیز جہاں تک غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں آیتوں میں کوئی ایسا ربط بھی نہیں ہے کہ ان کو ملا کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تدبیر امر کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام کرتا ہے اور اس انتظام کا عروج اس کی جانب ایک دن میں ہوتا ہے جو تمہارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے۔ اس تدبیر امر کی کیفیت، اور ایک ایسے طویل دن میں اسکا عروج ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس کی تفصیل ہمارے سامنے بیان کی بھی جاتی تو ہم اس کو نہ سمجھ سکتے،

البتہ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے موجودہ نظام عالم کی تدبیر کے باب میں ہے بخلاف اس کے دوسری آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ اس نظام کے خاتمہ کا دن یعنی قیامت ہے۔ چنانچہ پوری آیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں

سَأَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الخ

پوچھنے والے نے پوچھا اس عذاب کے بارے میں جو کافروں کے لئے واقع ہونے والا ہے۔ اس کو تو کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ وہ بلند مراتب والے خدا کی طرف سے ہے۔ ملائکہ اور روح اس کی طرف چڑھیں گے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ۵۰ ہزار برس ہوگی پس اے محمد تو ان کی باتوں پر اچھی طرح صبر کر۔ یہ اس دن کو دور دیکھ رہے ہیں اور ہم قریب دیکھتے ہیں۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں تمام بڑے بڑے مفسرین مثل عکرمہ و قتادہ و ضحاک و ابن زید و ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے اور وہ دن کافروں کے لئے ایسا طویل ہوگا جیسے ۵۰ ہزار برس۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ سے عرض کیا گیا کہ یہ تو بڑا ہی لمبا دن ہوگا! حضور نے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مومن پر وہ اتنا خفیف ہو جائیگا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے"۔

اسلام اور ایمان کا فرق صفحہ ۲۷ پر قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹ : ۲) ۔ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مسلم رکھا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے بخلاف اس کے جو لوگ اپنے آپ کو مومن کہتے

ہیں وہ لطیون یعنی ایمان کے مدعی ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اس لئے یہ نام تزکیۂ
نفس کا ادعا ہے جس سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس تفسیر سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ "اسلام" ایمان کے بغیر بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کا اپنے آپ کو مومن کہنا خلاف حکم قرآن ہے۔ یہ دونوں باتیں آیت مذکور کے معنی اور سیاق و سباق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ وہاں دراصل "اسلام" اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ لغوی معنوں میں آیا ہے۔ اس کے مخاطب اہل بادیہ (یعنی اعراب) ہیں جو پوری طرح اسلام کو نہیں سمجھتے تھے، اور صرف اس کے سیاسی تفوق سے مرعوب ہو کر مطیع ہو گئے تھے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ "تم اپنے آپ کو مومن نہیں کہہ سکتے صرف مسلم (مطیع) کہہ سکتے ہو کیونکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ اگر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرو گے تو اس کا اجر تم کو حق کے مطابق ضرور ملے گا۔ مگر سچے مومن تو دراصل وہی ہیں جن کے دل میں اللہ کی یکتائی اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پورا پورا یقین موجود ہے، کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔" ان الفاظ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جس اسلام کا ذکر ہے وہ محض اس اطاعت کے معنی میں ہے جو ایمان کے بغیر حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن عام طور پر قرآن مجید نے "اسلام" کی اصطلاح جس معنے میں استعمال کی ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت دونوں کو شامل ہے۔ اسلام کی حقیقت ایمان کے بغیر متحقق ہی نہیں ہوتی، اور وہ "مسلم" ہی نہیں کہا جا سکتا جو مومن نہ ہو۔ کیونکہ "اسلام" خدا کا "دین" ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳: ۲) اور خدا کا دین جوارح سے پہلے قلب کی اطاعت چاہتا ہے۔ پس اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے وہ سب سے پہلے "مومن" ہے اور اس کو ایمان کا دعوی کرنے سے ہرگز منع نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس دعوی کی صریح اجازت موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (۳: ۲)۔ رہا وہ استدلال

جو جناب مولف نے فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنفُسَکُمْ سے کیا ہے تو وہ کسی طرح درست نہیں کیونکہ یہ ارشاد جس موقع پر ہوا ہے وہاں تو یہ بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ جس نے تم کو پیدا کیا ہے، تمہاری کمزوریوں سے خوب واقف ہے۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو تمہارا رب جو "واسع المغفرت" ہے تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو بخش دیگا۔ لہٰذا تم اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کون کتنا متقی ہے (ملاحظہ ہو سورہ نجم رکوع دوم)۔

عقیدۂ تقدیر صفحہ ۵۷ پر اجزار ایمان بیان کرتے ہوے حاشیہ پر فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآن میں ایمان کے صرف یہی پانچ اجزار ثابت ہوتے ہیں۔ تقدیر قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ عقائد میں داخل نہیں"

یہ عبارت اس قدر مبہم ہے کہ پوری طرح مؤلف کا مطلب ظاہر نہیں ہوتا ہم نہیں کہہ سکتے کہ "قرآنی مسائل" سے مولف کی مراد کیا ہے؟ اور تقدیر کے مسئلہ کو عقائد سے خارج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولف کی رائے میں عقیدۂ تقدیر جزو ایمان نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ جناب مؤلف نے اس مسئلہ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ عقیدۂ تقدیر منجملہ ان عقاید کے ہے جو ایمان باللہ کے اجزار ہیں۔ جس طرح خدا کے سمیع، بصیر، علیم، خالق اور رزاق وغیرہ ہونے پر اعتقاد رکھنا جزو ایمان ہے، اسی طرح یہ اعتقاد بھی جزو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی قضار اور مشیت کے خلاف کسی شئے اور کسی فعل کا صدور نہیں ہو سکتا اور نہ اگر صفات الٰہی میں سے ہر ہر صفت کے بیان کو قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ کہہ کر عقائد سے خارج کر دیا جائے تو پھر ایمان باللہ کس چیز کا نام رہ جائیگا؟ ایمان باللہ تو انہی تفصیلات کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے وجود اور اس کی یکتائی پر ایمان لانا ہرگز کافی نہیں ہے۔

علماء وصلحار کا اتباع صفحہ ۸۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ علمار اور صلحار کو امام اور ہادی مان کر ان کے

اقوال کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کرنا"

اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ۔

ائمہ سلف اور بزرگان دین کے علوم اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے دین ماننا شرک ہے"۔

پھر صفحہ ۱۰۲ پر لکھتے ہیں کہ "کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے" اور صفحہ ۱۵۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "رسول اور امیر کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے"۔ اور صفحہ ۱۵۴ پر فرماتے ہیں "بلکہ عام طور پر انسانوں کی اطاعت کو قرآن خطرناک قرار دیتا ہے"۔

یہ سب کچھ تشدد درعمل ہے مسلمانوں میں جاہل پیروں اور نفس پرست علماء سوء کی اندھی تقلید اور جاہلانہ اطاعت کے جو آثار نظر آتے ہیں ان پر جتنا بھی اظہار غضب کیا جائے، جائز اور بجا ہے لیکن افسوس ہے کہ مؤلف نے شدت غیظ میں علماء حق اور صلحاء امت اور ائمہ ھداۃ کی اطاعت اور پیروی کو بھی گمراہی قرار دے دیا ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہدیا حالانکہ اگر وہ انہی آیات قرآنی پر غور فرماتے جن کو انہوں نے استدلال میں پیش کیا ہے، تو انہیں خود احساس ہوجاتا کہ وہ حق سے بہت کچھ تجاوز کر گئے ہیں شرک جس چیز کا نام ہے وہ تو بغیر اس کے متحقق نہیں ہوسکتی کہ کوئی شخص خدا کے سوا کسی دوسرے کو حقیقی معنوں میں آمر اور ناہی قرار دے، یا خدا کے امر و نہی کے مقابلہ میں یا اس کے برابر کسی اور کے امر و نہی کو واجب الاطاعت سمجھے لیکن یہ مخفی نہیں ہے اور غالباً جناب مؤلف خود بھی جانتے ہونگے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں شرک کا تو شائبہ بھی نہیں ہے۔ جو شخص کسی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ہے اور اس کی شریعت اور اس کے احکام کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر جانتا ہے، وہ اگر اس کی پیروی یہ سمجھ کر کرے کہ اس کی پیروی رضائے الٰہی کی پیروی ہے تو اس پر شرک کا فتویٰ لگانا

صریح ظلم ہوگا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کس کا اتباع کرنا جائز ہے اور کس کا اتباع گمراہی ہے۔ تو قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ (۳۳: ۱) وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸: ۴) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶۸: ۱) وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۷۶: ۲) یعنی کافروں اور منافقوں اور خدا کو بھول جانے والوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں، اور افراط پسندوں، حق کو جھٹلانے والوں اور گناہ گار ناشکروں کی پیروی نہ کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶: ۶) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۶: ۱۰) یعنے اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو، اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کیا کرو۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، مولف نے صحیح اور غلط کو خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی افراط پسندی کی رو میں بہ گئے ہیں جو آج کل کے تجدد پسند حضرات میں پائی جاتی ہے۔ علماء اور صلحاء کرام کو ہادی ماننا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ غیر عالم اور غیر صالح کے لئے ان کی امامت و ہدایت کو قبول کرنا لازم ہے البتہ ان کے قول کو اللہ کے قول کی طرح سمجھنا ضرور گناہ ہے۔ اسی طرح یہ درست ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے لیکن جو شخص یہ سمجھ کر بزرگوں کی پیروی کرے کہ وہ خود کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتا اور بزرگان سلف نے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں، تو اس کو کسی طرح گمراہ نہیں کہا جا سکتا زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے پیروی کے لئے جن بزرگوں کو چن لیا ہے ان کا انتخاب درست نہیں ہے۔ آپ تقلید جامد اور اندھی پیروی کی جتنی چاہیں برائی کر سکتے ہیں۔ سب بجا اور درست آپ یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ ولایت، امامت، اجتہاد اور علم و فضیلت بزرگوں پر ختم نہیں ہوگئیں، آج بھی یہ سب مرتبے حاصل ہو سکتے ہیں، اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے لیکن تقلید کی مخالفت اور اجتہاد کا شوق اگر اس حد تک پہنچ جائے کہ بزرگان سلف کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو جائے، اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو خواہ مخواہ

ڈھادینا ہی ضروری سمجھ لیا جائے، اور محض نئی بات پیدا کرنے کی خاطر جدت طرازیاں کی جائیں، اور لوگ اہلیت کے بغیر امامت اور اجتہاد کے منصب پر متمکن ہونے کی کوشش کریں، اور کتاب اللہ وسنت رسول کو بازیچۂ اطفال بنالیں تو یہ گمراہی پہلی گمراہی سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ اور اس ذہنیت کے ساتھ جس قوم کی تعمیر کی جائے گی اس کی تعمیر عین تخریب ہوگی۔ مقلدین تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ جو دیواریں ان کے اسلاف اٹھا گئے ہیں ان کو بجنسہ رہنے دیتے ہیں اور ان پر کوئی اضافہ نہیں کرتے لیکن تجدد پسند حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ پچھلی دیواروں کو ڈھا کر خود نئی دیواریں اٹھائیں۔ اور اس ذہنیت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ہر نئے دور والے پچھلے دور والوں کی اٹھائی ہوئی دیواروں کو ڈھا کر نئی دیواریں اٹھایا کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی عمارت بنتے ہی نہ پائے گی اور ہدم و تعمیر کا ایک لاتنا ہی سلسلہ جاری رہے گا۔

علم غیب رُسل صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے۔

"رسول کو عالم غیب سے وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کو اللہ ان کے توسط سے اپنے بندوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔"

استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے :۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا	وہ غیب کا عالم ہے، اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا
اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ	البتہ جس رسول کو پسند کرتا ہے اسے غیب سے باخبر کردیتا
مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا	ہے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے
رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (۷۲: ۲)۔	پیغام پہونچادیے۔

مگر یہ آیت اُس مفہوم کی تصریح نہیں کرتی جو مؤلف نے اس سے اخذ کیا ہے۔ آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم مختلف فیہ ہے۔ بعض کے نزدیک لِيَعْلَمَ کا فاعل خدا ہے اور بعض کے نزدیک رسول۔ اسی طرح قَدْ اَبْلَغُوْا کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ اس سے مراد آیا وہ فرشتے ہیں جو خدا کے پیغامات رسول کے پاس لاتے ہیں۔

یا خدا کے پیغمبر میں۔ تاہم اگر اس فقرہ کا یہ ترجمہ بھی کیا جائے کہ خدا اپنے رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تاکہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ رسول نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے۔ تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ رسولوں کو عالم غیب کی صرف وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے واسطے سے اپنے بندوں کو بتانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے معنی یہ ہونے کہ غیب کے متعلق عام بندوں کا علم رسولوں کے علم کے برابر ہے اور رسولوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا گیا جو بندوں کو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا اِنِّی اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۱۱) میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دیدی گئیں اور انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دیدی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی۔ خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا کہ یا امۃ محمد واللہ لَوْ تَعْلَمُوْنَ ما علمت لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیرا۔ (بخاری۔ باب الصدقۃ فی الکسوف)۔ اے محمدؐ کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے ایک اور موقع پر حضور نے فرمایا کہ۔ اِنی لارٰاکم من ورائی کما اراکم (بخاری باب عظمۃ امام الناس) میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں غرض بکثرت آیات اور روایات اس کی دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد ایمانیہ سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات بھی حاصل ہونی چاہئیں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لئے مددگار ہوں جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے

اسرار سے وائسرائے اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوتا ہے، اسی طرح ملکوت الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمایندے اور اس کے خلفاء جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے۔ یہ علم غیب ان خلفاء کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا کے لئے اس علم کی نہ ضرورت ہے اور نہ وہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

متفرق مسائل مذکورہ بالا امور کے علاوہ کتاب میں چند چھوٹی چھوٹی لغزشیں بھی ہیں۔ چونکہ اس تنقید کا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے اس لئے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ان میں سے بعض کی طرف فاضل مولف کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہے۔ مثلاً۔

متعدد مقامات پر استوار علی العرش کا ترجمہ عرش پر بیٹھنا کیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ اول تو حق تعالیٰ کے لئے "بیٹھنے" کا لفظ استعمال کرنے میں تشبیہ و تجسیم کا اندیشہ ہے۔ دوسرے خود لغت کی رو سے بھی لفظ استوا جلوس کا ہم معنی نہیں۔ جب استوار کے لئے علیٰ کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی استیلا یعنی چھا جانے اور غالب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر عرش سے کوئی مادی تخت نہیں بلکہ زمین و آسمان اور کل جہان کی حکومت مراد لی جائے تو اس پر مستوی ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالم کی فرمانروائی پر چھایا ہوا ہے۔

صفحہ ۷۲ پر سات آسمانوں اور سات زمینوں کا حساب سمجھانے کی کوشش کی ہے اس میں شک نہیں کہ بات لگتی ہوئی ہے اور جس طریقے سے انھوں نے سمجھایا ہے اس سے وہ اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں جو نئے زمانے کے اہل ہیئت کی طرف سے کئے جاتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ایسے بیانات کو کسی عہد کے علوم و نظریات سے مطابق کرنے کی سعی کرنا اصولاً صحیح نہیں ہے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان مسائل میں سکوت اختیار کیا جائے اور ایسی آیتوں کے معنی و مفہوم کو دلالت لفظی سے تجاوز کر کے قیاس و تاویل کے ساتھ متعین کرنے کا طریقہ قطعاً ترک

کر دیا جائے۔ اسی طرح آسمانوں کے طبق برطبق ہونے اور ان کے محفوظ ہونے کو ہیئت کی جدید معلومات کے لحاظ سے سمجھانے کی جو کوشش صفحہ ۴۰ پر کی گئی ہے اور واللہ انبتکم من الارض نباتاً اور وقد خلقکم اطوارا سے نظریہ ارتقا کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے، اس سے بھی احتراز واجب تھا۔ پرانے زمانے کے علما یہ غلطی کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو انھوں نے قدیم فلسفہ اور ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس زمانے کے بندگان عقل کو مطمئن کرنے کے لئے قرآن کو ارسطو اور افلاطون اور بطلیموس کے نظریات پر منطبق کر ڈالا لیکن موجودہ دور کے نظری اور تجربی علوم نے جب پچھلے نظریات کو باطل کر دیا تو وہ تمام تاویلیں جو پہلے کی گئی تھیں غلط ثابت ہوئیں اور وہ تمام سہارے ٹوٹ گئے جن پر قرآن مجید کی تاویل کا مدار رکھا گیا تھا۔ پھر سید احمد خانی دور میں دوبارہ اسی غلطی کا اعادہ کیا گیا۔ مگر سائنس کی جدید ترقیات نے ان سہاروں میں سے بھی بہتوں کو توڑ دیا جن پر سید مرحوم اور ان کے متبعین نے تاویل کی عمارت قائم کی تھی۔ ان تجربات سے ہم کو سبق لینا چاہئے اور یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ قرآن کے لئے انسانی علوم کے سہاروں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس کتاب میں تو فاطر السموٰت والارض کا علم ہے جو ظن اور تخمین نہیں بلکہ علم حق اور عین حق ہے یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو ہاں ممکن ہے کہ اس کی بعض باتیں ہمارے اس وقت کے علوم (یا بصحیح معنوں میں ظنون) اور نظریات کے خلاف ہوں، لیکن اس کی کسی بات کا ان کے خلاف ہونا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کل جب علم کی مزید روشنی ہم کو حاصل ہو تو خود ہمارا نظریہ ہی بدل جائے، ہم پر کچھ مزید حقائق منکشف ہوں اور اس وقت ہم کو اس بات کے صحیح معنے معلوم ہو جائیں جو قرآن میں ارشاد ہوئی ہے۔

اب چند اہم مسائل باقی رہ گئے ہیں جن میں ہم کو فاضل مؤلف سے بشدت اختلاف ہے۔ ان پر انشاء اللہ آئندہ صحبت میں گفتگو کی جائے گی۔ (باقی آئندہ)

مطبوعات

قرآن کریم اور ایک غلط فہمی کا ازالہ

از خان بہادر حاجی رحیم بخش ایم اے ضخامت ۳۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ غالباً حاجی صاحب نے افادۂ عام کی غرض سے شایع کی ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ ۱۱ فرید کورٹ روڈ۔ لاہور۔

عالم خیال ہے۔ اور جتنا عام ہے۔ اتنا ہی جاہلانہ اور بے بنیاد ہے کہ "قرآن مجید کی موجودہ ترتیب بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے عمل میں نہیں آئی"۔ یہ خیال احادیث و آثار سے بے خبری اور فتنہ پرداز یوں کی فتنہ پردازیوں نے پیدا کیا اور عام کیا۔ احادیث و آثار سے ثابت ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی مطلق گنجایش نہیں ہے، کہ قرآن حکیم اول سے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں لکھا اور مرتب کیا جاچکا تھا حتّٰی کہ سورتوں کے نام بھی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی نے مقرر فرمائے تھے۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بارہا اعادہ کرتے سماعت فرمایا تھا۔ اور وہی قرآن جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں لکھا اور مرتب کیا گیا تھا۔ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

اردو میں اس موضوع پر مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی مونگیری استاذ جامعہ عثمانیہ کی محققانہ کتاب "تاریخ القرآن" پہلی اور بہترین کتاب ہے۔ اور اس جاہلانہ خیال کی قاطع ہے۔

جناب حاجی رحیم بخش صاحب نے نئے اسلوب سے' جو ان کے فہم وتدبر پر دلالت کرتا ہے' خود کلام اللہ ہی سے اس جاہلانہ خیال کا رد کیا ہے اور جناب مفتی صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب منجانب اللہ ہے"۔

رسائل دارۂ اصلاح نوجوانان، سیالکوٹ

از پروفیسر حکیم عبدالحمید صاحب سیالکوٹ۔

حکیم عبدالحمید صاحب اور ان کے احباب نے "ادارۂ اصلاح نوجوانان" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جو اب سیالکوٹ منتقل ہو گئی ہے اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو عموماً اور کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلم نوجوانوں کو خصوصاً تاریخ اسلام و دین اسلام سے آگاہ اور صحیح اسلامی ذہنیت سے آشنا کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض سے حکیم صاحب نے درس قرآن و دعوت اسلام و تقابل ادیان کی تعلیم و تدریس کا اہتمام کیا ہے اور اسی سلسلہ میں افادۂ عام کی غرض سے مندرجۂ ذیل رسائل شائع کئے ہیں۔ مذہب معیار، مذہب دعوت عمل۔ اخلاق نبوی۔ الاسلام، صداقت اسلام۔ یہ تمام رسالے مفید مضامین پر مشتمل ہیں۔ جو اصحاب مطالعہ کرنا چاہیں چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمالیں۔

قاسم العلوم | مرتب:۔ مولوی عتیق احمد صاحب صدیقی حجم ۳۲ صفحات۔ قیمت سالانہ عہ ۔ رعایتی قیمت عہ دفتر قاسم العلوم دار العلوم دیوبند، ضلع سہارنپور۔

دار العلوم دیوبند سے ایک زمانے میں "القاسم" اور "الرشید" نامی رسالے نکلتے تھے "القاسم" بھی زمانۂ دراز تک علم کی خدمت انجام دیتا رہا ہے۔ اب ان رسالوں کی جگہ "قاسم العلوم" نے لے لی ہے۔ دو نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں۔

ضرورت تھی کہ دار العلوم دیوبند سے ایسا رسالہ جاری ہوتا جو نہ صرف اس کے علوم و معارف کا حامل ہوتا بلکہ بحالات موجودہ علمی حیثیت سے مسلمانان ہند کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دیتا۔ قاسم العلوم کے لائق مرتب کی خدمت میں ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ رسالہ کو بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند بنانے کی کوشش کریں کہ حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمۃ کی مناسبت، اور دار العلوم کی شاندار علمی روایات کا یہی اقتضا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی کم قیمت میں زیادہ ضخامت اور بلند معیار کا رسالہ طیار نہیں ہو سکتا لیکن کیا ضرورت ہے کہ رسالہ کو عام پسند بنانے کے لئے اپنے معیار کو پست کیا جائے آج کل عام پسندی تو فلمی اور افسانوی رسالوں کے حصہ میں آچکی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا مخلصانہ مشورہ درخور اعتنا ہوگا۔

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حکومت اور فرمانروائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ۔ دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ۔ پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اسی کے افکار پر ایمان لے آئیں۔ اسی کے تخیلات، اسی کے معتقدات، اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں۔ ذہنیتیں اسی کے سانچے میں ڈھلیں۔ تہذیب اسی کی تہذیب ہو، علم اسی کا علم ہو۔ اسی کی تحقیق کو حقیقت سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھیرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھیرائے۔ دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی قوتوں کے اعتبار سے اتنی قوی بازو ہو جائے کہ دوسری قومیں اس کے مقابلہ میں اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظم مملکت پر حاوی ہو جائے۔

اس کے مقابلہ میں مغلوبیت اور محکومیت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت، دوسری سیاسی مغلوبیت۔ ان دونوں قسموں کی صفات کو ان صفات کا عکس سمجھ لیجئے جو اوپر غلبہ کی دو قسموں کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

یہ دونوں قسمیں ایک اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو۔ لیکن

قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی، اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے، اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ نتیجہ ہے قوت کا، اور مغلوبیت نتیجہ ہے کمزوری کا، اس لئے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کرتی جاتی ہیں، اُسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں، اور طاقت ور۔۔۔ ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقتور۔۔۔ قومیں ان کے دماغ اور ان کے جسم دونوں پر حکمران ہو جاتی ہیں۔

مسلمان آج کل اسی دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسموں کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں۔ اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری نصیب بھی ہے، وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہیں۔ ان کے مدرسے، ان کے دفتر، ان کے بازار، ان کی سوسائٹی، ان کے گھر حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دیتے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب، مغرب کے افکار، مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے، اور وہ باطل ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق، صداقت، تہذیب، اخلاق، انسانیت، شائستگی، ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے۔ اپنے دین و ایمان، اپنے افکار و تخیلات، اپنی تہذیب و شائستگی، اپنے اخلاق و آداب، سب کو وہ اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے اُسے

درست سمجھتے ہیں مطمئن ہوتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کر دے۔

جب ہماری آزاد قوموں کا یہ حال ہے، تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا۔

اس غلامی کا سبب کیا ہے؟ اس کی تشریح کے لئے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے مگر مختصراً اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ذہنی غلبہ واستیلاء کی بنا، دراصل فکری اجتہاد اور علمی تحقیق پر قائم ہوتی ہے جو قوم اس راہ میں پیش قدمی کرتی ہے وہی دنیا کی رہنما بن جاتی ہے، اور اسی کے افکار دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ اور جو قوم اس راہ میں پیچھے رہ جاتی ہے اس کے افکار و معتقدات میں یہ قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ دماغوں پر اپنا تسلط قائم رکھ سکیں بلکہ کسی دوسری مجتہد و محقق قوم کے طاقتور افکار و معتقدات کا سیلاب ان کو خود اپنی جگہ پر بھی نہیں ٹھیرنے دیتا۔ مسلمان جب تک تحقیق واجتہاد کے میدان میں آگے بڑھتے رہے، تمام دنیا کی قومیں ان کی پیرو اور مقلد رہیں۔ اسلامی فکر ساری نوع انسانی کے افکار پر غالب رہی حسن اور قبح، نیکی اور بدی، غلط اور صحیح کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام دنیا کے نزدیک معیار قرار پایا، اور قصداً یا اضطراراً دنیا اپنے افکار و اعمال کو اسی معیار کے مطابق ڈھالتی رہی۔ مگر جب مسلمانوں میں ارباب فکر اور اصحاب تحقیق پیدا ہونے بند ہو گئے، جب انہوں نے سوچنا اور دریافت کرنا چھوڑ دیا، جب وہ اکتساب علم کی راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تو گویا انہوں نے خود دنیا کی رہنمائی سے استعفا دیدیا۔ دوسری طرف مغربی قومیں اس راہ میں آگے بڑھیں۔ انہوں نے غور و فکر کی قوتوں سے کام لینا شروع کیا

انہوں نے کائنات کے راز ٹٹولے، اور فطرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے خزانے تلاش کیے' اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ مغربی قومیں دنیا کی رہنما بن گئیں، اور مسلمانوں کو اسی طرح ان کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا جس طرح کبھی دنیا نے خود مسلمانوں کے اقتدار کے آگے خم کیا تھا۔

چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے، اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا۔ نیند کے ماتے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ یورپ قلم اور تلوار دونوں سے مسلح ہے، اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی جماعت نے مدافعت کی کوشش کی مگر نہ قلم کا زور تھا نہ تلوار کا، شکست پر شکست کھاتی چلی گئی۔ رہا قوم کا سواد اعظم تو اس نے اسی سنت پر عمل کیا جو ہمیشہ سے کمزوروں کی سنت رہی ہے۔ تلوار کے زور، استدلال کی قوت، علمی شواہد کی تائید اور نظر فریب حسن و جمال کے ساتھ جو خیالات، نظریات اور اصول مغرب سے آئے، آرام طلب دماغوں اور مرعوب ذہنیتوں نے ان کو ایمان کا درجہ دے دیا۔ پرانے مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، اور تمدنی آئین جو محض روایتی بنیادوں پر قائم رہ گئے تھے، اس نئے اور طاقتور سیلاب کی رو میں بہتے چلے گئے۔ اور ایک غیر محسوس طریقے سے دلوں میں یہ مفروضہ جاگزیں ہو گیا کہ جو کچھ مغرب سے آتا ہے وہی حق ہے، اور وہی صحت و درستی کا معیار ہے۔

مغربی تہذیب کے ساتھ جن قوموں کا تصادم ہوا ان میں سے بعض تو وہ تھیں جن کی کوئی مستقل تہذیب نہ تھی۔ بعض وہ تھیں جن کے پاس اپنی ایک تہذیب تو تھی مگر ایسی مضبوط نہ تھی کہ کسی دوسری تہذیب کے مقابلہ میں اپنے خصائص کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی۔ بعض وہ تھیں جن کی تہذیب اپنے اصول میں اس

آنے والی تہذیب سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسی تمام قومیں تو بہت آسانی سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئیں، اور کسی شدید تصادم کی نوبت نہ آنے پائی لیکن مسلمانوں کا معاملہ ان سب سے مختلف ہے یہ ایک مستقل اور مکمل تہذیب کے مالک ہیں۔ ان کی تہذیب اپنا ایک مکمل ضابطہ رکھتی ہے جو فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اور بدقسمتی سے مغربی تہذیب کے اساسی اصول کلیۃً اس تہذیب کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر یہ دونوں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اور ان کے تصادم سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی زندگی کے ہر شعبے پر نہایت تباہ کن اثر پڑ رہا ہے۔

مغربی تہذیب نے جس فلسفہ اور سائنس کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ وہ پانچ چھ سو سال سے دہریت، الحاد، لامذہبی اور مادہ پرستی کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ جس تاریخ پیدا ہوئی اسی تاریخ سے مذہب کے ساتھ اس کی لڑائی شروع ہوگئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی ہی نے اس تہذیب کو پیدا کیا۔ اگرچہ کائنات کے آثار کا مشاہدہ، ان کے اسرار کی تحقیق، ان کے کلی قوانین کی دریافت، ان کے مظاہر پر غور و فکر، اور ان کو ترتیب دیکر قیاس و برہان کے ذریعہ سے نتائج کا استنباط، کوئی چیز بھی مذہب کی ضد نہیں ہے، مگر سوء اتفاق سے نشاۃ جدیدہ (Renaissance) کے عہد میں جب یورپ کی نئی تحریک رونما ہوئی تو اس تحریک کا مقابلہ ان عیسائی پادریوں سے ہوا جنہوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو قدیم یونانی فلسفہ و حکمت کی بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا، اور یہ سمجھتے تھے کہ اگر جدید علمی تحقیقات اور فکری اجتہاد سے ان بنیادوں میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہوا تو اصل مذہب کی عمارت پیوند خاک ہوجائیگی۔ اس غلط تخیل کے زیر اثر انہوں نے نئی علمی تحریک کی مخالفت کی اور اس کے روکنے کے لئے قوت سے کام لیا، مذہبی عدالتیں (Inquisitions) قائم کی گئیں۔

جن میں اس تحریک کے علمبرداروں کو سخت وحشیانہ اور ہولناک سزائیں دی گئیں۔ لیکن یہ تحریک ایک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لئے تشدد سے دبنے کے بجائے اور بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حریت فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

ابتداءً یہ لڑائی حریت فکر کے علمبرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان تھی۔ مگر چونکہ مذہبی پیشوا، مذہب کے نام پر آزاد خیالوں سے جنگ کر رہے تھے، اس لئے بہت جلدی اس لڑائی نے مسیحیت اور آزادی خیال کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد نفس مذہب (خواہ وہ کوئی مذہب ہو) اس تحریک کا مد مقابل بن گیا۔ سائنٹفک طریقہ پر سوچنے کے معنی یہ قرار پائے کہ یہ طریق فکر، مذہبی طریق فکر کی عین ضد ہے۔ جو شخص اس طریق سے کائنات کے مسائل پر غور کرے اس پر لازم ہو گیا کہ مذہبی نظریہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالے۔ کائنات کے مذہبی نظریہ کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ عالم طبیعت کے تمام آثار اور جملہ مظاہر کی علت کسی ایسی طاقت کو قرار دیا جائے جو اس عالم سے بالاتر ہو۔ یہ نظریہ چونکہ جدید علمی تحریک کے دشمنوں کا نظریہ تھا، اس لئے جدید تحریک کے علمبرداروں نے لازم سمجھا کہ خدا، یا کسی فوق الطبیعت (Supernatural) ہستی کو فرض کئے بغیر کائنات کے معمے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ہر اس طریقہ کو خلاف حکمت (Unscientific) قرار دیں جس میں خدا کا وجود فرض کر کے مسائل کائنات پر نظر کی گئی ہو۔ اس طرح نئے دور کے اہل حکمت و فلسفہ میں خدا، اور روح یا روحانیت، اور فوق الطبیعت کے خلاف ایک تعصب پیدا ہو گیا، جو عقل و استدلال کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سراسر جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ تھا۔ وہ خدا سے اس لئے بیزار نہ تھے کہ دلائل و براہین سے اس کا عدم وجود اور عدم وجوب ثابت ہو گیا تھا؛ بلکہ وہ اس سے اس لئے بیزار تھے کہ وہ ان کے اور ان کی آزادی خیال کے دشمنوں کا معبود تھا۔ بعد کی پانچ صدیوں میں

ان کی عقل و فکر اور ان کی علمی جد و جہد نے جتنا کام کیا اس کی بنیاد میں یہی غیر عقلی جذبہ تھا۔

مغربی فلسفہ اور مغربی سائنس دونوں نے جب سفر شروع کیا تو ان کا رخ خدا پرستی کے بالکل مخالف سمت میں تھا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ خدا پرستی سے قریب تھے اور نیچریت (Naturalism) کو خدا پرستی کے ساتھ ساتھ نباہنا چاہتے تھے، مگر جوں جوں وہ اپنے سفر میں آگے بڑھتے گئے، نیچریت خدا پرستی پر غالب آتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ خدا کا تخیل، اور خدا کے ساتھ ہر اس چیز کا تخیل جو عالم طبیعت سے بالاتر ہو ان سے بالکل غائب ہوگیا، اور وہ اس انتہا پر پہنچ گئے کہ مادہ و حرکت کے سوا کوئی شئے ان کے نزدیک حقیقی نہ رہی۔ سائنس اور نیچریت کا ہم معنی قرار پایا، اور اہل حکمت و فلسفہ کا ایمان اس نظریہ پر قائم ہوگیا کہ ہر چیز جو قابل حساب و پیمائش نہیں ہے، اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

مغربی فلسفہ و سائنس کی تاریخ اس بیان کی شاہد ہے۔ ڈیکارٹ Descartes (متوفی ۱۶۵۰ء) جو مغربی فلسفہ کا آدم سمجھا جاتا ہے ایک طرف تو خدا کا زبردست قائل ہے، اور مادہ کے ساتھ روح کا مستقل وجود بھی مانتا ہے، مگر دوسری طرف وہی فلسفی ہے جس نے عالم طبیعت کے آثار کی توجیہ میکانکی (Mechanical) طریق پر کرنے کی ابتدا کی اور اس طریق فکر کی بنا رکھی جو بعد میں سراسر مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔ ہابس (Hobbes) (م ۱۶۷۹ء) اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ وہ فوق الطبیعت (Supernatural) کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، نظام عالم اور اس کی ہر شے کو میکانکی توجیہ کے قابل قرار دیتا ہے، اور کسی ایسی نفسی یا روحی یا عقلی قوت کا قائل نہیں ہے جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ خدا کو بھی مانتا ہے اس حیثیت سے کہ ایسی ایک علت العلل کا ماننا ایک عقلی ضرورت ہے۔ اسی زمانہ میں اسپائنوزا Spinoza

م ۱۶۵۰ء) تھا جو سترہویں صدی میں عقلیت (Rationalism) کا سب سے بڑا علمبردار تھا مگر اس نے مادہ اور روح اور خدا کے درمیان کوئی فرق نہ رکھا، خدا اور کائنات کو ملا کر ایک کل بنا دیا، اور اس کل میں خدا کے اختیار مطلق کو تسلیم نہ کیا۔ لائبنز (Leibniz م ۱۷۱۶ء) اور لاک (Locke م ۱۷۰۴ء) بھی خدا کے قائل تھے، مگر دونوں کا میلان تجربیت کی جانب تھا۔

یہ سترہویں صدی کا فلسفہ تھا جس میں خدا پرستی اور تجربیت دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اسی طرح سائنس نے بھی سترہویں صدی تک کامل الحاد کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ کوپرنکس (Copernicus) کپلر (Kepler) گیلیلیو (Galileo) نیوٹن (Newton) اور سائنس کے دوسرے علمبرداروں میں سے کوئی بھی خدا کا منکر نہ تھا۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو میں الٰہی نظریہ سے قطع نظر کر کے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے، جو اس نظام کو چلا رہی ہیں، اور ان قوانین کو معلوم کرنے کے خواہشمند تھے جن کے تحت یہ نظام چل رہا ہے۔ یہ الٰہی نظریہ سے قطع نظر کرنا ہی دراصل اس دہریت اور تجربیت کا تخم تھا جو بعد میں حریت فکر کے درخت سے پیدا ہوئی لیکن سترہویں صدی کے حکماء کو اس کا شعور نہ تھا۔ وہ تجربیت اور خدا پرستی میں کوئی خط امتیاز نہ کھینچ سکے، اور یہی سمجھتے رہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں۔

اٹھارویں صدی میں یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کر کے نظام کائنات کی جستجو کرے گا، وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس صدی میں جان ٹولینڈ (John Toland) ڈیوڈ ہارٹلے (David Hartley) جوزف پریسٹلے (Joseph Priestley) والٹیر (Voltaire) لامیٹری (La Mettrie) ہولباخ (Holbach) کیبانیس (Cabanis) ڈینس ڈائیڈرو (Denis Diderot) مانٹسکیو (Montesquieu

روسو (Rousseau) اور ایسے ہی دوسرے آزاد خیال فلاسفہ وحکماء پیدا ہوئے جنہوں نے یا تو علانیہ خدا کے وجود سے انکار کیا، یا اگر بعض نے اسے تسلیم کیا بھی تو اس کی حیثیت ایک دستوری فرمانروا Constitutional Monarch) سے زیادہ نہ سمجھی جو نظام کائنات کو ایک مرتبہ حرکت میں لے آنے کے بعد گوشہ نشین ہوگیا ہے اور اب اس نظام کے چلانے میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عالم طبیعت، اور دنیائے مادہ وحرکت کے باہر کسی چیز کے وجود کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، اور ان کے نزدیک حقیقت صرف انہی چیزوں کی تھی جو ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہیں۔ ھیوم (Hume) نے اپنی تجربیت (Empjricism) اور فلسفہ تشکیک Scepticizm) سے اس طریق فکر کی زبردست تائید کی، اور معقولات کی صحت کے لئے بھی تجربہ ہی کو معیار قرار دینے پر زور دیا۔ برکلے Berkeley) نے مادیت کی اس بڑھتی ہوئی رو کا جانتوڑ مقابلہ کیا مگر وہ اس کو نہ روک سکا ھیگل Hegel) نے مادیت کے مقابلہ میں تصوریت (Idealism) کو فروغ دینا چاہا مگر ٹھوس مادے کے مقابلہ میں لطیف تصور کی پرستش نہ ہوئی۔ کانٹ (Kant) نے بیچ کی راہ بتائی۔ خدا کی ہستی، روح کا بقا، اور ارادہ کی آزادی ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو ہمارے علم میں آسکیں۔ یہ چیزیں جانی نہیں جا سکتیں۔ تاہم ان پر ایمان لایا جاسکتا ہے، اور حکمت عملی (Practicalreason) اس کی مقتضی ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے۔ یہ خدا پرستی اور نیچریت کے درمیان مصالحت کی آخری کوشش تھی لیکن ناکام ہوئی۔ کیونکہ جب عقل و فکر کی گمراہی نے خدا کو محض وہم کی پیداوار یا حد سے حد ایک معطل اور بے اختیار ہستی قرار دے لیا تو محض اخلاق کی حفاظت کے لئے اس کو ماننا، اس سے ڈرنا، اور اس کی خوشنودی چاہنا، سراسر ایک غیر عاقلانہ فعل تھا۔

انیسویں صدی میں مادیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ فوگت Vogt) بوخنر (Buchner

تسو لبے Czolbe کومت (Comte) موشات (Moleschott) اور دوسرے حکماء و فلاسفہ نے مادہ اور اس کے خواص کے سوا ہر شئے کے وجود کو باطل قرار دیا۔ مل (Mill) نے فلسفہ میں تجربیت، اور اخلاق میں افادیت (Utilitarianism) کو فروغ دیا۔ اسپنسر (Spencer) نے فلسفیانہ ارتقاء یت اور نظام کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور زندگی کے آپ سے آپ رونما ہو جانے کا نظریہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا۔ حیاتیات (Biology) عضویات (Phyciology) ارضیات (Geology) اور حیوانیات (Zoology) کے انکشافات، علمی سائنس کی ترقی اور مادی وسائل کی کثرت نے یہ خیال پوری پختگی کے ساتھ دلوں میں راسخ کر دیا کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، کسی نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ آپ سے آپ لگے بندھے قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ کوئی اس کو چلانے والا اور ان قوانین کو نافذ کرنے والا نہیں ہے۔ آپ سے آپ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ کسی فوق الطبیعت ہستی کا ہاتھ اس خود بخود حرکت کرنے والی مشین میں کام نہیں کر رہا ہے۔ بے جان مادے میں جان کہیں باہر سے نہیں ڈالی جاتی بلکہ خود مادہ جب نظم میں ترقی کرتا ہے، تو اس میں جان پڑ جاتی ہے، نمو حرکت ارادی، احساس، شعور، فکر، سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ حیوان اور انسان سب کے سب مشینیں ہیں جو طبیعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ان مشینوں کے پرزے جس طور سے ترتیب پاتے ہیں اسی طور کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اختیار اور کوئی آزاد ارادہ نہیں ہے۔ ان کے نظام کا درہم برہم ہو جانا، ان کی انرجی کا خرچ ہو جانا ہی ان کی موت ہے، جو فنائے محض کی ہم معنی ہے جب مشین ٹوٹ پھوٹ گئی تو اس کے خواص بھی باطل ہو گئے۔ اب ان کے لئے حشر اور بار دیگر پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

• ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس نیچریت اور مادیت کو استحکام بخشنے، اور ایک مدلل اور منظم

علمی نظریہ کی حیثیت دینے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی کتاب اصل الانواع Origin of species ، جو ۱۸۵۹ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی، سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے والی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ایک ایسے طریق استدلال سے جو انیسویں صدی کے سائنٹیفک دماغوں کے نزدیک استدلال کا محکم ترین طریقہ تھا، اس نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ کائنات کا کاروبار خدا کے بغیر چل سکتا ہے، آثار و مظاہر فطرت کے لئے خود فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں، زندگی کے ادنیٰ مراتب سے لیکر اعلیٰ مراتب تک موجودات کا ارتقاء ایک ایسی فطرت کے تدریجی عمل کا نتیجہ ہے جو عقل و حکمت کے جوہر سے عاری ہے۔ انسان اور دوسری انواع حیوانی کو پیدا کرنے والا کوئی صانع حکیم نہیں ہے، بلکہ وہی ایک جاندار اشین جو کبھی کیڑے کی شکل میں رینگا کرتی تھی، تنازع للبقاء، اور انتخاب طبیعی کے نتیجہ کے طور پر ذی شعور اور ناطق انسان کی شکل میں نمودار ہو گئی۔

یہی وہ فلسفہ اور سائنس ہے جس نے مغربی تہذیب کو پیدا کیا ہے۔ اس میں نہ کسی علیم و قدیر خدا کے خوف کی گنجایش ہے، نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن، نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیات دنیا کے حساب کتاب کا کوئی کھٹکا نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال۔ نہ زندگی کے حیوانی مقاصد، سے بالاتر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا کوئی امکان۔ یہ خالص مادی تہذیب ہے۔ اس کا پورا نظام خداترسی، راست روی صداقت پسندی حق جوئی، حسن اخلاق، دیانت، امانت، نیکی، حیا، پرہیزگاری، اور پاکیزگی کے ان تصورات سے خالی ہے جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نظریہ اسلام کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ اس کا راستہ اس راستہ کی عین مخالف سمت میں ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے، اسلام جن چیزوں پر انسانی اخلاق اور تمدن کی بنا رکھتا ہے، ان کو یہ تہذیب بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے۔ اور یہ تہذیب جن بنیادوں پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی

عمارت قائم کرتی ہے، ان پر اسلام کی عمارت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھیر سکتی۔ گویا اسلام اور مغربی تہذیب دو ایسی کشتیاں ہیں جو بالکل مخالف سمتوں میں سفر کر رہی ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کشتی پر سوار ہوگا اسے لامحالہ دوسری کشتی کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور جو بیک وقت ان دونوں پر سوار ہوگا اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔

اس کو بدقسمتی کے سوا اور کیا کہیے کہ جس صدی میں یہ تہذیب اپنی مادہ پرستی، الحاد اور دہریت کی انتہا کو پہنچی، ٹھیک وہی صدی تھی جس میں مراکش سے لے کر مشرق اقصیٰ تک تمام اسلامی ممالک مغربی قوموں کے سیاسی اقتدار، اور حاکمانہ استیلاء سے مغلوب ہوئے۔ مسلمانوں پر مغربی تلوار اور قلم دونوں کا حملہ ایک ساتھ ہوا۔ جو دماغ مغربی طاقتوں کے سیاسی غلبہ سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو چکے تھے، ان کے لئے مشکل ہو گیا کہ مغرب کے فلسفہ و سائنس اور اُن کی پروردہ تہذیب کے رعب و داب سے محفوظ رہتے خصوصیت کے ساتھ ان مسلمان قوموں کی حالت اور بھی زیادہ نازک تھی جو براہ راست کسی مغربی سلطنت کے زیر حکم آگئے تھے۔ ان کو اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کے لئے مجبوراً مغربی علوم حاصل کرنے پڑے، اور چونکہ یہ تحصیل علم، خالص تحصیل علم کی خاطر نہ تھی، اور مزید برآں ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا، اس لئے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹیفک نظریات کا اثر قبول کر لیا، ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں، ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ ان میں یہ صلاحیت ہی نہ پیدا ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ خود غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی رائے قائم کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قائم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں ذہنیتوں کا وہ سانچہ ہی بگڑ گیا ہے جس سے

اسلامی طریق پر سوچنا اور سمجھا جا سکتا تھا مغربی طریق پر سوچنے، اور مغربی تہذیب کے اصولوں پر اعتقاد رکھنے والے دماغوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ اس میں اسلام کے اصول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے اور جب اصول ہی اس میں نہیں سما سکتے تو فروع میں طرح طرح کے شبہات اور نت نئے شکوک پیدا ہونا ہرگز قابل تعجب نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سواد اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ سیاسی غلبہ و استیلا سے قطع نظر، مغرب کا علمی اور فکری داب و تسلط دنیا کی ذہنی فضا پر چھایا ہوا ہے اور اس نے نگاہوں کے زاویے اس طرح بدل دیے ہیں کہ دیکھنے والوں کے لئے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لئے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اشکال اس وقت تک دور نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں آزاد اہل فکر پیدا نہ ہونگے۔ اسلام میں ایک نشأۃ جدیدہ (Renaissance) کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے اس کو اب الٹے پاؤں ان منازل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں ہے جن سے وہ چھ سو برس پہلے گذر چکی ہے علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے فلسفہ نظام کی بنا رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو، ایک نئی حکمت طبیعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے، ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس

قائم کریں اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور اس میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مقصد و مدعا کو تمثیل کے پیرایہ میں یوں سمجھیے کہ دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس انجن کے ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں جو لوگ اس میں بیٹھے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اسی طرف جائیں جس طرف گاڑی جارہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر کوئی مسافر اس راہ پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رخ آگے کے بجائے پیچھے یا دائیں بائیں پھیر دے۔ مگر نشست کا رخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے۔ اور اس کی رفتار کو اُس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں، اور فکر اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے گاڑی اپنے مسافروں کو لئے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جارہی ہے، اور سب مسافر طوعاً و کرہاً اسلام کی منزل مقصود سے دور اور دور تر ہوتے چلے جارہے ہیں، اب اس رفتار کو بدلنے کے لئے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اٹھیں اور جد و جہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہوگا گاڑی کا رخ نہ بدلے گا، اور ہمارے جھنجھلانے بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہیگی جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

۱۶

ایمان

۵- ایمان بالیوم الآخر

نظام عالم ایک حکیمانہ نظام ہے | حیات اخروی کی ضرورت کا اثبات دراصل اس سوال کے تصفیہ پر موقوف ہے کہ آیا یہ کائنات کسی حکیم کا فعل ہے، یا بلا کسی حکمت کے آپ سے آپ بن گئی ہے؟

زمانۂ حال کا سائنس اور سائنٹیفک فلسفہ کہتا ہے کہ اس نظام کو کسی صانع حکیم نے نہیں بنایا یہ آپ سے آپ بن گیا ہے، اور ایک خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی طرح اپنے تمام اجزا سمیت (جن میں انسان بھی شامل ہے) چل رہا ہے۔ مادہ اور توانائی (Energy) کا باہمی تعامل جس روز ختم ہو جائیگا، اسی روز یہ نظام بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اس کا درہم برہم ہونا فنائے مطلق کا ہم معنی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ایک نظام، جس کو ایک اندھی طبیعت (Nature) بلا کسی علم، عقل، شعور، ارادہ اور حکمت کے چلا رہی ہے، اس میں کسی مقصدیت اور حکمت کی تلاش بالکل لاحاصل ہے۔ اسی وجہ سے سائنس نے آثار نتائج کی مقصدی تعلیل (Teleological Causation) کو اپنے حدود سے نہ صرف خارج کر دیا ہے بلکہ اس طریق فکر کو سرے سے لغو و بے معنی قرار دیا ہے، اور قطعیت کے ساتھ دعوی کیا ہے کہ اس کائنات اور اس کی کسی شے اور کسی فعل میں کوئی مقصد نہیں پایا جاتا۔ آنکھیں دیکھنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ دیکھنا نتیجہ ہے مادہ کی اس خاص تنظیم کا جو آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔ دماغ اس لئے نہیں ہے کہ سوچے اور شعور

و فکر کا محل بنے، بلکہ خیالات دماغ کے مادے سے اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح جگر سے صفرا نکلتا ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ اشیاء کے طبعی افعال کو ان کا مقصد قرار دیا جاتا ہے، اور ان کے وجود میں کسی حکمت اور کسی عقل کی جستجو کی جاتی ہے۔

اس نظریہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو حیات دنیوی کے بعد کسی حیات اخروی کی ضرورت تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہتی۔ کیونکہ جس کائنات کا نظام ایک اندھی بے عقل و شعور طبیعت کے ہاتھوں بلا کسی مقصد و غایت کے بغیر چل رہا ہے، اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اس کی ہر شے عبث ہے۔ عبث بنی ہے اور عبث ہی تمام ہو کر فنا ہو جائے گی۔ مستبعد ہے کہ ایسی اندھی طبیعت عدل کی صفت سے متصف ہو، اور اس سے کسی حساب کتاب، اور انصاف کی امید کی جائے۔ تاہم اگر بالفرض وہ عدل سے متصف ہو بھی، تو جبکہ انسان اس کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے اور اپنے اختیار سے کچھ کرنا تو درکنار، سرے سے کوئی اختیار اور کوئی ارادہ رکھتا ہی نہیں، تو اس پر اپنے کسی اچھے یا برے فعل کی اسی طرح کوئی ذمہ داری نہیں ہے جس طرح ایک موٹر پر اپنی راست روی یا کج روی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور ذمہ داری کا سوال اٹھ جانے کے بعد دنیا ہی میں عدل و انصاف اور جزا و سزا کا سوال منقطع ہو جاتا ہے، کجا کہ اس کی خاطر ایک دوسری زندگی کی ضرورت تسلیم کی جائے۔

لیکن یہ نظریہ سراسر خلاف عقل ہے، اور کوئی عقلی دلیل یا علمی شہادت ایسی نہیں پیش کی گئی جس سے اس کی صداقت ثابت اور مبرہن ہو جائے۔ اس کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا لب لباب بس اتنا ہے کہ ہم کو کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور کوئی چلانے والا نظر نہیں آتا۔ نہ اس کی پیدائش کا کوئی مقصد ہماری سمجھ میں آتا ہے۔ ہم اس کو کسی بنانے والے کے بغیر چلتا ہوا دیکھتے ہیں، اور اس کے چلنے کا مقصد معلوم کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے، نہ ہم کو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت۔ لیکن کسی شے کی علت فاعلی اور علت غائی نہ معلوم ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ اس کی کوئی علت غائی اور علت فاعلی ہے ہی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک بچہ کسی مطبع کی مشین کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مشین کس غرض سے چلائی گئی ہے اس بنا پر وہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض ایک کھلونا ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے چل رہا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جس طرح اس مشین سے آواز پیدا ہوتی ہے پرزے حرکت کرتے ہیں، زمین لرزتی ہے، اسی طرح کاغذ بھی چھپ چھپ کر نکلتے ہیں۔ اس بنا پر وہ حکم لگاتا ہے کہ جس طرح وہ افعال اس مشین کے چلنے کے نتائج ہیں اسی طرح کاغذوں کا چھپ چھپ کر نکلنا بھی اس کی حرکت کا ایک طبیعی نتیجہ ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تمام افعال جو اس سے صادر ہو رہے ہیں ان میں سے صرف ایک فعل یعنی کاغذوں کا چھپ کر نکلنا اس پوری مشین کے بنائے جانے کا مقصد ہے اور باقی تمام افعال مشین کی حرکت کے طبیعی نتائج ہیں۔ اس کی طفلانہ نظر مشاہدہ کی اتنی قوت نہیں رکھتی کہ اس مشین کے پرزوں میں ترتیب، تناسب اور نظم کو محسوس کر سکے، اور یہ دیکھ سکے کہ اس کا ہر پرزہ جس صورت پر بنایا گیا ہے، اور جس مقام پر لگایا گیا ہے وہی صورت اور وہی مقام اس کے لئے موزوں ہے اور مشین میں اپنے حصہ کا کام انجام دینے کے لئے وہ پرزہ اسی صورت کا اور اسی مقام پر ہونا چاہئے اس لئے بنا بریں وہ کند ذہن بچہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مشین یوں ہی لوہے کے ٹکڑوں کے باہم مل جانے سے آپ ہی آپ بن گئی ہے۔ اس کی عقلی قوتیں اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ وہ مشین کے افعال اور اس کی ترتیب کو دیکھ کر یہ قیاس کر سکے کہ اس کا بنانے والا ضرور کوئی حکیم شخص ہونا چاہئے جس نے ایسے اچھے اندازے، اور ایسے عمدہ نقشے پر ایسی مشین بنائی ہے جس کا کوئی پرزہ بیکار، غیر موزوں، غیر منضبط اور بے ضرورت نہیں ہے اور یہ کہ ایسی حکمت و دانائی کے ساتھ جو چیز بنائی گئی ہے وہ ہرگز بے مقصد بے مصلحت، اور عبث نہیں ہو سکتی اب اگر یہ پریس مشین کے اس ناقص مشاہدے اور اس پر اپنے ناقص غور و فکر سے وہ نادان بچہ یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ مشین کی کوئی علت فاعلی اور علت غائی نہیں ہے، نہ کوئی حکمت اس کے بنانے میں صرف ہوئی ہے، اور نہ کوئی حکیمانہ مقصد اس کی صنعت میں پیش نظر ہے، تو کیا کوئی عاقل و بالغ آدمی تسلیم کرے گا کہ بچہ نے اس مشین کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ قائم کیا ہے۔

اگر یہ بات ایک پریس مشین کے معاملے میں درست نہیں ہے تو اس نظام کائنات کے معاملہ میں کیوں کر درست ہو سکتی ہے جس کا ایک ایک ذرہ اپنے صانع کے علم، ارادے، حکمت، اور بصیرت پر شہادت دے رہا ہے۔ ناقص العقل اور کوتاہ بین بچہ جو چاہے کہے۔ مگر کوئی صاحب عقل آدمی تو جس نے آنکھیں کھول کر اس کائنات کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شک نہیں کر سکتا کہ ایسا محکم، استوار، مرتب اور متناسب نظام، جس میں کوئی شے بے کار اور عبث نہیں ہے، جس میں کوئی شے ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں ہے، جس کا ہر جز اپنے مقام اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک موزوں ہے، اور جس کے ضابطہ میں کہیں کوئی فتور نظر نہیں آتا، کسی حکمت، کسی علم، کسی ارادہ کے بغیر بن اور چل سکتا ہے۔

حکیمانہ نظام بے مقصد اور مہمل نہیں ہو سکتا قرآن مجید نے حیات اخروی کی ضرورت پر جو دلائل قائم کئے ہیں۔ وہ سب اسی بنیادی نظریہ پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کا بنانے والا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے، اور جس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جا سکتی جو خلاف حکمت ہو۔ اس بنیاد کو استوار کرنے کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ، فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (۲۳:۶)

کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے، اور یہ کہ تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟ بادشاہ برحق خدا اس سے بالاتر ہے (کہ اس سے کوئی فعل عبث صادر ہو)

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (۷۵:۲)

کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ۔ وَمَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ۔ (۴۴:۲)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے ہم نے تو ان کو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے یقیناً ان سب کے لئے فیصلے کے دن تک کا وقت مقرر ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ۔ (۳۰: ۱)	کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا ہے تو حکمت کے مطابق کیا ہے اور ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے مگر بہت سے آدمی ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ صرف اس لیے ہے کہ ایک مدت تک چلتا رہے، پھر کسی حاصل اور نتیجہ کے بغیر معدوم ہو جائے، تو یہ ایک لغو اور عبث فعل ہوگا، ایک کھیل ہوگا۔ ایسا فعل ہرگز کسی حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر تم مانتے ہو کہ یہ کارخانہ خدا نے بنایا ہے۔ اور خدا تمہارے نزدیک حکیم ہے، تو تم کو عقل سے کام لے کر یہ سمجھنا چاہئے کہ موجودات میں سے کوئی شے بے مقصد وجود میں آنے والی اور بے حاصل و بے نتیجہ معدوم ہو جانے والی نہیں ہے۔ خصوصاً انسان جو کائنات ارضی کا گل سرسبد ہے، جس کی ذی شعور ہستی اس کائنات ارضی کے تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات و تحولات کا ماحصل ہے، اور جس کو اتنی حکمت کے ساتھ عقل و فکر، بینش و دانش اور اختیار و ارادہ سے آراستہ کیا گیا ہے، اس کی تخلیق کا مقصد اتنا مہمل نہیں ہو سکتا کہ وہ چند برس اس دنیا میں ایک مشین کی طرح بسر کرے، پھر مر کر معدوم ہو جائے۔

اقتضائے حکمت کے مطابق نظام عالم کا کیا انجام ہونا چاہئے

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ کائنات عبث اور کھیل نہیں ہے، اور نہ اس کی کوئی شے بے نتیجہ و بے حاصل ہے، تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ عدم مطلق کے سوا اس کارخانے کا اور کون انجام ایسا ہے جو اقتضائے حکمت کے عین مطابق ہو؟ اس سوال کا تفصیلی جواب قرآن حکیم کی آیات میں موجود ہے، اور وہ ایسا جواب ہے جس کو سننے کے بعد عقل سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے۔ مگر اس

جواب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند امور ذہن نشین کر لئے جائیں:۔

۱۔ عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے جتنے تغیرات و تحولات ہیں۔ ان سب کا رخ ارتقار کی جانب ہے۔ اس کی ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں۔ اور اشیاء کی ناقص صورتوں کو مٹا کر، انہیں کامل اور کامل سے کامل تر صورتیں بخشیں۔

۲۔ اس قانون ارتقار کا عمل چونکہ تغیر کی روش پر ہوتا ہے اس لئے ہر کون کے لئے ایک فساد ضروری ہے۔ ایک صورت کا وجود میں آنا اس کا مقتضی ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے اور ناقص صورت کا زائل ہونا کامل تر صورت کے وجود میں آنے کا دیباچہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر آن ہوتے رہتے ہیں لیکن بہت سے خفی تغیرات کے بعد ایک جلی اور نمایاں تغیر واقع ہوا کرتا ہے جس میں ایک جلی اور نمایاں فساد پیش آتا ہے۔ یہی دوسری قسم کا فساد ہے جس کو ہم عرف عام میں موت یا زوال و فنا سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک صورت کے وجود میں آنے سے لیکر اس کی موت یا اس کے قطعی فساد تک ایک وقفہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں۔

۳۔ ہر صورت اپنے لئے ایک خاص محل چاہتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے کوئی صورت کسی ایسے محل میں نہیں رہ سکتی جو اس کے لئے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً صورت نباتی کے لئے حیوانی جسم غیر مناسب ہے، اور صورت انسانی اسی جسم اور اسی مخصوص طور کے نظام جسمانی کی جانب ہے، جو انسان کے لئے بنایا گیا ہے پس اگر کسی شے کو ایک ترقی یافتہ صورت دینی ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی صورت کے لئے جو محل بنایا گیا تھا اس کو توڑ دیا جائے، اور نئی صورت کے لئے اس کے مناسب حال محل طیار کیا جائے۔

۴۔ اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقار کی ہمہ گیری کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے،

اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ یہی قانون اس پورے نظام عالم پر بھی حاوی ہو۔ اس وقت جو نظام عالم ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے یہی مخصوص نظام اپنے انہی قوانین کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس سے پہلے نہ معلوم کتنے اور نظامات گذر چکے ہونگے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کرکے دوسرے ترقی یافتہ نظام کے لئے جگہ خالی کردی، اور ارتقا کے تدریجی مراتب سے گذر کر سلسلۂ وجود ہمارے اس نظام تک پہنچا۔ اسی طرح یہ نظام بھی کوئی آخری نظام نہیں ہے۔ یہ بھی جب اپنے امکانی کمالات کو پہنچ جائیگا، اور کمال کے بالاتر درجہ کو قبول کرنے کی استعداد اس میں باقی نہ رہے گی، تو اس کو توڑ دیا جائے گا، اور اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کے قوانین کچھ اور ہوں گے، اور جس میں وجود کے کامل تر مراتب قبول کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

۵۔ عالم کے موجودہ نظام پر غور کرنے سے ہم کو بین طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک ناقص نظام ہے، اور مزید تکمیل کا محتاج ہے اس نظام میں اشیاء کی حقیقتیں، مادی آلایشوں سے اس درجہ آلودہ ہیں کہ حقیقتوں نے اوہام کا اور ان کے مادی لباسوں نے حقیقتوں کا مرتبہ حاصل کرلیا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور مادی آلایشوں سے مجرد ہے وہ اس نظام عالم میں اتنی ہی زیادہ مخفی و مستور، اور عقل و شعور کی دسترس سے دور ہے۔ یہاں ٹھوس مادی جسم وزن رکھتا ہے، اور لطیف و بسیط حقایق کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہاں لکڑی اور پتھر تو ناپے اور تولے جاسکتے ہیں، مگر عقل و فکر، خیال و رائے، نیت و ارادہ، جذبات و وجدانیات کو ناپنے اور تولنے کے لئے اس عالم کے قانون میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں غلہ تولا جاسکتا ہے، مگر محبت اور نفرت کو تولنے والا کوئی ترازو نہیں ہے۔ یہاں کپڑا ناپا جاسکتا ہے، مگر بغض و حسد کو ناپنے کے لئے کوئی پیمانہ موجود نہیں یہاں روپے پیسے کی قدریں متعین کی جاسکتی ہیں۔ مگر اس جذبے کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن نہیں ہے جو سخاوت یا بخل کے لئے محرک

ہوتا ہے۔ یہ اس عالم کے نظام کا نقص ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ اس نظام سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی اور نظام ہو جس میں حقیقتیں مادی لباسوں کی محتاج نہ رہیں، اور بے نقاب جلوہ گر ہو سکیں۔ جس میں لطافتیں، کثافتوں پر غالب آجائیں، اور جو کچھ اب مستور و مخفی ہے، وہ نمایاں اور جلی ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی اس عالم کا نقص ہے کہ یہاں مادی قوانین کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے افعال کے صرف وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں جو مادی قوانین کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہیں، اور ایسے نتائج مترتب نہیں ہونے پاتے جو مقتضیاتِ عقل وحکمت کے مطابق ہوں۔ یہاں آگ لگاؤ تو ہر آتش پذیر شے جل جائے گی، پانی ڈالو تو نمی کو قبول کرنے والی ہر شے بھیگ جائے گی، اگر نیکی کرو تو اس کا پھل نیکی کی صورت میں ظاہر نہ ہوگا جو اس کا حقیقی عقلی نتیجہ ہے، بلکہ اُس صورت میں ظاہر ہوگا جو مادی قوانین کے تحت ظاہر ہو سکتا ہے خواہ وہ نیکی کے بالکل برعکس بدی ہی کی صورت کیوں نہ ہو۔ اس نقص کو دیکھ کر عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس نظام کے بعد کوئی اور ترقی یافتہ نظام ایسا قائم ہو جس میں مادی قوانین کے بجائے عقلی قوانین جاری ہوں اور افعال کے وہ حقیقی نتائج ظاہر ہوں جو اس نظام میں مادی قوانین کے غالب ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے ہیں۔

نظامِ عالم کا خاتمہ ان مقدمات کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھئے کہ قرآن حکیم نے قیامت اور نشأۃ آخرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں آپ کے سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶:۱) — ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مقتضائے حکمت کے مطابق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۳:۱) — اس نے چاند سورج کو اپنے قانون کا پابند کر دیا۔ یہ سب ایک مدت مقررہ تک کے لئے چل رہے ہیں۔

پھر وہ قیامت کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَ اِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۔ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۔ (۸۲) ۔	جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہوجائینگے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی ۔
اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ۔ (۸۱: ۱)	اور جب آفتاب کو لپیٹ دیا جائیگا اور تارے درہم برہم ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے ۔
فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۷۷: ۱) ۔	پھر جب تارے ماند پڑ جائیں گے اور جب آسمان شق کر دیا جائے گا ۔ اور جب پہاڑ اڑا دیے جائیں گے
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۷۵: ۱)	جب آنکھیں پتھرا جائیں گی اور چاند گہنا جائیگا ۔ اور چاند سورج ملا دیے جائیں گے ۔
وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ۔ (۶۹: ۱)	زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ٹکرا دیا جائیگا اور ایک ہی ٹکر میں وہ پاش پاش ہو جائیں گے ۔
یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ (۱۴: ۷)	جس روز زمین بدل کر دوسری طرح کی زمین کر دی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی ، اور سب کے سب خدائے واحد قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے

یہ سب اشارات ہیں اس طرف کہ اس نظام عالم کی ایک خاص عمر مقرر ہے ۔ یہ کوئی دائمی نظام نہیں ہے جب اس کی عمر پوری ہوجائے گی تو یہ نظام درہم برہم کر دیا جائے گا ، سورج ، زمین ، چاند اور دوسرے سیارے جو اس نظام کے ارکان ہیں ، اور جن کی گردشوں سے اس نظام کا قیام ہے منتشر ہو جائیں گے ، ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے ، اور یہ عارضی عمارت توڑ ڈالی

جائیگی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالم وجود کا خاتمہ ہوجائیگا خلق و ابداع کا سلسلہ بند کر دیا جائیگا
بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ وجود کا یہ خاص طور جو اس نظام میں نظر آرہا ہے، بدل ڈالا جائے گا، اور
عالم وجود کے لئے ایک دوسرا نظام قائم کیا جائیگا جس کی طرف يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ
وَالسَّمٰوٰتُ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حیاتِ اخروی کا نظام کیا ہوگا وہ نظام کیسا ہوگا؟ اس کی جو کیفیت قرآن میں بیان کی گئی
ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ نظام ہی کے نقص کی تکمیل ہے اسی نظام کی ارتقائی صورت
ہے، اور ویسی ہی ہے جیسی عقل چاہتی ہے کہ ہو۔ اس نظام میں وزن اور پیمائش اور حساب سب کچھ
ہوگا۔ مگر مادی چیزوں کے لئے نہیں بلکہ لطیف، بسیط اور مجرد حقیقتوں کے لئے وہاں خیر اور شر،
ایمان اور کفر، اخلاق اور ملکات کا وزن ہوگا، نیتوں اور ارادوں کی پیمائش ہوگی۔ دلوں کے
اعمال ناپے اور تولے جائیں گے۔ وہاں اس روٹی کے وزن اور اس پیسے کے عدد کا حساب نہ ہوگا
جو آپ نے کسی غریب کو دیا ہے بلکہ اس نیت کا حساب ہوگا جو اس بخشش کے لئے محرک ہوئی ہے، اس لئے
کہ وہاں کا قانون مادی نہیں، عقلی ہوگا۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۴:۱۷) — آنکھ اور کان اور دل سب سے پوچھ گچھ ہوگی۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۔ (۲۱:۴) — اور قیامت کے روز ہم ٹھیک وزن کرنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی نفس پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ — اس روز ٹھیک ٹھیک وزن ہوگا پھر جس کے اعمال

مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم (۷: ۱)

کا وزن بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والا ہوگا اور جس کے اعمال کا وزن ہلکا ہوگا وہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپکو خود نقصان میں ڈالا۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (۹۹)

اس روز لوگ جُدا جُدا نکلیں گے تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھیگا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھیگا۔

اس دوسرے نظام میں وہ سب چیزیں نمایاں ہوجائیں گی جو اس مادّی نظام میں مادّی قوانین کی بندشوں کے سبب سے چھپی ہوئی ہیں۔ وہاں مخفی اور مستور حقیقتیں بے نقاب سامنے آجائیں گی اور ہر چیز کی اصلی اور حقیقی حیثیت کھل جائیگی۔

لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۵۰: ۲)

انسان سے کہا جائیگا کہ تو اس چیز سے غفلت میں تھا اب ہم نے تیری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور اب تیری نگاہ بہت تیز ہے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ (۶۹: ۱)

اس روز تم پیش کئے جاؤ گے تمہارا کوئی راز مخفی نہ رہے گا۔

وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مترتب ہوں گے جو عقل و حکمت اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں۔ موجودہ نظام کے مادّی قوانین اور مادّی اسباب و وسائل جن کے اثر سے افعال کے حقیقی اور عقلی نتائج مترتب نہیں ہوسکتے، وہاں نافذ نہیں ہوں گے، اس لئے وہ تمام چیزیں جو یہاں عدل و انصاف میں مانع ہوتی ہیں، اور صحیح نتائج مترتب نہیں ہونے دیتیں، وہاں بالکل بے اثر

ہوجائیں گی مثال کے طور پر یہاں دولت، مادی وسائل کی کثرت، دوستوں اور حامیوں کی طاقت، سعی و سفارش، خاندانی اثرات، خود اپنی چالاکی و ہوشیاری اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسان کو اس کے بہت سے افعال کے نتائج سے بچا لیتی ہیں۔ مگر وہاں ان اسباب کی تاثیریں باطل ہوجائیں گی اور ہر فعل کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو عدل اور حق کی بنا پر برآمد ہونا چاہیے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ (۱۰:۳)	وہاں ہر نفس اپنے اعمال کو خود جانچ لے گا جو پہلے سے بھیج چکا ہے
وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۳:۳)	ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ (۳:۳)	وہ دن جب کہ ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور ہر اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے حاضر پائیگا۔
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲:۶)	ڈرو اس دن سے جبکہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ کام نہ آئیگا، اور نہ اس کے حق میں کوئی سفارش قبول کیجائے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائیگا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جاسکیگی۔
فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ وَلَا يَتَسَآءَلُوْنَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ (۲۳:۶)۔	پھر جب صور پھونکا گیا تو اس روز ان میں کوئی نسبی تعلق باقی نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ جن کے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہی لوگ فلاح پائیں گے اور جن کے اعمال ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى	وہ دن جبکہ نہ مال کچھ نفع دیگا اور نہ اولاد۔ نجات صرف

اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (۲۶ : ۵)۔	اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہوگا۔
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ وَمَا نَرٰی مَعَکُمْ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّھُمْ فِیْکُمْ شُرَکٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَکُمْ وَضَلَّ عَنْکُمْ مَّا کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ (۶ : ۱۱)	تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا ہم نے تم کو جو کچھ ساز و سامان دیا تھا اس سب کو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم اپنی پرورش اور رزق بخشی میں خدا کا شریک سمجھتے تھے۔ تمہارے درمیان سب رابطے ٹوٹ چکے ہیں اور باطل ہو چکے ہیں۔
لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۶۰ : ۱)	قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہارے لئے کچھ بھی نافع نہ ہوگی۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے۔
یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْہِ (۸۰)۔	وہ دن جبکہ آدمی اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی اور بچوں سے بھاگے گا۔ اس روز ہر شخص اپنے اپنے حال میں مبتلا ہوگا۔

موجودہ نظام میں یہ نقص ہے کہ یہاں قدرت کے انعامات کی تقسیم انسان کے عمل اور عمل کی خوبی پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ ایسے اسباب پر مبنی ہے جن میں ذاتی اعمال اور نفسی صلاحیتیں محض ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے قوی تر اسباب ان کی تاثیر کو ضعیف بلکہ بسا اوقات بالکل زائل کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے انعامات کی تقسیم میں استحقاق ذاتی کو دخل نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ یہاں ایک شخص تمام عمر ظلم اور فسق کرنے کے باوجود خوشحالی اور دنیوی برکات سے متمتع ہو سکتا ہے، اور ایک شخص زندگی بھر ایمانداری اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود خستہ حال اور دنیوی

مصائب سے پراگندہ بال رہ سکتا ہے۔ یہ نقص تکمیل کا محتاج ہے۔ اور حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ موجودہ نظام ترقی کر کے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں عدل کے ساتھ جزاء و سزا کی تقسیم ہو اور ہر شخص کو وہی ملے جس کا وہ اپنے ذاتی حسن و قبح کی بنا پر مستحق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ دار آخرت کا نظام ایسا ہی ہوگا۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (۳۸: ۳)	کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انہی جیسا بنا دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم متقیوں اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے۔
اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ (۴۵: ۲)۔	کیا بدکاریاں کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ایمان لانے والوں کے برابر کر دیں گے اور ان کی زندگی و موت یکساں ہوگی؟ یہ کیسی بری بات ہے جس کا وہ حکم لگاتے ہیں۔
وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶: ۱۶)	ہر ایک کے لئے ویسے ہی درجات ہونگے جیسے انہوں نے عمل کیے۔
وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغٰوِیْنَ ۔ (۲۶: ۵)۔	جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے کر دی جائے گی۔

یہ ہے اس دوسرے جہان کا نقشہ جس کو اس جہان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب تجویز کرتا ہے جو لوگ اس جہان اور اس کے سارے کارخانے کو ایک کھیل ایک گھروندا ایک بے مقصد و بے حاصل ہنگامہ اور ایک ایسا مہمل گورکھ دھندا سمجھتے ہیں جو ابھی شروع ہوا اور ابھی ہی میں ختم ہو جائے گا، ان کو تو اس تجویز اور اس کے دلائل و شواہد میں کوئی بات قابل

تسلیم نظر نہ آئے گی۔ مگر جو شخص نظام عالم کو خدا کا آفریدہ سمجھتا ہے، اور خدا کو حکیم مانتا ہے وہ ان دلائل پر غور کرنے کے بعد یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ موجودہ نظام عالم کے بعد اس طور اور اس کیفیت کے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ممکن ہے، تو اس ممکن کی ضرورت کا ثابت ہو جانا، اس بات پر ایمان لانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ خدائے حکیم و دانا اس ممکنِ ضروری الوجود کو ضرور وجود بخشے گا۔

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے جس حیات اخروی پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے وہ بعید از عقل نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ عین مقتضائے عقل و حکمت ہے، اور علم و عقل کی کسی ترقی سے اس ایمان میں رخنہ نہیں پڑ سکتا، بشرطیکہ وہ ترقی حقیقی ہو نہ کہ سطحی اور نمائشی۔

(باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۷)

عہد جدید (اناجیل وغیرہا)

از جناب رفیق شاہ صاحب

انگریزی اناجیل انجیلوں کی قلت اور کمیابی کا زمانہ جاتا رہا۔ یہ کتابیں اب بہت کثرت سے شائع ہونے لگی ہیں اور دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں لیکن آج کل انگریزی زبان نے دنیا میں جو پھیلاؤ اختیار کر رکھا ہے اس کی بنا پر بائبل پر تبصرہ پورا نہ ہوگا اگر اس کے انگریزی ترجمہ کی تاریخ پر بھی نظر نہ ڈالی جائے۔ اس کا کچھ تھوڑا سا ذکر توریت کے تحت میں بھی آچکا ہے

انگلستان میں انگریزی ترجمہ کے لحاظ سے بھی انجیل پر دو دور گذر چکے ہیں ایک قبل ایجاد طباعت قلمی نسخوں کا دور۔ دوسرا بعد ایجاد طباعت مطبوعہ بائبلوں کا دور۔

دور اول میں ساتویں صدی عیسوی تک انجیل کے بعض حصوں کے ترجمے نظم میں لکھے جاتے تھے آٹھویں صدی میں نثر میں ترجموں کی ابتدا ہوئی مگر یہ ترجمے بھی بائبل کے متفرق اجزا کے ہوتے تھے۔ چودھویں صدی کے وسط تک پوری بائبل کا کوئی مکمل ترجمہ انگلستان میں نہیں ہوا۔ سب سے پہلا مکمل ترجمہ بائبل کا انگلستان میں انگریزی زبان میں وکلف (Wycliffe) نے تقریباً ۱۳۸۲ء میں انجام کو پہنچایا۔ اس کے ساتھ اس کام میں قابل لوگوں کی ایک جماعت بھی شریک رہی جن میں سے ایک شخص کا نام نکولاز (Nicho-las) تھا۔ وکلف ان لوگوں میں سے تھا جو اس امر پر زور دیا کرتے تھے کہ پادریوں نے جو اہمیت حاصل کر رکھی ہے اور لوگوں کے دین و ایمان کے مالک بن بیٹھے ہیں اس کا انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے انجیل خدا کا کلام ہے اور ہر شخص کی ہدایت کے لئے کافی ہے۔ ہر شخص خدا کے احکام براہ راست انجیل سے معلوم کر سکتا ہے

ظاہر ہے کہ ایسا شخص پادریوں کی نگاہ میں مقبول نہیں ہو سکتا چنانچہ اس ترجمہ پر پادریوں نے شور مچا دیا کہ ترجمہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ وکلف نے اس شور و واویلا کی پروانہ کی اور اس نے اور اس کی جماعت کے لوگوں نے مردانہ وار اس مخالفت کا مقابلہ کیا۔ ۱۳۹۵ء اور ۱۳۹۷ء کے درمیان جماعت وکلف نے پہلے ترجمہ پر نظرثانی کی، اور اس پر ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دوسرا ترجمہ جان پروی (John Purvey) کی نظرثانی کا نتیجہ ہے اور مقدمہ بھی اسی کا لکھا ہوا ہے اور یہ سب کچھ اس نے وکلف کے انتقال ۱۳۸۴ء کے بعد کیا۔ پہلا ترجمہ بیشتر لفظی تھا اور دوسرا ترجمہ بامحاورہ۔ یہ چودھویں صدی کا کارنامہ تھا پندرھویں صدی میں بائبل کی کوئی خدمت نہ ہوئی بلکہ حکومت کی جانب سے کتب مقدسہ کی اشاعت اور ترجمہ کرنے والی جماعتوں پر سختیاں توڑی گئیں اور انگلستان میں پادریوں کی جہل پرور نفسانیت کا غلبہ رہا۔ چودھویں صدی میں ریفارمر یعنی مجدد دین مذہب کی ایک جماعت لالرڈس (Lollards) کے نام سے پیدا ہوگئی تھی اور وکلف جان پروی اور سر جان اولڈ کیسل وغیرہم اسی جماعت کے پیشوا اور رہبر تھے پندرھویں صدی میں اس جماعت کو ایسا نیست و نابود کر دیا گیا کہ آج انکا کوئی نشان تک باقی نہیں۔ اس جماعت کے زبردست اور معزز سرگروہ سر جان اولڈ کیسل (Sir John Oldcastle) کو اس سرپرستی کی جرم میں مرتد قرار دیکر زندہ جلا دیا گیا۔

ایجاد طباعت کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے مگر اس دور کے شروع ہونے کے بعد بھی انگلستان ایک عرصہ تک سوتا رہا۔ فن طباعت کی ایجاد ۱۴۴۰ء میں وقوع میں آئی ۱۴۶۶ء تک جرمنی میں بائبل کے ترجمہ کی طباعت و اشاعت ہو چکی تھی اور لوتھر کی اصلاحی جدوجہد کے آغاز سے قبل یعنی تقریباً ۱۵۲۱ء سے پہلے وہاں وہ کتاب سترہ (۱۷) مرتبہ اور چھپ چکی تھی۔ ہینری ہشتم کے تخت انگلستان پر آنے سے قبل یعنے ۱۵۰۹ء سے بہت پیشتر فرانس اسپین اٹلی بوہیمیہ اور ہالینڈ میں بائبل کے ملکی زبانوں میں ترجمے طباعت کے ذریعے شائع ہو چکے تھے۔ مگر انگلستان میں ۱۵۳۰ء سے قبل طباعت انجیل کا اہتمام ناممکن رہا۔ اس سے قبل انگلستان کے ایک فاضل ولیم ٹنڈل William Tyndale

نے اپنے ہموطنوں کو مضامین بائبل سے آگاہ کرنے کے شوق میں انجیل کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا اور کئی برس تک اسی جد وجہد میں رہا مگر اس کام کے لئے انگلستان کی زمین کو اس نے اپنے لئے تنگ پایا اور وہ اپنی جان بچا کر ممالک غیر میں بھاگ گیا اور ۱۵۲۴ء میں پہلے ہیمبرگ میں پھر وٹن برگ میں پناہ گزین ہوا اور اپنے ترجمے کے کام میں مصروف رہا۔ ۱۵۲۵ء میں مقام کلون میں اس نے عہد جدید کا ترجمہ چھپوانا شروع کیا۔ مگر ریفارمیشن کے دشمن جان کاکلیس نے طباعت انجیل کے کام کو موقوف کرا دیا اور انگلستان کے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ یہ زہریلے اوراق اس ملک میں داخل نہ ہونے پائیں۔ ٹنڈیل یہاں سے بھی بھاگ کر مقام ورمس میں پہنچا جہاں اس نے اپنے کام کو جاری رکھ کر کسی نہ کسی طرح انجام پر پہنچایا اور ۱۵۲۶ء کے اختتام سے قبل اپنے مطبوعہ ترجمہ کو انگلستان میں داخل کر دیا۔ انگلستان میں یہ نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا شروع ہوگئے۔ اس کا حکومت کی جانب سے یہ انتظام ہوا کہ جتنے نسخے مل سکے وہ سب کے سب برسر بازار جلا دئے گئے۔ مگر ٹنڈیل مردانہ وار اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے اپنے ترجمے کے متعدد ایڈیشن ہر مرتبہ نظر ثانی کے بعد نکالے اور سب سے آخری ایڈیشن اینٹورپ سے ۱۵۳۵ء میں نکالا جس کا ایک نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اور ایک نسخہ آکسفورڈ ایگزیٹر کالج میں آج بھی موجود ہے۔ مگر اس کارنامے کے بعد ٹنڈیل گرفتار کر لیا گیا، قید میں رکھا گیا، اور بالآخر ۶ اکتوبر ۱۵۳۶ء کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا اور اس کی نعش کو جلا دیا گیا۔ تماشہ کی بات تو یہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں انگلستان میں جو پوری بائبل پہلی مرتبہ طبع ہوئی وہ ٹنڈیل ہی کی ترجمہ کی ہوئی بائبل کی طرح جدید تھی۔ ڈاکٹر ویسٹکوٹ اپنی کتاب تاریخ انگریزی بائبل کے صفحہ ۳۱۶ پر لکھتے ہیں کہ:

"انگریزی بائبل کی تاریخ کی ابتدا ٹنڈیل کے کارناموں سے ہوتی ہے نہ کہ کلیف کے کارناموں سے۔"

تقریباً اسی زمانہ میں مائلس کورڈیل (Miles Coverdale) نے بھی ایک ترجمہ چھپوایا اور یہ ترجمہ بھی انگلستان سے باہر چھپا۔ یہ شخص ٹنڈیل ہی کی جماعت کے لوگوں میں سے تھا جس نے

اپنے ترجمہ میں لوتھر کی تفسیر سے بہت مدد لی۔

ٹنڈیل اور کوورڈیل کے نسخوں کی مقبولیت دیکھ کر انگلستان کے کتب فروشوں کے منہ میں بھی پانی آگیا اور انہوں نے خیال کیا کہ انجیل کے ترجموں کی طباعت واشاعت دولتمند بننے کا نہایت اچھا ذریعہ ثابت ہوگی چنانچہ چاروں طرف سے ترجموں کا شور مچنا شروع ہوگیا۔

جان راجرس (John Rogers) نے ٹامس میتھیو (Thomas Matthew) کے نام سے ملیا نو طباعت ایک نہایت نفیس ترجمہ شائع کیا جو میتھیوز بائبل (Matthew's Bible) کے نام سے موسوم ہے مگر اس بیچارہ کا حشر بھی یہ ہوا کہ اُسے گرفتار کرکے زندہ جلا دیا گیا اس کے بعد رچرڈ ٹیوریز (Richard Traverner) نے ادھر ادھر کے ترجموں سے چوری کرکے ایک ترجمہ نکالا مگر یہ کچھ مقبول نہ ہوا۔

اب تک جتنے ترجمے شائع ہوئے تھے وہ افراد کی جانب سے تھے اور نجی طور پر شائع ہوئے تھے۔ نہ حکومت کو اُن میں کوئی دخل تھا نہ پادریوں کو اُن سے کوئی سروکار۔ ۱۵۳۹ء میں پادریوں اور بشپوں نے بڑے پیمانوں پر اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی جانب سے ایک مستند ترجمے کے طبع کرانے کا انتظام کیا اور اُس کا نام دی گریٹ بائبل (The Great Bibie) رکھا۔ پادریوں کے اس گروہ کے سرغنا ٹامس کرینمر (Thomas Cranmer) آرچ بشپ آف کینٹربری یعنی انگلستان کے لاٹ پادری تھے۔ مترجموں کی ایک جماعت مرتب کی گئی جس کے سرغنا کوورڈیل بنائے گئے اور ترجمہ کی بنیاد میتھیوز بائبل کو قرار دیا گیا۔ ترجمہ کا کام پیرس میں شروع اور لندن میں ختم کیا گیا۔ طباعت کے لحاظ سے اور نمائشی اعتبار سے یہ بائبل اپنے زمانہ میں بےنظیر تھی۔ ۱۵۳۹ء سے ۱۵۴۱ء تک اس کتاب کے سات ایڈیشن نکل چکے تھے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۵۴۰ء میں نکلا ایک طویل دیباچہ آرچ بشپ کرینمر کے قلم کا لکھا ہوا شامل کیا گیا اور اسی بنا پر اس کا نام کرینمرز بائبل پڑ گیا۔

اس وقت ایک طرف تو مذہبی بیداری کا یہ عالم تھا کہ اناجیل کے ترجموں پر ترجمے شائع ہو رہے تھے حتیٰ کہ پادریوں کی جماعت تک نے ایک مستند ترجمہ شائع کر دیا تھا اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے یہ برتاؤ ہو رہا تھا کہ احکام صادر ہو رہے تھے کہ ٹنڈیل کا ترجمہ کوئی نہ پڑھے، کورڈیل کی بائبل کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ دوسرے ترجموں سے نوٹ اور حواشی خارج کر دئے جائیں۔ کوئی معمولی عورت، مزدور، قلی، کسان، کاشتکار، خدمتگار، کاریگر، مسافر، بائبل کے کسی حصہ کو نہ پڑھے نہ اُسے کسی اور کام میں لائے نہ اُس پر عمل کرے، ورنہ سزائے جرمانہ یا قید کا مستوجب ہوگا۔ گریٹ بائبل کے موجد آرچ بشپ کرینمر زندہ جلاؤ گئے۔ جان راجرس ان سے قبل ہی ختم کر دیے گئے تھے۔ کورڈیل اور اُن کے ہم مشرب ساتھی اپنی جان بچا کر بھاگے اور جینوا میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس وقت جینوا میں کالون اور بیزا بھی مقیم تھے جو اپنے زمانہ کے مشہور مصلح عیسویت اور ریفارمر تھے۔ یہاں ان لوگوں کو ملکر اپنا کام جاری رکھنے کی خاصی مہلت ملگئی۔ چنانچہ انھوں نے پھر ترجموں پر نظر ثانی کر کے بائبل کا ایک جدید ایڈیشن نکالا۔ جینوا میں آکر ان لوگوں کی محنت کا پہلا ثمرہ یہ نکلا کہ جون ۱۵۵۷ء میں عہد جدید کا ایک نیا ایڈیشن نکلا جس میں کالون کا لکھا ہوا ایک مقدمہ بھی شامل تھا اور آیات و ابواب کی تقسیم بھی کی گئی تھی اناجیل میں یہ آیات و ابواب کی پہلی تقسیم تھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس تقسیم کے کرنے میں دوسری زبانوں کی اناجیل کی پیروی کی گئی ہے۔ علاوہ اس کے اس نسخہ میں حواشی بھی تھے۔ بعض لوگ کالون کی اس کارگذاری کو ولیم وٹنگم (William Whittingham) سے منسوب کرتے ہیں۔

اس کے بعد جینوا ہی سے ۱۵۶۰ء میں بائبل کا ایک مکمل ایڈیشن نکالا گیا جس میں عہد عتیق اور عہد جدید دونوں شامل تھے اور عہد عتیق میں بھی مثل عہد جدید مذکورۃ الصدر کے آیات و ابواب کی تقسیم کر دی گئی تھی حواشی بھی درج تھے۔ اس کی طباعت کے مصارف اہل جینوا نے برداشت کئے تھے اس لئے اس کا نام جینوا بائبل پڑ گیا۔ اس نسخہ کے خاص مؤلف ولیم وٹنگم (William Whittingham

اینتھونی گلبی (Anthony Gilby) اور ٹامس سیمپسن (Thomas Sampson) بیان کئے جاتے ہیں یہ نسخہ بہت مقبول ہوا اور گریٹ بائبل پر بھی فوقیت لے گیا۔ آرچ بشپ میتھو پارکر (Archbishop Matthew Parker) نے ۱۵۶۸ء میں جنیوا بائبل پر نظر ثانی کرکے اور چند حواشی کا اضافہ کرکے ایک جدید بائبل بنائی اور اس کا نام بشپس بائبل (Bishops' Bible) رکھا مگر مقبولیت عام میں یہ جنیوا بائبل پر سبقت نہ لیجا سکی۔

ٹنڈل کے زمانے سے لیکر اس وقت تک جتنے ترجمے شائع ہوئے سب اصلاح پسند لوگوں کے کئے ہوئے تھے۔ اب قدامت پسند رومن کیتھولکس کو بھی میدان میں آنے کا شوق ہوا چنانچہ "غلط ترجموں کے ذریعہ لوگوں کے عقاید کی خرابی کی روک تھام" کی غرض سے انہوں نے بھی ایک ترجمہ کر ڈالا جو رومن ترجمہ ولگیٹ کا لاطینی آمیز انگریزی ترجمہ ہے۔

انقلاب زمانہ کی اس سے عجیب تر مثال کیا ہوگی کہ جو حکومت پارلیمنٹری احکام کی قوت سے انجیل کے ترجموں کو جلوا ڈالتی تھی، ترجمہ کرنے والوں کو قتل کر دیتی تھی اور انجیل پڑھنے والے عوام الناس کو قید کر دیتی تھی وہ اب خود بائبل کا ترجمہ بڑے اہتمام سے کرتی ہے۔ بادشاہ انگلستان شاہ جیمس اول جنوری ۱۶۰۳ء میں تخت انگلستان پر بیٹھتا ہے اور چند ہی ماہ بعد ہیمپٹن کورٹ کے محل میں ہر طبقہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کے پادریوں کی کانفرنس کرتا ہے، خود اس کا صدر بنتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ بائبل کا ایک مستند ترجمہ کیا جائے۔ بہترین اشخاص اور اعلیٰ ترین تعلیم کے لوگ بہترین انگریزی زبان میں ترجمہ کریں۔ سب پادری اور بشپ اس پر نظر ثانی کریں۔ پھر پریوی کونسل میں وہ پیش ہو۔ اس کے بعد مہر شاہی اس پر ثبت ہو اور سارا چرچ اس کا اور صرف اسی کا مطیع ہو جائے گویا فرمان خداوندی کو ایک عاجز دنیوی بادشاہ کی منظوری کا (نعوذ باللہ) محتاج بنا دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوتی ہے ۱۶۰۴ء میں کام شروع ہوتا ہے اور ۱۶۱۱ء میں کتاب چھپکر تیار ہو جاتی ہے۔ دی آتھرائزڈ The Authorized Version یعنی مستند ترجمہ اور کنگ جیمس بائبل (King

(Jame's Bible) یعنی خدا کی نہیں بلکہ شاہ جیمس کی بائبل اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۵۶۸ء کی بشپس بائبل (Bishops, Bible) پر نظر ثانی کے سوا اس میں اور کچھ نہیں۔ اس مستند ترجمہ پر عیسائی علماء ہی کی جانب سے جس کثرت اور جس شدت سے اعتراضات ہوتے رہے ہیں ان کی جانب اشارہ ہم اپنے مضمون نمبر ۲ میں کر چکے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع جدید ۱۹۲۹ء جلد ۳ میں زیر عنوان "بائبل" صفحہ ۵۳۴ پر صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ:- باوجود اس کے یعنی باوجود اس خوبی کے جس سے کہ یہ ترجمہ کیا گیا ہے ا ترجمہ کی اصلاح اور بہتری کا کام صدیوں سے اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ اس مستند ترجمہ کی جدید اشاعت کا مقابلہ ۱۶۱۱ء کی اصلی اشاعت سے کیا جائے تو بہت بڑا فرق نظر آئے گا" اصلاح و بہتری کی یہ کوششیں تو صدیوں تک جاری رہیں گی مگر ان سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔ اس مستند ایڈیشن کے بعد اس کام میں بعض امریکہ والوں نے بھی شرکت ہوگئی اور ۱۸۸۱ء میں عہد جدید اور ۱۸۸۴ء میں عہد عتیق کا نظر ثانی کیا ہوا نسخہ ریوائزڈ ورشن (The Revised Version) کے نام سے بھی نکل چکا ہے مگر خود عیسائی علماء کی بھی تسکین اس سے نہ ہوئی اور وہ اتبک تحقیق و تنقید و تفتیش کی ضرورت کو محسوس کئے جا رہے ہیں۔ منصف مزاج محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۳۸۲ء سے بائبل کے اصل عبرانی متن سے کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ چوتھی صدی میں سینٹ جروم نے یونانی ترجمہ سے اپنا لاطینی ترجمہ کیا اور اس لاطینی ترجمہ سے رومی ولگٹ مرتب ہوا اور رومی ولگٹ سے یورپ کی تمام بقیہ زبانوں میں ترجمہ ہوا جس میں انگریزی زبان بھی شامل ہے۔ اور اس بات کا سب کو اعتراف ہے کہ بائبل کا اصلی اور سچا نسخہ اب دنیا سے مفقود ہے۔ پس قصہ ختم شد۔ ظنیات کی بناء پر صحت کے متعلق اطمینان محال ہے۔

خصوصیات تعلیمی اتبک کتب عہد جدید کے بحیثیت مجموعی معتبر یا غیر معتبر ہونے سے بحث تھی اب ان کتب مروجہ کی تعلیمی خصوصیات سے بحث کی جاتی ہے ضمناً اس امر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی کہ بعض تعلیمات حقیقتاً جن کیا اور بعض علیم کو بعد کو گھڑا گیا۔

اناجیل مروجہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کوئی جدید شریعت لیکر نہیں آئے بلکہ

موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کو قائم رکھنے اور اسے یہودیوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے پاک صاف کرنے آئے تھے۔ گویا عیسویت موسویت ہی کا تتمہ ہے۔ متی باب ۵ آیت ۱۷ تا ۲۰ میں خود عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول منقول ہے۔

"یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توریت کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ پورا ہوئے بغیر نہ ٹلیگا۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی حکم کو توڑیگا اور دوسروں کو توڑنے کی ہدایت کرے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو ان پر عمل کرے گا۔ اور ان کی دوسروں کو تعلیم دیگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائیگا۔ پس میں تمسے کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوسکوگے۔"

متی باب ۲۳ آیہ ۱ تا ۳ میں منقول ہے کہ:۔

"تب یسوع لوگوں اور اپنے شاگردوں سے کہنے لگا کہ فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں اس لئے وہ جو کچھ تمہیں بتائیں مانو اور عمل میں لاؤ لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں۔"

جب یہ ثابت ہوگیا کہ عیسویت موسویت کی ناسخ نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے ہر حکم کی تعمیل عیسائیوں پر فرض ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اس شریعت کے جس حکم کو چاہیں مانیں اور جسے نہ چاہیں نہ مانیں تو عیسوی تعلیمات کی خصوصیات دریافت کرنے کے لئے ضروری ہوگیا کہ توریت اور انجیل دونوں پر یکساں طور پر نظر ڈالی جائے۔ اناجیل میں توریت کی طرح احکام شریعت

کا نہ ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ عیسائی قیود شریعت سے آزاد ہیں۔ دیگر صحف انبیاء بنی اسرائیل بھی توریتی احکام شریعت سے خالی ہیں مگر داؤد اور یرمیاہ اور یسعیاہ اور عزرا اور دانیال اور حزقیل اور یشوع اور سموائیل نے اپنے آپ کو احکام توریت کی تعمیل سے مستثنیٰ نہ رکھا بلکہ خود عیسیٰ علیہ السلام نے بھی ان احکام کی حفاظت کی اور اپنی امت کو ان کی تعمیل کا حکم فرمایا اور بار بار حکم فرمایا۔ ان حالات میں عیسائیوں کا صرف مسیح پر ایمان لے آنا اور عملی اعتبار سے اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے آزاد رکھنا عیسوی نقطۂ نظر سے بھی قابل اعتراض ہے۔

ایمان و عمل اناجیل کی رو سے ایمان بلا عمل نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ گلتیون کے باب ۴ آیہ ۴ میں ہے کہ:-

"جب وقت پورا ہوا تب خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہو کے شریعت کے تابع ہوا"

۱۔ تمطاؤس باب ۵ آیہ ۸ میں ہے کہ:-

"اگر کوئی اپنوں کی اور خاصکر اپنے ہی گھر کی خبر گیری نہ کرے تو ایمان سے منکر اور بے ایمان سے بدتر ہے"۔

گھر کی خبر گیری عمل ہے اور اس عمل سے غافل رہنا ایمان تک کی بربادی کا باعث بتلایا گیا ہے۔ عمل کی ضرورت اس سے ظاہر ہے۔

۲۔ تمطاؤس باب ۲ آیہ ۱۹ میں ہے کہ "جو مسیح کا نام لیتا ہے بدی سے باز رہے" لوقا باب ۱۹ آیہ ۸ و ۹ میں یہ واقعہ درج ہے کہ محصول لینے والوں کے سردار اور متمول شخص زکی نے جب کھڑے ہو کر مسیح سے کہا کہ "میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا کچھ دغا بازی سے لیا ہے تو اس کا چوگنا دیتا ہوں" تو یسوع نے اس کے حق میں کہا کہ "آج اس گھر میں نجات آئی" یہاں بھی نجات کا انحصار عمل پر ہوا

متی باب ۷ آیہ ۲۱ تا ۲۴ میں ہے کہ :۔

"ہر ایک جو مجھے خداوند خدا کہتا ہے آسمان کی بادشاہت میں شامل ہوگا مگر وہی جو میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے۔ اُس دن بہتیرے مجھے کہیں گے اے خدا وند اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے دیوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سی کرامات ظاہر نہیں کیں۔ اس وقت میں ان سے صاف کہوں گا کہ میں کبھی تم سے واقف نہ تھا اے بدکارو میرے پاس سے دور ہو پس جو کوئی میری یہ باتیں سنتا اور انھیں عمل میں لاتا ہے میں اسے اس عقلمند آدمی کی مانند ٹھیراتا ہوں جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا۔"

متی باب ۱۶ آیہ ۲۷ میں قیامت کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ درج ہیں :۔

"ابن آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آوے گا تب ہر ایک کو اُس کے اعمال کے موافق بدلا دیگا۔"

عہد عتیق اور عہد جدید کی متعدد کتابوں میں بکثرت اور بصراحت آیا ہے کہ قیامت کے دن اعمال نیک اور اعمال بد پر جزا اور سزا مرتب ہوگی۔ لوقا کے باب ۱۰ میں ایک واقعہ درج ہے کہ کسی شریعت سکھلانے والے نے حضرت [illegible] سے پوچھا کہ میں کیا کروں جو نجات پاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ شریعت کے احکام بجا لا نجات اسی سے ہوگی۔ یوحنا باب ۱۴ آیہ ۱۵ میں ہے کہ :۔

"اگر تم مجھے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو۔" طیطس باب ۱ آیہ ۱۶ میں ہے کہ :۔

"خدا کے پہچاننے کا اقرار تو کرتے ہیں پر کاموں کی راہ سے اس کا انکار کرتے ہیں وے نفرت کے لائق نافرمان نابرداشت ہیں۔ اور ہر ایک نیک کام کے لئے نامقبول۔" مکاشفات باب ۲۲ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :

"مبارک وے ہیں جو اُس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں تاکہ زندگی کے درخت پر انکا اختیار ہو اور وے اُن

دروازوں سے شہر میں داخل ہوں مگر کتے اور جادوگر اور حرامکار اور خونی اور بت پرست اور جو کوئی جھوٹ کو
چاہتا اور بولتا ہے سب باہر ہیں" یعقوب باب ۲ آیات ۱۴ تا ۲۶ بھی ملاحظہ ہوں: -

اے میرے بھائیو اگر کوئی کہے کہ میں ایماندار ہوں اور عمل نہ کرتا ہو تو کیا فائدہ کیا ایسا
ایمان اسے بچا سکتا ہے۔ اگر کوئی بھائی یا بہن ننگا ہو اور روزینہ کی روٹی میسر نہ ہو
اور تم میں سے کوئی انہیں کہے کہ سلامت جاؤ گرم اور سیر ہو پر تم انہیں وے چیزیں
جو بدن کو ضرور ہیں تو کیا فائدہ۔ اسی طرح ایمان بھی اگر عمل کے ساتھ نہ ہو تو وہ
اکیلا ہو کر مردہ ہے لیکن شاید کوئی کہے کہ ایمان تجھ میں ہے اور میرے پاس اعمال
بھلا تو اپنا ایمان بغیر اپنے اعمال کے مجھ پر ظاہر کر اور میں اپنے ایمان کو اپنے اعمال
سے تجھ پر ظاہر کروں گا۔ تو ایمان لاتا ہے کہ خدا ایک ہے اچھا کرتا ہے۔ شیاطین بھی یہی جانتے
ہیں اور تھرتھراتے ہیں۔ پر اے واہی آدمی کب تجھ کو معلوم ہوگا کہ ایمان بے اعمال
کے مردہ ہے۔ کیا ہمارا باپ ابراہام اعمال سے راستباز نہیں ٹھیرایا گیا.....
پس تم دیکھتے ہو کہ آدمی اعمال سے راستباز ٹھیرایا جاتا ہے اور صرف ایمان سے نہیں
...... پس جیسا بدن بے روح مردہ ہے ویسا ہی ایمان بے اعمال مردہ ہے۔

انجیل میں جہاں اقتباسات مندرجہ بالا کی رو سے ایمان کے ساتھ عمل کی ضرورت پر اس شد
مد کے ساتھ زور دیا گیا ہے وہاں تماشہ کی بات یہ ہے کہ بعض "کتب مقدسہ" میں مثلاً پولوس کے رومیوں کے
نام خط کے ابواب ۳ و ۴ و ۶ میں اور سینٹ پولوس کے گلتیوں کے نام خط کے باب ۵ میں یہ بھی لکھا ہے کہ
صرف مسیح پر ایمان لانا نجات کے لیے کافی ہے اور اعمال خیر پر اعتماد محض بیوقوفی ہے اور شریعت پر چلنے والے
لوگ مسیح سے جدا ہو جاتے ہیں اور سرے سے عیسائی ہی نہیں رہتے اور خدا کی رحمت سے مایوس ہیں۔ چنانچہ زمانہ مابعد
کے مدعیان عیسویت کا مسلک بیشتر یہی پایا جاتا ہے۔ جن کتابوں میں تحریفات و الحاقات و اختلافات کا

ہونا مسلم ہو اُن میں اس قسم کے متضاد و متناقض مضامین کا پایا جانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔

ایمان و عمل کے مسئلہ میں اس اختلاف کی ابتدا پولوس کے زمانہ میں واقع ہوئی اور پولوسی جماعت ہی شریعت موسوی کی اس بے احترامی کی ذمہ دار ہے۔ ابتدا میں حواریوں نے تبلیغ مذہب کا دائرہ صرف یہودیوں ہی تک محدود رکھا تھا۔ پولوس اس زمانہ میں عیسویت کا سخت دشمن تھا۔ اس نے حواریوں اور ان کے متبعین کو بڑی بڑی ایذائیں پہنچائیں جب وہ تائب ہو کر اپنی ان حرکتوں سے باز آیا اور دین عیسوی میں داخل ہوا تو برنباس کی ہمراہی میں اُس نے بھی تبلیغی امور میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی تبلیغی کوششوں کو اقوام غیر یہود تک (جنہیں اس زمانہ میں "جنٹائلز" کہتے تھے) پہنچایا۔ اِن کوششوں کی کامیابی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس نے جو تدبیریں سوچیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ غیر یہود اقوام کے لوگوں میں سے جدید ایمان لانے والوں کو احکام توریت کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ بیت المقدس کی مذہبی جماعت کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ عہد جدید کی کتاب اعمال باب ۱۵ (از آیہ ۲۲ تا ۲۹) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

> تب رسولوں اور بزرگوں نے سارے کلیسیا سمیت بہتر جانا کہ اپنے میں سے کئی شخص چن کے پولوس اور برنباس کے ساتھ انطاکیہ میں بھیجیں۔ یعنی یہوداہ کو جس کا لقب برسباس ہے اور سیلاس کو جو بھائیوں میں مقدم تھے۔ اور ان کے ہاتھ یہ لکھ بھیجا کہ اُن بھائیوں کو جو غیر قوموں میں سے ہیں اور انطاکیہ اور شام اور کلیکیہ میں رہتے ہیں رسولوں اور بزرگوں اور بھائیوں کا سلام۔ از بسکہ ہم نے سنا ہے کہ ہم میں سے بعضوں نے جن کو ہم نے حکم نہیں کیا جا کر تمہیں اپنی باتوں سے گھبرا دیا ہے اور تمہارے دلوں کو یہ کہکے پریشان کر دیا ہے کہ ختنہ کرو اور شریعت پر چلو۔ سو ہم نے باہم متفق ہو کر یہ بہتر جانا کہ اپنے عزیزوں برنباس اور پولوس کے ہمراہ جو کہ ایسے لوگ ہیں

جنہوں نے اپنی جان ہمارے خداوند یسوع مسیح کے نام پر خطرہ میں ڈالی بعض منتخب اشخاص کو تمہارے پاس بھیجیں۔ چنانچہ ہم نے یہوداہ اور سیلاس کو بھیجا جو تمہیں زبانی بھی یہ باتیں بیان کریں گے۔ کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے بہتر جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور کوئی بات کا بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کے چڑھاووں اور لہو اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے اپنے کو بچائے رہو گے تو خوب کرو گے۔ سلامت رہو۔ تب وے رخصت ہو کر انطاکیہ میں آئے اور جماعت کو اکٹھا کر کے وہ خط انہوں نے دیا اور جماعت کے لوگ اُس خط کو پڑھ کر اس تسلی کی بات سے خوش ہوئے ؎"

یہ پہلا پولوسی گولہ تھا جو عیسائیوں کی پابندی شریعت پر پڑا۔ آگے چلکر یہودی اور غیر یہودی عیسائیوں کا امتیاز بھی اُٹھ گیا اور اس رخصت نے اباحت کی صورت اختیار کر لی۔ پھر اباحت نے استحباب کی صورت اختیار کی اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ شریعت کی پابندی بدعت اور بعض صورتوں میں کفر قرار دیگئی۔ شریعت موسوی سے نفرت اور بیزاری کا اظہار ہونے لگا اور اس اظہار نفرت میں توریت و شریعت ہم معنی الفاظ سمجھے جانے لگے۔ یہی پولوس ہیں جو رومیوں کے خط باب ۴ آیہ ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ:

" شریعت قہر کا سبب ہے"

اور قرنتیوں کے دوسرے خط کے باب ۳ آیہ ۱۳ و ۱۴ میں لکھتے ہیں کہ:۔

" ہم موسیٰ کی طرح عمل نہیں کرتے جس نے اپنے چہرہ پر پردہ ڈالا تاکہ بنی اسرائیل اس اٹھ جانے والی کی غایت تک نظر نہ دیکھیں ؎"

اور عبرانیوں کے خط باب ، آیہ ۱۸ و ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

" اگلا قانون (یعنی توریت کے دس حکم) اس لئے کہ کمزور اور بیفائدہ تھا اٹھ گیا

کیونکہ شریعت نے کچھ کامل نہ کیا"۔

اور گلتیوں کے خط باب ۵ آیہ ۴ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"تم جو شریعت کی رو سے راست باز بننا چاہتے ہو تو مسیح سے جدا ہوئے اور فضل کی نظر سے گر گئے"۔

اور قلسیوں کے خط باب ۲ آیہ ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"اس نے (یعنی مسیح نے) تمہارے سب گناہ بخش دیے اور حکموں کی دستاویز جو ہمارے خلاف تھی (یعنی توریت کے احکام خداوندی جو پولوس کے مخالف تھے ہماری ابتدا شادولی (یعنی پولوسیوں کے لئے وہ احکام منسوخ کردیے) اور اس کو بیچ میں سے اٹھا کے صلیب پر کیلیں جڑ دیں (یعنی ان احکام کو نہ صرف نیست و نابود کر دیا بلکہ ذلت کی سزا دیکر نیست و نابود کیا کہ عیسائیوں کے سامنے اب اُن کا نام لینا بھی گناہ ہو گیا) اور حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا اور انھیں برملا رسوا کرکے اُن پر شادیانے بجائے"۔

یہاں "حکومتوں اور ریاستوں کا اقتدار چھین لیا" سے یہ مراد ہے کہ شریعت سکھلانے والے فقیہوں اور فریسیوں کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا وہ بوجہ تعطیل شریعت اُن سے جاتا رہا اور اُن کی اِس رسوائی اور بیقدری پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

بلندی سے پستی کی جانب اترنا آسان ہے گر پستی سے بلندی پر جانا مشکل ہے۔ انسان بالطبع آزادی پسند اور آسانی پسند واقع ہوا ہے۔ جب پولوس نے شریعت کی بندشوں کو نہایت بے باکی کے ساتھ اسقدر ڈھیلا کر دیا تو ان کے متبعین نے ان کے بعد کیا کچھ گل نہ تراشے ہوں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے مشہور مجدد و مصلح وریفارمر اور فرقہ پراٹسٹنٹ کے بانی مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء) عیسائیوں کو کلیسا

اور پادریوں کی غلامی سے آزادی دلانے کے جوش میں انھیں اصلی مذہب کی پابندی سے بھی آزاد کئے دیتے ہیں۔ لوتھر صاحب کی تصانیف میں اس نوع کے فقرے بکثرت پائے جاتے ہیں کہ:۔ "ہم نہ سنیں گے نہ دیکھیں گے موسیٰ کو اس لئے کہ وہ صرف یہودیوں کے لئے تھا، اور اس کو ہم سے کسی چیز میں علاقہ نہیں" "ہم نہ قبول کریں گے موسیٰ کو اور نہ اُس کی توریت کو اس لئے کہ وہ تو دشمن عیسیٰ ہے"۔ "موسیٰ تو جلادوں کا استاد ہے" "دس حکموں کو عیسائیوں سے کچھ علاقہ نہیں"۔ "ان دس حکموں کو خارج کرنا چاہیئے تاکہ تمام بدعت ابھی موقوف ہو جائے کیوں کہ یہ احکام جملہ بدعات کے سرچشمے ہیں" "خدا گناہ کا موجب ہے"۔ (نعوذ باللہ) "انسان گناہ سے بچنے پر مختار نہیں" "دس حکموں پر عمل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے"۔ "فقط ایمان رکھو اور یقین کرلو کہ روزے اور پرہیزگاری اور اعمال نیک کی مشقت کے بغیر تم بخشے جاؤ گے اور تمہاری نجات اتنی یقینی ہے جتنی کہ خود مسیح کی۔ ہاں گناہ کرو اور خوب دلیری سے گناہ کرو۔ فقط ایمان رکھو اگرچہ ایک دن میں تم ہزار مرتبہ زناکاری یا خون کے مرتکب ہو۔ صرف ایمان رکھو اور میں کہتا ہوں کہ تمہارا ایمان تم کو بچا لیگا"۔

لوتھر کے شاگرد رشید یوسی بیوس جو کہ فرقہ انٹی نومنس کے بانی ہیں لکھتے ہیں کہ:۔ "یہ دس حکم کلیسہ میں نہ سکھلائے جائیں" "جو لوگ دس احکام کی تعمیل میں مصروف رہتے ہیں وہ شیطان سے علاقہ رکھتے ہیں۔ وہ سولی پائیں موسیٰ کے ساتھ" یہ دس احکام عہد عتیق کی کتاب خروج باب ۲۰ میں بتفصیل درج ہیں اور مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ شرک نہ کرو۔

۲۔ بت پرستی نہ کرو۔

۳۔ خدا کا نام بے فائدہ مت لو۔

۴۔ یوم السبت کو پاک رکھو اور اس دن کوئی کام نہ کرو۔

۵۔ ماں باپ کی عزت کرو۔

۶۔ خون مت کرو۔

۷۔ زنا مت کرو۔

۸۔ چوری مت کرو۔

۹۔ پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو۔

۱۰۔ ہمسایہ کو تکلیف نہ دو۔

ان احکام عشرہ کے عدم تعمیل کے معنے یہ ہوے کہ شرک کرو، بت پرستی کرو، خدا کا نام بے فائدہ لو، یوم السبت کی بے احترامی کرو، ماں باپ کی عزت نہ کرو، خون کرو، زنا کرو، چوری کرو، پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہیاں دو، ہمسایوں کو تکلیف پہنچاؤ۔ اس دستورالعمل کا نام مذہب رکھا گیا ہے۔ اور اس پولوسی مذہب کے بانیوں نے اس دستورالعمل کی صرف زبانی تعلیم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور ان لوگوں کے سوانح کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لوتھر اور پوسی بیوس وغیرہ نے اس کے مطابق عمل کر کے بھی دکھلا دیا۔ اس زمانے کے جو عیسائی ان تعلیمات پر عمل کرتے ہیں ان کو مسلمان علمائے محققین عیسائی نہیں کہتے بلکہ پولوسی کہتے ہیں اور اہل کتاب کے زمرہ سے خارج کرتے ہیں۔ جو احکام کہ اسلام میں اہل کتاب کے متعلق اور مسلمانوں کے اہل کتاب سے برتاؤ کے متعلق آئے ہیں ان سے پولوسی گروہ کو متمتع ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں بہر حال ہمکو اس سلسلہ میں پولوسیوں کے عقائد و اعمال سے سروکار نہیں ہم کو تو کتب سماوی کے سلسلہ میں تعلیمات اصلی پر تبصرہ کی ضرورت ہے ان تعلیمات کو موجودہ عیسائی حیثیت قبول کریں یا نہ کریں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ حکم دیا تھا کہ علمائے یہود کی ذاتی خرابیوں سے بچو اور ان خرابیوں میں ان کی تقلید نہ کرو مگر جو کچھ وہ تمہیں شریعت موسوی کی بابت تعلیم دیں اس پر

عمل کرو کیونکہ احکام توریت عیسائیوں کے لئے واجب العمل ہیں۔ گویا شریعت موسوی اور شریعت عیسوی ایک ہی چیز ہے۔ اب ہم اس اعتبار سے شریعت عیسوی کی چند خصوصیات یہاں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو آجکل کے "عیسائیوں" یا یورپیوں کی عام روش دیکھ کر اصلی عیسوی تعلیم کے متعلق غلط فہمیاں واقع نہ ہوں۔

طہارت احبار باب ۱۵، اور استثنا باب ۲۳، اور دوم سموئیل باب ۱۱، اور عہد جدید کے دوم قرنتیوں کے باب ۷ میں طہارت پر بڑا زور دیا گیا ہے مگر ان کی تعمیل پر آجکل بالعموم اس قدر زور نہیں دیا جاتا۔

ختنہ پیدائش باب ۱۷ میں آیہ ۹ سے ۱۵ تک ختنہ کا حکم ہے اور اس حکم پر زور دیا گیا ہے اور اسے ابد کا عہد قرار دیا گیا ہے۔ یہ حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:-

"اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے (یعنی ابراہام کے) درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے، اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ تمہارے پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا کیا پردیسی سے خریدا ہوا جو تیری نسل کا نہیں لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زر خرید کا ختنہ کیا جاوے اور میرا یہ عہد تمہارے جسموں میں عہد ابدی ہوگا۔ اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا۔"

تعجب ہے کہ ایسے صریح ایسے شدید ایسے اہم حکم کو عیسائیوں نے پس پشت ڈال دیا حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام کا ختنہ ہوا تھا۔ (دیکھو لوقا باب ۲ آیہ ۲۱) اور یوحنا بپتسما دینے والے کا بھی ختنہ ہوا تھا (دیکھو لوقا باب ۱ آیہ ۵۹)۔ پولوس نے بھی عروج مسیح کے بیس سال بعد یعنی تخمیناً سنہ ۵۲ء یا سنہ ۵۳ء میں طماؤس کا ختنہ کیا

(دیکھو اعمال باب ۱۶ آیہ ۱ تا ۳)۔

آج کل کے عیسائی اصطباغ کو ختنہ کا قائم مقام قرار دیتے ہیں مگر یہ خیال کئی وجوہ سے غلط ہے۔

۱۔ انجیل میں کہیں کوئی حکم ایسا نہیں پایا جاتا جس کی رو سے اصطباغ کو قائم مقام ختنہ قرار دیا گیا ہو۔

۲۔ اگر اصطباغ صحیح طور پر قائم مقام ختنہ ہے تو مختونوں کو اصطباغ کیوں دیا جاتا ہے؟ یعنی کوئی یہودی یا مسلمان عیسائی ہو تو اسے اصطباغ دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟

۳۔ اصطباغ یہودیوں میں بھی ختنہ کے ساتھ ہمیشہ سے جاری تھا۔ ایسی صورت میں ایک چیز دوسری چیز کی قائم مقام صرف اپنی رائے سے کیسے ہو سکتی ہے؟

روسن تاریخ کلیسا حصہ ۲ صفحہ ۲۳ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم کے کلیسہ میں عیسائیوں میں سنہ ۱۳۰ء کے قریب تک ختنہ کا دستور جاری رہا۔ جب یہودیوں کی مخالفت کے سلسلہ میں قیصر اڈرین نے حکم جاری کیا کہ ہر ختنہ کرنے والا قتل کیا جائے اُس وقت فلسطین کے عیسائیوں نے اس خوف سے کہ ان پر یہودی ہونے کا شبہ نہ کیا جائے نہ صرف ختنہ کو بلکہ ان تمام رسوم کو جنمیں وہ اور یہودی مشترک تھے موقوف کر دیا اور ایک غیر یہودی مرقس کو اپنا پیشوا قرار دیکر الگ ہو گئے اور جان کے خوف سے اپنی روش کو بدل ڈالا۔ مگر بعض عیسائیوں نے باوجود ان خطرات کے اپنی روش کو نہ بدلا اور اپنی قدیم چال پر قائم رہکر اپنی جماعتوں کو علٰحدہ کر لیا۔ انہیں لوگوں کو ابیونی کہتے ہیں۔

لحم الخنزیر | سور کا گوشت نہ صرف کھانا بلکہ اسے ہاتھ تک لگانا حرام ہے۔ دیکھو احبار باب ۱۱ آیہ ۷ اور استثنا باب ۱۴ آیہ ۸ اور یسعیاہ باب ۶۵ آیہ ۳ و ۴ اور باب ۶۶ آیہ ۱۷۔ عہد جدید کی کتاب اعمال کے باب ۱۵ کی آیہ ۲۹ میں ہے کہ:۔

"تم بتوں کے چڑھاووں اور گلا گھونٹی ہوئی چیزوں اور حرامکاری سے پرہیز کرو"۔ اس آیہ میں تحریف ہے بجائے "لحم الخنزیر" کے "حرامکاری" کا لفظ داخل کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف کھانے سے

چیزوں کی حلت و حرمت کا ذکر ہے۔ حرامکاری دوسرے مقامات پر حرام قرار دی گئی ہے۔ یہاں اس کا ذکر بے جوڑ ہے۔ قدیم یونانی نسخوں میں اس جگہ کو ترپاس کا لفظ پایا جاتا ہے جس کے معنی لحم الخنزیر کے ہیں۔ جدید نسخوں میں اس لفظ کو پورنیاس سے بدل دیا گیا جس کے معنی زنا کے ہیں۔ ڈاکٹر بنٹلی اور سٹر ریوس جو اناجیل کے بڑے مصحح ہیں لفظ کو ترپاس ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

مے نوشی احبار باب ۱۰ آیہ ۹ و ۱۰ کی رو سے شراب قطعاً حرام ہے اور نہایت شدت کیساتھ ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔ عہد جدید کی کتاب اول قرنتیون کے باب ۶ کی آیات ۹ اور ۱۰ کی رو سے شرابی "خدا کی بادشاہت کا وارث" نہیں ہو سکتا یعنی اس کا جہنمی ہونا قطعی ہے۔ متی باب ۲۴ آیہ ۴۹ و ۵۰ سے تو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شرابیوں اور متوالوں کے ساتھ کھانا بھی مسیح کی نگاہ میں گناہ تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انجیل یوحنا (باب ۲) میں جو مسیح کا سب سے پہلا معجزہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شرابیوں کی مجلس میں جا کر مشکوں میں بھرے ہوئے پانی کو شراب بنا دیا۔ پولوس نے تمطاؤس کو حکم دیا کہ شراب پیا کرو۔ (اول تمطاؤس باب ۵ آیہ ۲۳) مرتے وقت عیسائی سیکرمنٹ میں نان پاؤ اور شراب کا استعمال کرتے ہیں اور اسے مسیح کی آخری وصیت اور یادگار سمجھتے ہیں اور اسے عشاء ربانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ پولوس نے طیطس کے نام اپنے خط میں (باب ۱ آیہ ۱۵) صاف لکھ دیا ہے کہ:-

"پاک لوگوں کے لئے سب کچھ پاک ہے پر ناپاکوں اور بے ایمانوں کے لئے کچھ پاک نہیں" اس الہام کی رو سے تو برگزیدہ لوگوں کے لئے سب ہی کچھ جائز ہو گیا۔ ان متضاد تعلیمات کو دیکھکر بھی تحریف انجیل میں شبہ کرنا انتہائے سادہ لوحی کی بات ہے۔

سود مندرجہ ذیل آیات میں سود لینے کی بہت سخت ممانعت آئی ہے:- خروج باب ۲۲ آیہ ۲۵ احبار باب ۲۵ آیہ ۳۶ و ۳۷۔ استثنا باب ۲۳ آیہ ۱۹۔ زبور ۱۵ آیہ ۵۔ امثال ۲۸ آیہ ۸۔ حزقی ایل باب ۱۸ آیہ ۸ یرمیاہ باب ۱۵ آیہ ۱۰۔ علاوہ از این اول پطرس باب ۵ آیہ ۲ اور

اول تمطاوس باب ۲ آیہ میں جو "نار و النفع" کی ممانعت ہے اُس میں سود کو شامل سمجھا جا سکتا ہے۔

یوم السبت یہودیوں کے نزدیک یوم السبت یعنی سنیچر کا دن مبارک سمجھا جاتا تھا اور اس دن سارے کام کاج چھوڑ کر عبادت کی جاتی تھی (خروج باب ۲۰ آیہ ۸ و ۹) عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بھی سنیچر ہی کے دن کی بزرگی کو مانتے تھے (متی باب ۲۴ آیہ ۲۰) اب بجائے سنیچر کے عیسائیوں نے محض اپنی ذمہ داری پر اتوار کا دن متبرک قرار دے لیا ہے جس کی کوئی سند نہ توریت میں کہیں پائی جاتی ہے نہ انجیل میں اور یوں دیکھا جائے تو جمعہ کے دن عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیان کی جاتی ہے اور جمعہ ہی کے دن قصہ صلیب پیش آیا۔ اور نجات امت واقع ہوئی۔ اس اعتبار سے تو جمعہ کے دن کو سنیچر اور اتوار دونوں پر فضیلت ہوئی۔

احترام انبیاے سابقین تحریف و الحاق کا بُرا ہو اس معاملہ میں بھی اناجیل مروجہ کی بعض عبارات اور عیسائی مفسرین کی اُن پر طبع آزمائیاں اطمینان بخش نہیں بلکہ مذاق سلیم کو یہ باتیں بہت کھٹکتی ہیں۔ یوحنا باب ۱۰ آیہ ۸ میں ہے کہ: "سب جتنے مجھ سے (یعنی مسیح سے) آگے آئے چور اور بٹمار ہیں پر بھیڑوں نے اُن کی نہ سنی۔" ٹامس اسکاٹ صاحب اس آیہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ: "وہ جو عیسیٰ سے پہلے آئے ہیں اُن کو وفادار ہادی اور نبی نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ انہوں نے اسی کے ماتحت حکومت کا کام کیا اور اس کے پیش رو رہے"۔ لارڈنر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بشپ مانی بانی کا قول ہے کہ جناب مسیح کا یہ کہنا حضرت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے حق میں تھا۔ ناسخ بھی اس قول کو موسیٰ علیہ السلام ہی کے حق میں قرار دیتا ہے تو گو بھی اس معاملہ میں انہیں لوگوں کا پیرو ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں سمجھاتا کہ ایسی صورت میں عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کو برقرار کیوں رکھا اور اپنی امت کو اس کی پیروی کا تاکیدی حکم کیوں فرمایا ان دو متضاد باتوں میں سے ایک کو الحاقی ضرور ماننا پڑیگا قرائن تو اسی کی شہادت دیتے ہیں کہ انبیائے اولوالعزم کی شان میں اس قسم کے گستاخانہ کلمات پابندی شریعت سے ان لوگوں کی طبعی بیزاری کی دلیل ہیں۔ جناب مسیح بھی اپنے متبعین کے ان گستاخانہ تیور دل سے نہیں بچے۔ چنانچہ پولوس لکھتا ہے کہ

ام اپنے خط (باب ۱ آیہ ۲۴) میں لکھتے ہیں کہ :- "اب میں اپنی ان مصیبتوں سے جو تمہارے واسطے کھینچتا ہوں
خوش ہوں اور مسیح کی مصیبتوں کی کمیاں اس کے بدن کے (یعنی کلیسا کے) لئے اپنے جسم سے بھرے دیتا ہوں۔"
یہاں پولوس صاف طور پر عیسیٰ علیہ السلام کی مصیبتوں کو ناقص اور اپنی مصیبتوں کو کامل قرار دیتے ہیں جو لوگ اپنے
خاص نبی اور رسول سے نہیں چوکتے وہ بھلا دوسروں سے کب باز آسکتے ہیں یہی پولوس دوم قرنتیون کے
باب ۱۱ آیہ ۵ میں کہتے ہیں کہ :- "میں اپنے تئیں سب سے بڑے رسولوں سے کچھ کم نہیں سمجھتا ہوں۔" اسی باب کی
آیہ ۲ میں یہ اپنے آپ کو ایک بات میں خدا تک سے تشبیہ دے جاتے ہیں لکھتے ہیں کہ :- "مجھے تمہاری بابت
خدا کی سی غیرت آتی ہے"۔ ہم ان فقروں پر اس مضمون میں توجہ نہ کرتے اور صحف سماوی پر تبصرہ کرنے
والے کو ضرورت بھی نہیں کہ زید عمر بکر کی تحریروں پر التفات کرے۔ مگر جب ان تحریروں کو الہامی قرار دیا
گیا ہو اور صحف سماوی کے تحت میں لا کر مجموعہ کتب عہد جدید میں انہیں شامل کر دیا گیا ہو تو ان کے مضحکہ
انگیز پہلوؤں کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

باقی

تنزیل و تاویل
بسم اللہ الرحمن الرحیم

از

جناب مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔

حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لئے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام پر اُتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو اُن میں ودیعت رکھا اور پھر اُن سب کا خلاصہ توریت و انجیل و زبور و قرآن حکیم میں درج فرمایا۔ اور پھر ان سب علوم کو قرآن کریم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا۔ اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم میں بھر دیا۔

کہتی ہے یہ زبان سے قرآں کی خامشی — لاریب ذات پاک کی سچی کتاب ہوں
مجھ میں بھرے جہاں کے علوم و فنون ہیں — قرآن میرا نام ہے ام الکتاب ہوں

بعض علمائے سلف کے نزدیک بسم اللہ الخ سورۂ فاتحہ اور ہر سورۃ کا جز ہے اور امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان۔ اور امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزو نہیں۔ دو سورتوں میں فصل کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ہے تبرکاً ہر سورت کی ابتدا میں اس کو لکھا جاتا ہے۔ سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اِن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں میں فصل
کان لایعرف فصل السورۃ حتی تنزل — نہ جانتے تھے۔ یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوئی۔

اور اسی وجہ سے بسم اللہ الخ کو نماز میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ جہراً نہیں پڑھا جاتا تاکہ جزو فاتحہ ہونیکا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لئے بسم اللہ الخ کو کسی سورت کیساتھ ملاکر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ سورۃ سے علیحدہ لکھتے ہیں بسم اللہ الخ چونکہ بالاتفاق سورۂ نمل کا جزو ہے اس لئے اس کو مثل دیگر آیات کے ملاکر لکھا جاتا ہے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور خلفاء راشدین کی مستمر سنت یہ تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر۔ ترمذی۔ زاد المعاد)

امام ابو بکر رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرات اہل علم اس کی مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو با ہے بعض علماء کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لئے ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لئے، اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس صورت میں ابتدا ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و استکانت کا اظہار اور پہلے ہی وہلہ میں اپنی حول اور قوۃ سے تبریہ کا اعلان ہوجاتا ہے یعنی اسی کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی اسی کا مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ ادعاء مصاحبت نہو۔ تعالیٰ جد ربنا ما اتخذ صاحبۃً

اور یہی معنی ایاک نستعین کے زیادہ مناسب ہیں۔ اور یہی معنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے مرادف ہونیکی وجہ سے کنز من کنوز الجنۃ (یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہوسکتے ہیں اور باء بسم اللہ کا کسرہ بھی انکسار اور ذل عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

اللہ اس ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفات کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے

عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالہ ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسماء حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ کما قال تعالیٰ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشہادۃ ۔ ھو الرحمٰن الرحیم ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون ھو اللہ الخالق البارئ المصور لہ الاسماء الحسنیٰ یسبح لہ ما فی السمٰوٰت والارض وھو العزیز الحکیم ۔

اور یہ اسم عظیم ۔ رب اعلیٰ ہی کیساتھ مخصوص ہے اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی وحدہٗ لاشریک لہ کی ذات پاک کے لئے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات وصفات کا شریک وسہیم نہیں اسی طرح اس اسم عظیم میں بھی اس کا کوئی قسیم نہیں۔

غالباً اسی وجہ سے امام اعظم رضی اللہ عنہ نے لفظ جلالہ کو اسم اعظم فرمایا ہے جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

حدثنا محمد بن الحسن عن ابی حنیفۃ قال اسم اللہ الاکبر ھو اللہ قال محمد الا تری ان الرحمن اشتق من الرحمۃ والرب من الربوبیۃ وذکر اشیاء نحو ھذا واللہ غیر مشتق من شئ اھ مشکل الآثار ص ۶۲ ج ۱	محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابو حنیفہ سے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے۔ کہا محمد بن حسن نے اس لئے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے اور رب ربوبیت سے اور اسی قسم کی مثالیں ذکر فرمائیں۔ اور لفظ اللہ کسی شئے سے مشتق نہیں۔

خود چہ شیریں است نام پاک تو ۔ خوشتر از آب حیات ادراک تو

نام تو چوں بر زبانم میرود ۔ ہر بُن مو از عسل جوئے شود

اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام — شیر و شکر می شود جانم تمام

اللہ اللہ ایں چہ نام خوش مذاق — حرف حرفش میدہد جان را بروق "خوشی وہتی"

اسم اعظم ہست اللہ عظیم — جان جان و محی عظم رمیم

(خاتمہ مثنوی از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ)

اسم اللہ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسم رحمٰن کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔

قُلِ ادعوا اللہ أو ادعوا الرحمن — آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو۔

نیز اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔ عبداللہ میں عبد' اسم اعظم کی طرف مضاف ہے اور عبدالرحمٰن میں اسم رحمٰن کی طرف مضاف ہے جس کا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبدالرحمٰن کو بعد میں۔

رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں۔ اور ان دونوں صفتوں کا اطلاق حق جل وعلا پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسا کہ علیم و قدیر اور سمیع و بصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے۔ اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں۔

لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر — کوئی شی اس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں۔

واللہ الغنیُّ وأنتمُ الفقراء — اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم اس کے محتاج ہو۔

اسی طرح وہ اپنی صفات رحمت میں بھی نہ رقت قلب کا محتاج ہے اور نہ انفعال نفس کا جیسے اس کی ذات بے چون و بیگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم و قدرت اور صفت رافت و رحمت

وغیرہ بھی بے چون وچگون ہے۔

اس کی بے چون وچگون رحمت حقیقیہ علماء کی مجاز و تاویل اور استعارہ و تمثیل کی ذرہ برابر محتاج نہیں۔

ای بروں از وہم و قال و قیل من　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا یہی مسلک تھا۔ اور وہ حضرات اس لیس کمثلہ شیء کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے۔

امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل و تمثیل کو چھوڑ کر مذہب سلف ہی کی طرف رجوع فرمایا جیسا کہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اس کی تصریح کی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کی تفصیل الرحمن علی العرش استوی کی تفسیر کے وقت ہدیہ ناظرین کریں گے۔ واللہ الموفق وھو المستعان۔

ابتداء کے لئے ان تین ناموں یعنی اللہ اور رحمن۔ اور رحیم کو اس لئے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گذرتی ہیں۔ اول اس کا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اس کے لئے مدت بقا مقدر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جس کو عرف میں حیات دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم اس نشأۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیات دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا عمل نیک پر جزا اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تاکہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہو جائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لئے کہ تخلیق و تکوین بارگاہ الوہیت سے متعلق ہے۔ اور لفظ رحمن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ

ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لئے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لئے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرہ کے یاد دلانے کے لئے ذکر فرمایا۔

دار دنیا چونکہ مومن و کافر سب کیلئے باعث رحمت ہے مومن کیلئے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس کے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر وہ اختیار کرے تو یہ بھی کر لے تو فی الحال کا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے۔ نیز بعثت انبیاء اور ارسال رسل اور انزال کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لئے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اُس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لئے باعث رحمت ہے اور دار آخرت صرف مومن کے لئے باعث رحمت ہے اور کافروں کے لئے باعث عذاب و نقمت۔ کما قال تعالیٰ۔

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ پھر جب صور پھونکا جائیگا تو وہ دن بڑا سخت ہوگا کافروں یَّوْمٌ عَسِیْرٌ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ پر آسان نہ ہوگا۔

اس لئے نشاۃ دنیا کے یاد دلانے کے لئے لفظ رحمٰن۔ کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زاید مبالغہ ہے ذکر فرمایا۔ اور نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لئے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لئے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے۔ اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا۔ اور دار آخرت خاص مومنوں کی رحمت کے لئے ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ • اور وہ ایمانداروں پر رحمت والا ہے۔

نیز رحمٰن۔ فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے

لہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں استوار علی العرش کو ہمیشہ صفۃ رحمٰن ہی کیساتھ ذکر فرمایا ہے۔ الرحمٰن علی العرش استوی ثم استوی علی العرش الرحمن۔ اس لئے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے جیسا کہ اس کی رحمت مخلوق کو محیط اور واسع ہے کما قال تعالیٰ ورحمتی وسعت کل شیء پس الرحمٰن علی العرش استوی سے سب سے زیادہ وسیع مخلوق پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمت کے ساتھ استوی بیان کرنا مقصود ہے اور صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قضائے خلق کے بعد ایک کتاب میں لکھکر ان رحمتی تغلب غضبی یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے اپنے قریب عرش پر رکھا۔

اس لئے کہ کلام عرب میں۔ وزن فعلان۔ اکثر صفات عارضہ اور اوصاف متجددہ اور حادثہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان وریان وغضبان وغیرہ۔ لہذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث وتجدد اور دار فانی کیطرف اشارہ مناسب ہوا۔

رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے فَعِیْلٌ کا وزن کلام عرب میں معانی ثابتہ کے لئے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم وحکیم حلیم وجمیل۔ لہذا لفظ رحیم سے دار باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔

علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے جو ان تمام انواع واقسام کو شامل ہو یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے۔ کبھی اس کی رحمت راحت وانعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب وآلام کی صورت میں کما قال تعالی عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلا واسطہ ہو اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دار آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی۔ اللہ تعالی کی طرف سے بلا واسطہ بھی ہوگی اور کسی قسم کا امیں شائبہ رنج والم کا بھی نہ ہوگا۔

خلاصہ

یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ ہے تمام مباحث الٰہیات کیطرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت وشریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے بغیر خدا کی

مرضی کے موافق ایک لمحہ گذرنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کیطرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امر ہیں کہ جو تمام انبیا رعلیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں۔

حاملان قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

از جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی علیگ

ما شرح معجز دم عیسیٰ نوشتہ ایم تفسیرے از خدای تعالیٰ نوشتہ ایم

در راہ نور بے سروپا بود مہر و ماہ افواج حسن یار سراپا نوشتہ ایم

یہود سے خطاب اور اسباب عتاب

یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ من و سلویٰ کھاتے کھاتے جی بھر گیا خدا سے دعا کیجئے کہ تبدیل ذائقہ کے لئے کچھ زمین کی پیداوار عنایت ہو۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ	وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تو
وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا	ایک ہی کھانے پر کبھی قناعت نہ کریں گے۔ اس لئے
تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآىِٕهَا	ہمارے حق میں اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ ہمارے
وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۔	لئے زمین کی پیداوار نکالے مثلاً ساگ ترکاری ککڑی،
	لہسن (یا گیہوں یا چنے) مسور اپیاز
قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ	کہا کیا تم لوگ اچھی چیز کو ادنیٰ چیز سے بدلتے ہو؟
هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ	کسی شہر میں اتر پڑو کہ جو تم نے چاہا ہے وہاں سب ملجائیگا
وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ	ذلت اور مسکنت نے اُن کو گھیر لیا اور وہ اللہ کے غضب

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ کے ساتھ لوٹے، یہ اس لئے ہوا کہ وہ لوگ اللہ کی نشانیوں
بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ کا انکار کرتے تھے اور انبیا کو ناحق مار ڈالتے تھے،
ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۲:۲) اس کفر بآیات اللہ وقتل نبیین کے مرتکب وہ اس لئے
ہوئے تھے کہ انہوں نے نافرمانی کی، عاصی ہوئے، معصیت میں پڑے اور وہ حد سے بڑھ جایا کرتے تھے۔"

سوال یہ تھا کہ یہودی اتنے بڑے عذاب کے مستحق کیوں ٹھہرے۔

(۱) ایک ہی لون طعام کا لزوم و دوام اگر ذائقہ کو خوش نہ آئے اور تبدیل مزہ کی درخواست کی جائے، زمین کی پیداوار کو جی چاہے، جس کے اہل زمین خوگر ہیں تو اس میں معصیت کی کیا بات ہے؟

۲۔ یہود نے کسی غیر سے رجوع نہیں کیا تھا، اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی، نہ اس حیثیت سے کہ پیغمبر کوئی فاعل مختار ہیں، بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ "فرستادہ خاص پروردگار ہیں" پروردگار سے دعا کریں کہ ہماری مراد بر آئے، پیغمبر سے دعا کرانے اور خدا سے ایک مدعائے جائز کے طلبگار ہونے میں کیا کفر ہے۔؟

۳۔ درخواست گذاروں نے پیغمبر کو درخواست دی تھی، جواب بھی انہیں کی زبان سے ملنا چاہیئے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں برتر ہے کہ بندے تو نبی سے خطاب کریں اور جواب اللہ دے۔

۴۔ ادنیٰ کے معنی اقرب ہیں، من الدنو، قربت میں کیا اشارہ ہے؟

۵۔ اس وقت تک یہود سے کفر بآیات اللہ و قتل نبیین بغیر الحق ثابت نہیں، جو ناکردنی افعال بعد کو ہوئے قبل ہی سے اس کا مواخذہ یعنی چہ؟ مواخذہ وقوع فعل کے بعد ہے۔ ہنوز فعل واقع نہیں ہوا کہ مواخذہ ہونے لگا۔ اس کے کیا معنی؟

فرمایا: حسن بن حسن البصری سے روایت ہے:۔

اِنَّھُمْ کَانُوْا اَھْلَ کُرَّاثٍ وَاَبْصَالٍ د یہ لوگ گندنا اور پیاز اور مسور کھانے والے لوگ تھے

اعداس فنزعوا الی عکرھم عکرالسوء	اسی خوئے بد کی جانب مائل ہوئے، طبیعت میں اپنی
واشتاقت طبایعھم الی ماجرت علیہ	عادت جاریہ کا شوق بڑھا اسی بنا پر کہنے لگے "ہم
عادتھم فقالوا لن نصبر علی طعام	ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے" یعنی ایک طرح
واحد ای نوع منہ ۔	کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے ۔

یہ ایک طرح کا کھانا کیا تھا جس پر وہ صبر نہ کر سکے، اُس کی حقیقت بھی سن لیجئے :۔

والمراد بالطعام الواحد ھو المن والسلوی	طعام واحد سے مراد من وسلوی ہے، یہ دونوں اگرچہ
وھما وان کانا طعامین لکن لما کانوا	دو مختلف طعام تھے لیکن بنی اسرائیل ان دونوں
یاکلون احدھما بالآخر جعلوھما	کو روزمرہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کے کھایا
طعاما واحداً لتکررھما فی کل یوم	کرتے تھے، اس لئے ایک ہی کھانا قرار دیا یا رہی
عدم وجود غیرھما معھما ولا تبدلہ	دونوں چیزیں ہر روز کھانے کو ملیں، ان کے ساتھ
بھما ۔	کوئی اور کھانا موجود نہ ہوتا اور نہ اس میں کبھی تبدیلی ہوتی

دوسری تفسیر یہ ہے :۔

انما طلبوا ھذہ الانواع لانھم ملوا	بنی اسرائیل نے یہ چیزیں اس لئے طلب کیں کہ "تیہ"
من البقاء فی التیہ فسالوا ھذہ	میں رہتے رہتے گھبرا گئے تھے، اس بنا پر ایسے مطعومات
الاطعمۃ التی لا توجد الا فی البلاد وکان	کی خواہش کی جو بجز شہروں کے اور کہیں نہیں ملتے
غرضھم الوصول الی البلاد لا تلک	غرض یہ تھی کہ کسی طرح شہری آبادی تک پہنچ سکیں،
الاطعمۃ	یہ کھانے مقصود بالذات نہ تھے ۔

جواب میں اگرچہ بہتر کو چھوڑ کر فروتر کی خواہش پر ملامت کی گئی تاہم "تیہ" سے نکل کے کسی شہر میں اُتر پڑنے کی اجازت مل گئی اور یہی درخواست گذاروں کا مدعا تھا۔

"تیہ" میں بنی اسرائیل کے ابتلا و افتتان کا سبب یہ تھا (واللہ اعلم بحقیقتہ) کہ مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے پشتیں گذر چکی تھیں، محکومیت کے تمام جراثیم چھا گئے تھے، اللہ چاہتا تھا کہ اس قوم کو غالب بنائے اور ایک دنیا کا حاکم و فاتح فرمائے جس کے لئے جفاکشی، خشونت عیش و شظف معیشت و مواظبت محنت لازم تھی، اس جنگی تربیت کے لئے تیہ جیسا ریگستان منتخب ہوا جو وسائل تنعم و ذرائع آرام پسندی سے یکلخت عاری تھا، یہ تربیت اگرچہ سخت تھی مگر کوئی محکوم قوم بدون سخت ترین جنگی تربیت کے حکومت پر فائز نہیں ہو سکتی، بنی اسرائیل کا اس سے گھبرانا اور اس تربیت کی سختیوں پر صبر کرنے سے بشدت انکار کرنا ہی معصیت تھا۔

۲۔ تنبیہ اس بات پر نہیں ہوئی تھی کہ پیغمبر کا کیوں ذریعہ اختیار کیا۔ بلکہ تنبیہ کا سبب یہ تھا کہ اس دشت مخوف میں خدا اُن کو ایسی تربیت دینا چاہتا تھا جو فیروزی اور فیروزمندی کی دلیل راہ ہو، اس فضل رحمت سے جب بنی اسرائیل نے انکار کیا تو عتاب کے مستحق ہوئے۔

۳۔ مفسرین نے قاطبتہً یہی تفسیر کی ہے:۔

قال یعنی موسیٰ علیہ السّلام لھم — یعنے کہنے والے اور بنی اسرائل کو جواب دینے والے

وقیل القائل ھو اللہ والاول اولی — موسیٰ علیہ السلام تھے، ایک ضعیف تاویل یہی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا گر پہلی ہی تفسیر زیادہ درست ہے

لیکن اگر خطاب بالنبی کا جواب من اللہ بھی ہو تو اس سے خدا کی شان میں کوئی شین لازم نہیں آتا

۴۔ قربت میں یہ اشارہ ہے کہ قریب تر زمانہ میں یہی چیزیں اُن کو ملا کرتی تھیں اور ان سے طبیعت مالوف تھی، مفسرین کہتے ہیں:۔

والمراد أتضعون ھذہ الاشیاء التی — مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ان چیزوں کو اختیار کرتے

ھی دون موضع المن والسلوی الذی — ہو جو من و سلویٰ کے درجہ سے گری ہوئی ہیں،

ھما خیر منہا۔ من وسلویٰ ان سب سے بہتر ہے۔

اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ "ادنیٰ" کے معنی اسفل و ارذل کے بھی آتے ہیں۔

فان الادنیٰ اصلہ من دون ای الردیٔ لفظ ادنیٰ "دون" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ردی کے ہیں

۵۔ بے شبہ اس وقت تک یہود نہ کفر کے مرتکب ہوئے تھے نہ اپنے پیغمبروں کی ناحق خون ریزی کی تھی، اس میں بھی شک نہیں کہ کسی فعل پر مواخذہ وقوع فعل کے بعد ہونا چاہیئے، یہ بھی مسلم ہے کہ یہ سوال ایسا نہ تھا کہ ضرب ذلت و مسکنت و تبوء بغضب اللہ کا مستحق بناتا، لیکن یہاں سرے سے یہ بات ہی نہیں، سوء فہم سے یہ شبہات ناشی ہوئے، قلت تدبر نے ان پر زنگ چڑھایا اور فقدان تفقہ نے محل اعتراض بنایا، کہنے کی بات یہ نہیں کہ لوگوں نے آیت کی تاویل کیا کی ہے، کہنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کیا کہتا ہے ایک زمانہ میں نظیری نے کہا تھا۔

ہر ذرہ را بقدر طلب نور دادہ اند در کار خویش شب پرہ را آفتاب گیر

اب آپ اس کو یوں پڑھئے۔

بگزار برق طور و شرار شہاب را دریاب نور و شب پرہ گیر آفتاب را

آیت "وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ" اس میں اللہ تعالیٰ کو جو کچھ کہنا تھا سب کہ دیا، صیغہ خطاب سے ابتدا کی ہے اور خطاب ہی پر انتہا ہوئی ہے کہ اے بنی اسرائیل اس وقت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے یہ کہا تھا اور موسیٰ نے اس کا یہ جواب دیا تھا۔

یہاں تک یہ مضمون پورا ہو گیا، اب اس کے بعد دوسرے جملہ سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے

کہ بنی اسرائیل کی فلاں فلاں بدکرداریوں نے اُن کو ذلت و مسکنت و غضب الٰہی کا مستحق بنایا، پھر ان بدکرداریوں کی علتیں بیان کی ہیں، پھر انھیں علل و اسباب کے منشاء ورود کی توضیح کر دی ہے کہ آنے والی قومیں محفوظ رہ سکیں اور کوئی محل اشتباہ نہ رہ جائے۔

یہ پورا بیان صیغہ غائب سے آغاز ہوتا ہے اور غائب ہی پر اس کا انجام ہے تمام تفسیریں شاہد ہیں کہ وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ ای ضرب علی قرو عیھم و اخلائھم الھوان والفقر والفاقۃ مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی جو نسل بعد کو آنے والی تھی اور کفر بآیات اللہ وقتل نبیین بغیر الحق کا ارتکاب کرنے والی تھی اُن پر ذلت و مسکنت محیط ہو گئی۔

"ذلک" سے یہود کے ذلیل و مغضوب ہونے کے سبب اول کی طرف پہلے اور سبب ثانی کی طرف بعد میں اشارہ کیا ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں:-

و مجموع ما بعد الاشارۃ الاولی والاشارۃ الثانیہ ھو السبب لضرب الذلۃ وما بعدہ۔	"ذلک" کے ذریعے آیت میں دو اشارے کئے ہیں انہیں اشارات کا مجموعہ یہودیوں کے ذلیل ہونے اور بعد کو مغضوب ہو کر رہنے کا باعث ہوا۔

یہ اطناب و اسباب ممکن ہے مُمل ہو لیکن تقصیر و تقلیل شاید حقائق حق میں مُخل ہوتی ولی فیھا مآرب اُخری۔

چنانکہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

آیت میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ صبر علی المکارہ سے جس کو انکار ہے اللہ کی رحمت اُس سے بیزار ہے اللہ کی مرحمت اُسی کے لئے ہے جو شتہیات و مستلذات نفس کے فقدان پر از خود رفتہ نہ ہو جائے جس کا جس میں ہو اُسی میں لگا رہے کہ لزوم صلاح و استمرار خیر مثمر فتوح و مُزکی روح ہے، ونعم اجر العالمین۔

بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

صلاۃ علی آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آل رسول پر بھی درود بھیجنا لازم ہے اور اس میں لفظ "علیٰ" سے تفریق نہ کرنی چاہیے۔

فرمایا، ہم اسی کے خوگر ہیں کہ رسول کے ساتھ آل رسول پر بھی درود بھیجیں۔ اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید، اللھم بارک علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید۔

لیکن لزوم و تفریق کی کوئی روایت صحیح ثابت نہیں "اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ	حقیقت میں اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا	ہیں اے وہ لوگو کہ ایمان لاچکے ہو پیغمبر پر درود وسلام
تَسْلِیْمًا۔ (۳۳:۷)	بھیجو۔

یہاں فقط صلاۃ علی النبیؐ پر اقتصار ہے اور اس کے ساتھ کسی اور کی شرکت نہیں۔

لباس فاخر

لزوم و تفریق کے متعلق دریافت فرمایا کہ یہ معانی کہاں سے بیان کیے؟

عرض کی:۔ جناب قبلہ وکعبہ ...... تشریف لائے ہیں اور بڑی شان وشوکت سے دربیہ میں مقیم ہیں۔ لباس فاخر در بر عمامہ طیب الشمامہ بر سر کل کے موعظہ میں بھی تصریح کی تھی اور اس کے اطراف بحث پر جناب قبلہ وکعبہ نے شرح وبسط سے نظر ڈالی تھی، فرمایا:۔

بیا دطوف حریم برہنہ پایاں کن   کہ با تو کعبہ سخن در لباس می گوید

عرب قدیم میں ایک شخص فاخر تھا جسے بھڑکیلے کپڑے پہننے کی عادت تھی، عربوں کی سادہ

بھڑک اور نمود کی متحمل نہ تھی، اس لیے یہ وضع مذموم مضروب المثل ہو گئی کہ بیشتر مجبیوں کو بھڑکیلے لباس میں دیکھتے تو کہتے۔ "ہٰذا لباسُ فاخر" یہ فاخر کی وضع ہے یعنی ویسی ہی بھڑک اس میں بھی ہے۔

فخور

فاخر کے بعد "فخور" کی جانب ذہن منتقل ہوا کہ اللہ تعالیٰ "مختالٍ فخور" کو کیوں دوست نہیں رکھتا؟

الفخور من الابل العظیمۃ الضرع العلیلۃ اللبن، ومن الغنم کذلک	جن اونٹنیوں کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم ہو، اُن کو فخور کہتے ہیں، بھیڑ بکریاں بھی اسی طرح کی ہوں تو اُن کو بھی "فخور" کہیں گے۔

اس بنا پر فخور ایسا شخص ہوگا جس میں ظاہری نمود زیادہ اور حقیقی سود و بہبود کم ہو، کوئی وجہ نہیں کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ دوست رکھے۔

رسائل و مسائل

جواب تنقید بر "تعلیمات قرآن"

از

جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری

رسالہ ترجمان القرآن میں جو تنقید آپ نے شروع کی ہے اس کی دو قسطیں نظر سے گذریں۔ میں اس تنقید پر دو باتوں کا شکر گذار ہوں پہلی یہ کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے متانت اور سنجیدگی سے لکھا ہے جس کی ہمارے ملک کے رسالوں میں بہت کمی ہے دوسری یہ کہ مزید تشریح و تبیین کا موقع باقی چھوڑا ہے مگر اس کے ساتھ اس بات کی شکایت بھی ہے کہ میں نے تعلیمات قرآن لکھی ہے اس کے لئے نقد کی کسوٹی قرآن ہی کو بنانا چاہئے تھا۔ مگر آپ نے عام مسلمانوں کے عقیدہ کو اس کے پرکھنے کا معیار مقرر کیا جس کے خلاف یہ کتاب ایک صدائے احتجاج ہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے جس قدر اعتراضات کئے ہیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ میں مختصراً ان کے جوابات لکھتا ہوں۔

جن و انس سب سے پہلی گرفت میری کتاب پر آپ کی یہ ہے کہ "جن و انس کے الفاظ قرآن میں جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں ان دونوں سے مراد انسانوں کے ہی طبقات ہو سکتے ہیں"۔ آخر میں آپ نے اس کو میری کمزوری پر محمول کیا اور کہا ہے کہ غالباً مولف نے ان لوگوں کی رعایت ملحوظ رکھی ہے جن کو جن نامی ایک آتشین مخلوق سے انکار ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ صفحہ ۳۰ میں جہاں سے جن کا بیان میں نے شروع کیا ہے پہلا فقرہ یہی لکھا ہے کہ "جن ایک آتشین مخلوق ہے

جن کو اللہ نے انسان سے پہلے آگ سے پیدا کیا" اگر میں جن کے منکروں سے مرعوب ہوتا تو سب سے پہلے آتشیں جن کے وجود کو کیوں تسلیم کر لیتا ۔ حاشیہ میں میں نے بیشک یہ لکھا ہے ۔

جن کا لفظ قرآن میں صرف مکّی سورتوں میں آیا ہے مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا اور جن کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشین جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں "

یہ یاد رہے کہ یہ حاشیہ کی عبارت یعنی میری اپنی بات ہے جس سے آپ کو اتفاق نہ ہو تو فوراً قلم زد کر دیجئے کیونکہ میں نے آغاز کتاب میں ہی لکھ دیا ہے کہ حاشیہ میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو اتنی وقعت بھی نہیں دیتا کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں ۔ یہ تو صرف طلبار قرآن کو غور و فکر کی رہنمائی ہے اور بس وہ بھی اس لفظ کے ساتھ کہ خیال ہو سکتا ہے ۔ یہ نہیں کہ حتمی یا قطعی طور پر کہتا ہوں ۔ وجہ اس خیال ہو سکنے کی حسب ذیل ہے آتشیں جن میں سے ابلیس ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے ۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔۲۷ وہ (ابلیس) اور اس کا قبیلہ تمکو وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے ہو ۔

بخلاف اس کے حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کے پاس جو جن کاریگر، معمار اور غوطہ خور تھے وہ نظر آتے تھے ۔ ان میں سے بعض اس قدر سرکش تھے کہ زنجیروں میں باندھ کر رکھے جاتے تھے ۔ یہ انسانی صفات ہیں ۔ یہ خیال کرنا نہایت بعید ہے کہ یہ وہی آتشیں جن تھے جو تانبے کی بڑی بڑی دیگیں محراب اور مورتیں وغیرہ بناتے تھے اور نہایت کامل شیشہ گر اور بڑے ماہر معمار ہو گئے تھے ۔ کیونکہ آتشیں جنوں کو ان امور سے کیا سروکار رہے ۔ علاوہ بریں تاریخ اور خود توریت سے ہمکو ان فردوں

کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمان نے مصر کے بادشاہ سے درخواست کر کے ان کو طلب کیا تھا اس لئے اگر میں نے طبایع کو اس مفہوم کی طرف توجہ دلائی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی غلطی نہیں کی۔

آپ کی دلیل ہے کہ شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے۔ اور شیطان جن ہے۔ اور جن آگ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے شیاطین جو حضرت سلیمان کے تابع تھے آتشین جن تھے اس منطقی دلیل میں دوسرا مقدمہ یعنے شیطان جن ہے صحیح نہیں قرآن میں جو وارد ہے کہ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ [18] (وہ جن میں سے تھا سو اپنے رب کے حکم سے سرکشی کر بیٹھا) یہ ابلیس کے متعلق ہے نہ کہ شیطان کے ابلیس بیشک شیطان ہے لیکن ہر شیطان ابلیس نہیں ہے اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں ہے قرآن میں ہے۔ شَیٰطِیْنُ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ نیز منافقوں کے سرغنوں کو بھی شیطان کہا گیا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ۔ کیا یہ دونوں بھی آتشین ہیں؟۔

مفہوم خلافت یہ بھی میں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ آدم کے متعلق خلیفۃ اللہ ہونے کا خیال صحیح نہیں۔ بلکہ وہ اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے جانشین تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم یا فرزندان آدم کی شان میں جہاں بھی قرآن میں یہ لفظ آیا ہے "خلیفہ فی الارض" "یا خلافت فی الارض" آیا ہے آخر تک سارے قرآن میں کہیں "خلیفۃ اللہ" کا لفظ نہیں ہے۔ اس لئے آپ قرآن سے قطعاً آدم یا فرزند آدم کو خلیفۃ اللہ یا نائب حق ثابت نہیں کر سکتے۔ خیالی دلیلیں آپ نے دو لکھی ہیں۔

۱۔ اگرچہ حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن پردہ میں ہے اور پردہ میں رہنے والے کی نیابت پردے سے باہر رہنے والا کر سکتا ہے"۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اللہ کی شان میں آپ نے صرف الباطن ہی دیکھا "الظاہر" نہیں دیکھا کسی شاعر نے خوب کہا ہے"۔

بے حجابی یہ کہ ہر اک شئے میں جلوہ آشکار
اس پہ پردہ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

یا اس کو معذور پردہ نشینوں پر قیاس کیا ہے؟ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ ۱۷/۱۲ — ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو نہ تو اولاد رکھتا ہے ملک میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا مددگار ہے۔

۲۔ دوسری دلیل آپ کی یہ ہے کہ اس نیابت کے تخیل میں جو رفعتیں ہیں وہ پرانے ساکنین ارمن کی بجائے عرش نشینی کے تخیل میں ہرگز نہیں"۔

اگر خیال کی رفعت اور شاعرانہ بلند پروازی مقصود ہے تو نیابت کے تخیل سے کہیں بلند تر منصور کا نعرہ ہے۔ مگر اس کو تو مولانا صاحبان نے دار پر چڑھا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں رفعت تخیل نہیں بلکہ حقیقت دیکھی جاتی ہے۔ نائب حق بنا کر آپ نے آدم کا رتبہ تو بڑھا دیا مگر اس کبیر متعال کو جو ہر شے پر قادر ہے پردہ نشین قرار دیکر جس کو نائب کی احتیاج ہو کس قدر اپنے درجہ سے گرا دیا۔

اصل میں آپ اگر بغدادیوں کی تاریخ کا غائر مطالعہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ وغیرہ کے الفاظ وہ سانچے ہیں جن میں انھوں نے استبداد کے بت دینی روپ میں ڈھالے تھے

آدم کا گناہ ساری دنیا یہی کہتی ہے کہ آدم نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا اور اس گناہ پر جنت سے نکالے گئے۔ قرآن میں بھی یہی ہے۔ چنانچہ ہبوط کے وقت اللہ نے آدم کے فرزندوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ کَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَیْکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ ۷/۲ — اے آدم کے فرزندو! شیطان کہیں اسی طرح تم کو بھی نہ بہکائے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کے ورغلانے سے شجر ممنوعہ جو آدم نے کھا لیا تھا اسی جرم پر جنت سے نکالے گئے۔ دوسری آیت میں مزید تصریح ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا — پھر شیطان نے ان کو اس سے پھسلا دیا اور ان کو (...)

كَانَا فِيهِ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ (آرام سے) جس میں تھے نکلوا دیا۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم
عَدُوٌّ ۲ ۳۶ ایک دوسرے کے دشمن۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس ارحم الرحمین سے یہ ممکن ہے کہ گناہ بھی معاف کر دے جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے اور پھر اسی جرم میں جنت سے نکال بھی دے؟ اس لئے میں نے جو لکھا ہے کہ "آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا ورنہ جنت سے نہ نکالتا"۔ یہ نہ تفسیر بالرائے ہے نہ اس کی بری مثال ہے جیسا کہ آپ کا گمان ہے بلکہ خالص تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔

کیا وجہ ہے کہ جب حضرت داؤد مغفرت مانگتے ہیں فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۳۸ ۲۳ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۳۸ ۲۴ مگر جب آدم و حوا مغفرت مانگتے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۲۳ تو جواب ملتا ہے۔ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۲۴ آپ کا یہ کہنا کہ اللہ نے آدم کی توبہ قبول فرمائی اور ان کو برگزیدہ کیا جس کو میں نے بھی لکھا ہے معافی کی دلیل نہیں۔ اگر توبہ و مغفرت اور عفو وغیرہ الفاظ میں جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں آپ فرق نہیں کریں گے تو اس کتاب کے بہت سے حقائق قطعاً سمجھ میں نہ آسکیں گے۔

مسئلہ غلامی ہر فرزند آدم زمین کا بادشاہ ہے۔ آدم کے متعلق ہے إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۲ ۳۰ اور فرزندان آدم کے بارے میں ہے وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ ۶۵ پھر ان کی شان میں ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۱۷ کیا فرزند آدم کو جو زمین کی بادشاہت بلکہ آپ کی تفسیر کے مطابق نائب حق ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے غلام بنا لینا فطرت کے خلاف نہیں ہے؟ پھر جو چیز فطرت کے خلاف ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن اس کو جاری رکھے آپ اس قدر تو تسلیم کرتے ہیں کہ۔

غلامی کی دو صورتیں اس وقت دنیا میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ بعض ممالک کے باشندوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ دو سری یہ کہ جنگ میں جو

لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ ان دونوں شکلوں میں سے پہلی شکل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی ہونگا (بخاری کتاب البیوع) اور دوسری شکل کے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کو یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن سے مسلمان قیدیوں کے ساتھ انکا مبادلہ کرلیا جائے لیکن اگر رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو اور فدیہ نہ وصول ہو سکے اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بناکر رکھیں۔

یہ تو مسلم ہوا کہ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنانا ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کے مدعی قیامت کے دن خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ اب رہا اسیران جنگ کا معاملہ۔ ان کے متعلق قرآن میں قطعی حکم ہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً پھر یا تو احسان رکھکر انھیں چھوڑ دو یا فدیہ لیکر۔ فدیہ خواہ زر نقد یا سامان کی صورت میں ہو یا مبادلہ اسیران کی شکل میں مگر یہ قطعی حکم ہے کہ ان کو چھوڑ دو۔ بے شک اس وقت تک وہ اسیر رکھے جا سکتے ہیں جبتک کہ اسلامی مفاد کو ان کی رہائی سے خطرہ کا اندیشہ ہو لیکن ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ قرآن نے خود حکومت کو یہ اختیار نہیں دیا کہ ان کو مملوک بناکر بیچے یا سپاہیوں میں تقسیم کرے۔ بلکہ وہ سرکاری قیدی رہیں گے۔ اور عزت آبرو کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ برخلاف اس کے آپ یہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اسیران جنگ کو آپس میں بانٹ کر ملکیت بنالیں اور انکو استعمال کرنا شروع کریں یا بھیڑ بکریوں کی طرح دست بدست بیچنے لگیں اور قیامت تک جبتک کہ ان کے مالک انکو آزاد نہ کریں وہ نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ غلام اور تمدن کے انسانی حقوق سے محروم رکھے جائیں نہ ایک پیسہ کے مالک ہو سکیں نہ ایک حبہ کے۔ اور خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ان کو انسانیت کا کوئی

حق کبھی نہ مل سکے

کیا یہ قرآن کی تعلیم ہے؟ کیا اس کو قرآن کی آیت یا کسی لفظ یا کسی حرف سے آپ ثابت کر سکتے ہیں؟ پھر میرے اوپر اعتراض کیوں ہے میں نے قرآن کی تعلیمات لکھی ہیں۔ آپ کا استدلال یہ ہے کہ یہ

صحابہ کے عہد میں بہت سے اسیران جنگ کو مالیک کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔
خود اہل بیت رسول کے گھروں میں جنگ کے پکڑے ہوئے غلام اور مفتوح ممالک سے آئی ہوئی لونڈیاں موجود تھیں۔

آپ کے نزدیک صحابہ اور اہلبیت رضی اللہ عنہم کا ہر فعل قرآنی تعلیم ہے مگر میرے نزدیک اُنکا وہی فعل دینی ہے جس کی سند قرآن سے مل سکے۔ ہاں اگر آپ تاریخی حدود میں آکر بحث کریں تو میں کافی اور شافی جواب دے سکتا ہوں کہ کن اسباب اور حالات کی وجہ سے صحابہ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مملوک بنانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ان کے اس عمل کو جو ایک خاص ماحول میں تھا بلا کسی دلیل کے قرآنی تعلیم کہہ دینا جائز نہیں سمجھتا۔ قرآن ہر مسلمان کے گھر میں ہے۔ دیکھئے اور پھر دیکھئے اگر کوئی دلیل اس خلاف فطرت غلامی کی مل سکے تو پیش کیجئے۔

میں نے لکھا تھا کہ عرب میں چونکہ غلامی رائج تھی اور لوگوں کے پاس مملوک موجود تھے قرآن نے انھیں کو غلامی میں رہنے دیا اور ان کی آزادی کے لئے بھی بہت سی راہیں نکال دیں۔ اور آیندہ کے لئے رستے ہی بند کر دیا۔" اس پر آپ لکھتے ہیں۔

"ایسی مصلحت شناسی کو خدا کی طرف منسوب کرنا در اصل خدا کی طرف کمزوری کو منسوب کرنا ہے جس خدا نے شراب کو حرام کر دیا اور اس معاملہ میں بندوں کی ذرا پروا نہ کی جس نے زنا کو حرام کر دیا اور اس کی ذرا پروا نہ کی کہ عرب کے دوسرے ممالک میں اس کا کس قدر رواج تھا اس کو کون امر غلامی کی ہر صورت کو

قطعاً حرام کر دینے سے روک سکتا تھا۔"

لیکن آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ شراب خوری۔ زنا یا قمار بازی وغیرہ شخصی اخلاقی جرائم ہیں جن کو فوراً روک ہی دینا چاہئیے تھا بخلاف اس کے ممالیک انکی معیشت میں داخل ہو چکے تھے۔ سینکڑوں گھرانے اور قبیلے ان کی کمائی پر گذارہ کرتے تھے ان کو فوراً آزادی کا حکم دینے سے بہت سے قبایل کی اقتصادی حالت خراب ہونے اور ان میں ابتری واقع ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس کا انسداد بتدریج مناسب تھا اور یہی اس علیم و حکیم نے کیا۔

ملکیت زمین قرآن سے زمین پر شخصی ملکیت کا حق ثابت نہیں ہوتا۔ اس پر آپ کو اعتراض ہے تو کوئی آیت ثبوت میں نقل کرتے کسی عہد کی تاریخ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ تاریخ ایک خاص ماحول رکھتی ہے ممکن ہے کہ وہ ماحول اب نہ ہو۔ دراصل قرآن کریم کے متعلق ہمارے اور آپ کے زاویہ نگاہ میں فرق ہے ہم قرآن کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں جس میں انسان کے جملہ دینی اور دنیاوی مسائل کا حل ہے۔ جس طرح یہ عالم فطرت انسانی معیشت کے لئے ہر طرح مکمل ہے اسی طرح یہ کلام فطرت یعنی قرآن جملہ عقد ہائے معاشرت کو کھول سکتا ہے۔ آج انسانی قومیں انسانی معاشرت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بیقرار ہیں اور ان میں قبضۂ زمین کے مسئلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت انسانی برادری میں نہایت غیر مساویانہ دولت کی تقسیم ہوگئی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں اس کا حل نہیں ہے؟ آپ کا خیال یہ ہے کہ قرآن نے "وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ" کہکر صرف قدرت الٰہی کا اظہار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک اس قدرت الٰہی کا شکریہ ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔ اسی سورہ میں ہے "وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ" ۲۴/۵۵ یعنی اسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے ہوئے سمندر میں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی اور جاپانی جہازوں کو سمندر میں دیکھکر آپ قدرت حق پر اس کی حمد و ثنا کریں یا خود بڑے بڑے جنگی جہاز تعمیر کرکے سمندر میں ڈالیں۔ بہرصورت کلام الٰہی ایک فطری شئے ہے جس کے منافع محدود اور متعین نہیں ہوتے۔ اس لئے کسی آیت کے

متعلق آپ کا یہ کہنا کہ یہ صرف فلاں غرض کے لئے ہے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر اس سے دوسرے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں تو ضرور حاصل کئے جائیں گے۔ یہی حال فطری اشیاء کا ہے۔ بابا آدم پانی کے متعلق یہ تو ضرور جانتے تھے کہ نہانے اور پینے کی چیز ہے۔ مگر فرزندان آدم نے اسی پانی سے بڑی بڑی مشینیں، ریلیں اور جہاز چلانے شروع کئے۔ اور ابھی تک اس کا فائدہ محدود نہیں ہے اسی سے "ماء ثقیل" نکالا جا چکا ہے جو دنیا کا سب سے قیمتی زہر ہے۔ اور اسی سے ہائیڈروجن بم بنانے کا نسخہ بھی تیار ہو چکا ہے بعینہٖ یہی حال قرآنی آیات کا ہے کہ ان کے مفہوم کو کسی ایک عہد کے ساتھ مخصوص کر دینا روا نہیں ہے۔ وہ ہر عہد میں ایک نیا عالم پیدا کر سکتی ہے۔

نظام عالم کی مدت عروج اور نزول امر کا جو مفہوم میں نے حاشیہ میں بیان کیا ہے اس کے متعلق مجھے خود تصحیح کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ میں نے صاف لکھ دیا ہے کہ "عروج و نزول امر سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے" اس سے مقصود صرف دعوت غور و فکر ہے اور کچھ نہیں۔ ہاں اس آیت کی تفسیر میں آپ نے جو روایت لکھی ہے کہ:۔

> "وہ قیامت کا دن ہے جو کافر کے لئے پچاس ہزار سال ہوگا اور مومن کے لئے ایک فرض نماز کے برابر"۔

اس سے امید ہے کہ لوگ قرآن کے مطلب کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکیں گے بشرطیکہ پہلے ان کو یہ بتلایا جائے کہ حاضرین محشر کی نگاہوں میں کیا فرق ہوگا کہ ایک اس کو پچاس ہزار سال شمار کریگا اور دوسرا پانچ منٹ بحالیکہ کفر و ایمان کے احساس زمانی میں یہ فرق کبھی نہ تھا۔

اسلام اور ایمان ان دونوں میں خود قرآن نے تفریق کی ہے جیسا کہ بدویوں نے کہا کہ ہم مومن ہیں۔ کہہ دے کہ تم مومن نہیں ہو کیونکہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے لیکن تم اپنے آپ کو مسلمان کہو" اس صحیح آیت پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ میرے اوپر نہیں ہے بلکہ قرآن پر ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "وہ مسلم نہیں کہا جا سکتا جو مومن نہ ہو" نہ صرف بلا دلیل بلکہ اس آیت سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم وہ ہے جو اسلام کے ظاہری اعمال بجالاتا ہے۔ چاہے دل میں کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا شخص قانون شریعت کی رو سے مسلمان شمار کیا جائیگا۔ اور اس کے ساتھ بشرطیکہ اس کی منافقت ثابت نہ ہوجائے مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جائیگا اور اسلامی حکومت میں اس کے حقوق مسلمانوں کے سے ہونگے اور مومن وہ مسلم ہے جس کے دل میں ایمان داخل ہو۔ ان دونوں میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے یعنے ہر مومن مسلم ہے مگر ہر مسلم مومن نہیں ہے۔ یہی قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور یہی علماء اسلام نے بھی لکھا ہے۔

مسئلہ تقدیر قرآن کریم میں جن چیزوں کو ایمانیات میں شمار کیا ہے وہ صرف پانچ ہیں۔ اللہ۔ یوم الآخر۔ ملائکہ۔ کتاب اور رسول۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ [۲/۱۷۷]	اور لیکن نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ پر اور کتاب پر اور نبیوں پر۔

انہی پانچوں کا انکار ضلالت بعیدہ ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا [۴/۱۳۶]	جو کوئی انکار کریگا اللہ سے اور ملائکہ سے اور کتابوں سے اور رسولوں سے اور قیامت کے دن سے تو وہ دور کی گمراہی میں پڑا۔

سارے قرآن کو بار بار دیکھ جائیے تقدیر کا کہیں ایمانیات میں ذکر ہے؟ مزید توضیح کے لئے میں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایمان مجمل کے یہی پانچ اجزا ہیں لیکن ایمان مفصل میں قرآن کا ایک ایک مسئلہ داخل ہے یہاں تک کہ اس بھیڑیے کی برات بھی جس پر حضرت یوسف کے قتل کی تہمت لگائی گئی تھی۔ اگر اس سے بھی کوئی انکار کریگا تو وہ قرآن کا منکر ہوگا۔ تقدیر بھی قرآنی تعلیم ہے جس طرح وہ قرآن میں بیان کی گئی ہے اس کا ماننا ضروری ہے مگر وہ ایمان مجمل کے اجزا میں سے نہیں ہے جس طرح بھیڑیے کی برات۔ اصل میں تقدیر کا عقیدہ پہلی صدی ہجری میں جب جبر و قدر کی بحث چھڑی ہے ایمانیات میں داخل کیا گیا ہے۔

اتباع علما و صلحا | قرآن کی رو سے ہر زمانہ میں علما، و صلحا، کا فریضہ یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے واضح کریں خود ان کی باتیں کسی زمانہ میں بھی واجب الاتباع نہیں ہیں۔ اور یہ امر قرآن کی ان آیات سے واضح ہے جو میں نے نقل کی ہے۔ آپ نے ان کے اتباع کی دو دلیل دی ہے پہلی دلیل یہ آیت ہے "فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

لیکن اس میں اہل الذکر سے مراد اہل کتاب ہیں۔ چنانچہ دوسری آیت میں تصریح ہے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ — سو اگر تجھے شک ہوا اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا ہے تو تو فَاسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ؕ ۱۰ / ۹۴ ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے سے کتاب پڑھتے ہیں۔

دراصل علما راہل کتاب سے وحی کی تصدیق مطلوب ہے نہ کہ ان کے اتباع کی تعلیم۔ دوسری دلیل آپ کی یہ آیت ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ ؕ ۶ / ۹۰ — وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور تو انہی کی ہدایت کے پیچھے چل۔

مگر اس سے پہلے ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ؕ ۶ / ۸۹ — یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب قوت فیصلہ اور نبوت عطا کی ہے۔

اس لئے "فبھدٰھم" میں ہم کا مرجع حضرات انبیا رہیں جن کی پیروی اور اقتدا کا حکم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ یہاں علما و صلحا ر ہرگز مراد نہیں ہیں۔

بزرگان دین اور ائمہ و علما و سلف کا حق صرف یہی ہے کہ ان کے حالات اور علوم سے تاریخی اور علمی فائدے حاصل کریں۔ ان کی پیروی کسی زمانہ میں بھی واجب نہیں ہے۔ اور ان کے کسی قول کو بلا کسی قرآنی سند کے اہل دین سمجھ لینا قطعی شرک ہے۔

علم غیبِ رسل قرآن میں دو باتوں کی تصریح کی گئی ہے ایک یہ کہ انبیا کے سوا کسی کو علم غیب نہیں دیا جاتا۔ دوسری یہ کہ انبیا کو جو علم غیب دیا جاتا ہے وہ بندوں تک پہونچانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے عام عقیدہ کے مطابق نہیں کیونکہ بالعموم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بزرگانِ دین اور اولیاء کرام کو بھی کشف اور کرامت سے غیب کی بعض باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ رہے انبیاء کرام سو وہ تو بقول آپ کے وائسرائے ہیں ان کو رازِ درونِ پردہ سے زیادہ آگاہ ہونا ہی چاہیئے۔ اس صورت میں محلِ بحث غیب کا لفظ ہے اور اس کی سوائے اس کے اور کوئی تاویل نہیں ہو سکتی جو میں نے اختیار کی ہے یعنی اس سے مراد امور تشریعی لئے جائیں۔ جو انبیا کے اوپر بذریعہ وحی یعنی ملائکہ القا کئے جاتے ہیں تاکہ وہ بندوں تک ان کی تبلیغ کریں۔ یہ غیب صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کی غرض تبلیغ ہے۔ اس تاویل سے دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر برحق رہتی ہیں۔ اور عام عقیدہ کو بھی صدمہ نہیں پہونچتا۔

استواء علی العرش بے شک قرآن کے دوسرے مترجموں کی طرح میں نے بھی اس لفظ کا ترجمہ کہیں بیٹھنا لکھا اور کہیں براجنا۔ مگر ص ۶۳ میں تصریح کر دی ہے کہ "عرش الٰہی سے مراد کوئی مقرِ حکومت یا مرکز نہیں ہے بلکہ خود حکومت اور عالم خلق پر تسلط رکھنے اور اس کے انتظام کو استواء علی العرش سے تعبیر کیا گیا ہے"۔ اس تصریح کے بعد آپکا اعتراض صرف لفظی رہ جاتا ہے۔ اگر استواء کے ترجمے کے لئے اردو میں کوئی لفظ ایسا ہے کہ تو مجھے اس کے اختیار کرنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔

متفرقات میں آپ نے میرے اوپر تجدد کا الزام لگانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ قدامت پرستی کے فضائل و برکات پر قرآن کی کچھ آیات درج نہ فرمائیں۔ در اصل مسلم کا شیوہ نہ تجدد پرستی ہے نہ قدامت پرستی بلکہ حق پرستی ہے جو ہر زمان و مکان سے بالاتر ہے۔

آپ نے یہ تو صحیح لکھا ہے کہ قرآن کے لئے انسانی علوم کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے کوئی ضرورت نہیں لیکن اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ انسانی علوم کو قرآن کے سہارے کی ضرورت ہے پھر ہم جس ماحول

میں ہیں۔ اس میں اگر اپنے علوم میں قرآن سے مدد لیں تو کونسا گناہ ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۷/۵۲ — اور ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۶/۹۷ — ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۶/۹۸ — ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کیلئے کی ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں یہ علماء و فقہاء وہ الوالالباب ہیں جو حقائق فطرت اور مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں غور و فکر کرتے ہیں۔ چونکہ علوم فطرت ہمیشہ آگے بڑھنے والے ہیں اس لئے فہم قرآن کو بھی کسی ماحول مخصوص کے ساتھ مقید کر دینا مناسب نہیں۔ یہ کتاب ہر زمانے سے بالاتر ہے اور ہر علمی تقدم کا ساتھ دے سکتی ہے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کے آخر تک جن
حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں
کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لئے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر
کو بھیج دینی چاہئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے
کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر
پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(طابع و ناشر ابو الاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن